زیرِ نظر: استاد محقق آیۃ اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

۱۱

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی

[illegible]
[illegible] اشاعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

زیرِ نظر: اُستادِ محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

جلد یازدہم

ترجمہ
سیّد صفدر حسین نجفی
پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور

اثرِ نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

Marfat.com

پیشکش، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب ——— تفسیر نمونہ جلد ۱۱

تالیف ——— آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

ترجمہ ——— سید صفدر حسین نجفی، پرنسپل جامعۃ المنتظر، لاہور

تصحیح و تجدید نظر ——— ثاقب نقوی

کتابت ——— دارالکتابت حضرت کیلیانوالہ (گوجرانوالہ)

ناشر ——— مصباح القرآن ٹرسٹ،
۱۰۔ گنگا رام بلڈنگ، شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور

مطبع ——— آر۔ آر پرنٹرز، لاہور

تاریخ اشاعت ——— ذی الحجہ ۱۴۰۸ھ

ہدیہ ——— ۶۵ روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

Marfat.com

مدینۃ العلم دار العلوم مجاہدیہ
نور آباد - فتح گڑھ - سیالکوٹ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Marfat.com

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین محترم!

سلام ورحمت! اب کہ دوستوں نے بہت شکوہ کیا کہ گیارہویں جلد کے آتے آتے دیر ہوگئی۔

ہم اس کے سوا کیا عرض کریں

ع ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھی۔

بہر حال طبیعت، قلم اور حالات پہلے کی نسبت رواں ہوگئے ہیں آیندہ جلدوں کی اشاعت کے بارے میں امید ہے کہ دوستوں کو اس قدر شکایتِ تاخیر نہیں ہوگی۔ انشاء اللہ

نئی جلدوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ شائع شدہ جلدوں کے یکے بعد دیگرے ایڈیشنوں کی اشاعت کا اہتمام بھی کرنا پڑتا ہے۔ جُوں جُوں یہ تعداد بڑھتی جا رہی ہے کام کا بوجھ بھی زیادہ ہوتا جا رہا ہے جب کہ ٹرسٹ نے احباب کے مشوروں اور معاشرتی تقاضوں کے باعث حلقۂ کارکردگی کو اور بھی بڑھایا ہے۔

قرآن کریم سے متعلقہ کتب کی اشاعت کے علاوہ دیگر پہلوؤں پر بھی اسلامی کتب کی اشاعت کیلئے ایک شعبہ "مصباح الہدیٰ پبلیکیشنز" کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس شعبے کے زیرِ اہتمام متعدد کتب پر کام ہو رہا ہے۔

اب آپ سے گزارش ہے کہ:

آپ بھی اس سلسلے میں ایسی کتب تجویز فرمائیں جن کی ہمارے معاشرے کو دورِ حاضر میں ضرورت ہو ہمیں ترجمے کے لیے بھی اہل افراد کی ضرورت ہے اس حوالے سے بھی آپ کی راہنمائی اور تعاون درکار ہے۔

کتب کی اشاعت کو بہتر سے بہتر بنانے اور اغلاط کی نشاندہی میں ہمارے احباب گاہے گاہے جو تعاون کرتے ہیں ہم احساسِ تشکر کے ساتھ اُس سے استفادہ کرتے ہیں۔

توقع ہے کہ یہ سلسلۂ خیر آئندہ بھی جاری رہے گا۔

———— گیارہویں جلد کی اس پہلی اشاعت میں ہمارے کرم فرما سید شاہد حسین صاحب اور سید عارف حسین صاحب نے ہم سے خصوصی تعاون فرمایا ہے۔ ہم اُن کے والد گرامی ڈاکٹر سید زاہد حسین صاحب مرحوم مغفور کیلئے بارگاہِ ایزدی سے دائمی اجر کے خواستگار ہیں۔

والسلام مع الاکرام

مصباح القرآن ٹرسٹ

۱۰۔ گنگا رام بلڈنگ شاہراہِ قائدِ اعظم۔ لاہور

Marfat.com

اِھداء

" مرکزِ مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان "

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش

تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے

اس نفیس تالیف کو

ان اہلِ مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا

چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ - قم

Marfat.com

یہ تفسیر

حسبِ ذیل علماء و مجتہدین کی باہمی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے عبدالرسول حسنی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبداللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

Marfat.com

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

تفسیر مجمع البیان	تالیف	مشہور مفسر طبرسی
تفسیر تبیان	تالیف	عظیم و فقید عالم شیخ طوسی
تفسیر المیزان	تالیف	علامہ طباطبائی
تفسیر صافی	تالیف	ملا محسن فیض کاشانی
تفسیر نور الثقلین	تالیف	عبد علی بن جمعہ حویزی
تفسیر بُرہان	تالیف	سید ہاشم بحرانی
تفسیر روح المعانی	تالیف	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
تفسیر المنار	تالیف	محمد رشید رضا (تقریرات درس تفسیر شیخ محمد عبدہٗ)
تفسیر فی ظلال القرآن	تالیف	سید قطب
تفسیر قرطبی	تالیف	محمد بن احمد انصاری قرطبی
اسباب النزول	تالیف	ابو الحسن علی بن متویہ واحدی نیشاپوری
تفسیر مراغی	تالیف	احمد مصطفےٰ مراغی
تفسیر مفاتیح الغیب	تالیف	فخر الدین رازی
تفسیر روح الجنان	تالیف	ابو الفتوح رازی

Marfat.com

اس تفسیر میں مدِ نظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان یہی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

بالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکارِ علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کرکے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققینِ اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

Marfat.com

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کر سکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کر سکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا میں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہو سکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی دس جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی گیارہویں ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا میں از حد شکرگزار ہوں۔

یہاں یہ بات میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[1]

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرض خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو، یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی میں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد میں یہ اندازہ کم ثابت ہوا اور کل جلدوں کی تعداد ستائیس تک جا پہنچی (مترجم)

[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

Marfat.com

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی ۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا ۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے مَیں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں ۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں ۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث ، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو ۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں ۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے) ۔

خداوندا !

ہماری آنکھوں کو بینا ، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب ، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں ۔

خداوندا !

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے ، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے ، تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں ۔

بار الٰہا !

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں ۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں ۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (تُو ہر چیز پر قادر ہے) ۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علیہ قم ۔ ایران
ذوالحجہ ۱۴۰۱ ہجری قمری

Marfat.com

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر
سورۂ حجر	۲۷
سورۂ حجر کے مضامین	۲۹
آیت نمبر ۱ تا ۵	۳۱
بے بنیاد آرزوئیں	۳۲
ایک اہم نکتہ	۳۵
لمبی آرزوئیں غفلت کا سبب ہیں	۳۵
آیت ۶ تا ۸	۳۷
فرشتوں کے نزول کا تقاضا	۳۷
آیت ۹	۴۰
قرآن کی حفاظت	۴۰
عدم تحریف قرآن	۴۱
عدم تحریف قرآن کے دلائل	۴۳
۱. حافظانِ قرآن	۴۳
۲. کاتبانِ وحی	۴۴
۳. تمام رہبران اسلام نے اسی قرآن کی دعوت دی ہے۔	۴۵
۴. آخری دین اور ختمِ نبوت کا تقاضا	۴۶
۵. روایات ثقلین	۴۶
۶. قرآن جھوٹی اور سچی روایات کیلئے کسوٹی ہے	۴۷
روایاتِ تحریف	۴۷
آیت ۱۰ تا ۱۵	۵۱
ہٹ دھرمی اور محسوسات کا انکار	۵۱
یہ استہزاء چند امور کی وجہ سے ہوتا تھا	۵۲
چند اہم نکات	۵۳
۱. شیع کا مفہوم	۵۳
۲. "نسلکہ" کی ضمیر کا مرجع	۵۳
۳. گزشتہ لوگوں کی روش	۵۴
۴. "فظلوا فیہ یعرجون" کا مفہوم	۵۴
۵. "سکرت ابصارنا" کا مطلب	۵۵
آیت ۱۶ تا ۱۸	۵۶
شیطان شہاب کے ذریعے ہانکے جاتے ہیں:	۵۶
شیطان شہاب کے ذریعے کیسے ہانکے جاتے ہیں	۵۸
نتیجۂ بحث	۶۱
آیت ۱۹ تا ۲۱	۶۵
ہر چیز کا خزانہ ہمارے پاس ہے	۶۵
چند اہم نکات	۶۸
۱. خدا کے خزانے کیا ہیں؟	۶۸
۲. نزولِ مقامی اور نزولِ مکانی	۶۹

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۲۲ تا ۲۵	۷۰
ہوا اور بارش	۷۰
متقدمین اور متاخرین کون ہیں؟	۷۲
آیت ۲۶ تا ۴۰	۷۴
آیت ۴۱ تا ۴۴	۷۵
خلقت انسان	۷۶
چند اہم نکات	۸۰
۱. تکبر — عظیم بدبختیوں کا سرچشمہ ہے۔	۸۰
۲. شیطان کن لوگوں پر تسلط حاصل کرلیتا ہے۔	۸۱
۳. جہنم کے دروازے	۸۱
۴. سیاہ کیچڑ اور خدا کی رُوح	۸۲
۵. "جن" کیا ہے؟	۸۳
۶. قرآن اور خلقت انسان	۸۴
تکامل انواع کے حامیوں کے دلائل	۸۵
ثبوت انواع کے حامیوں کے جوابات	۸۶
مفروضہ تکامل اور خداشناسی	۸۷
قرآن اور مسئلہ تکامل انواع	۸۸
آیت ۴۵ تا ۵۰	۹۱
بہشت کی آٹھ نعمتیں	۹۱
چند اہم نکات	۹۳
۱. جنّت کے باغ اور چشمے	۹۳
۲. مادی اور روحانی نعمتیں	۹۴
۳. کینہ اور حسد اخوت کے دشمن ہیں	۹۴
۴. جزائے کامل	۹۴
۵. آئیے اس دنیا میں تعمیر جنت کریں	۹۵

مضمون	صفحہ نمبر
آیت ۵۱ تا ۶۰	۹۶
انجانے مہمان	۹۷
آیت ۶۱ تا ۷۵	۱۰۱
آیت ۷۶ تا ۷۷	۱۰۲
قوم لوط کے گنہ گاروں کا انجام	۱۰۳
چند اہم نکات	۱۰۸
۱. "قطع من اللیل" سے کیا مراد ہے؟	۱۰۸
۲. "وامضوا حیث تؤمرون" کی تفسیر	۱۰۸
۳. "متوسم" اور "مومن" کے درمیان واسطہ	۱۰۹
۴. شہوت اور غرور کی مستی	۱۰۹
آیت ۷۸ تا ۸۴	۱۱۱
دو ظالم قوموں کا انجام	۱۱۱
اصحاب ایکہ کون ہیں؟	۱۱۲
آیت ۸۵ تا ۹۱	۱۱۵
تقسیم اور نکتہ چینی کرنے والے	۱۱۶
چند اہم نکات	۱۲۰
۱. قرآن خدا کی عظیم نعمت ہے	۱۲۰
۲. دوسروں کے وسائل پر نگاہ رکھنا انحطاط کا باعث ہے۔	۱۲۱
۳. رہبر کی انکساری	۱۲۲
۴. "مقتسمین" کون لوگ ہیں؟	۱۲۲
آیت ۹۲ تا ۹۹	۱۲۴
اپنا مکتب واضح طور پر بیان کرو	۱۲۵
چند اہم نکات	۱۲۷
۱. اعلانیہ دعوت اسلام کا آغاز	۱۲۷

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۲. خدا کی طرف توجہ کا روحانی اثر	۱۲۸
۳. عبادت اور تکامل وارتقاء	۱۲۸
سورۂ نحل	۱۳۱
اس سورۃ کے مضامین	۱۳۳
اس سورۃ کی فضیلت	۱۳۴
آیت ۱ اور ۲	۱۳۵
حکم عذاب قریب ہے	۱۳۵
آیت ۳ تا ۸	۱۳۸
جانوروں کے گوناگوں فائدے	۱۳۹
جانور پالنے اور کھیتی باڑی کی اہمیت	۱۴۲
آیت ۹ تا ۱۳	۱۴۶
سب چیزیں انسان کے دست تسخیر میں ہیں	۱۴۷
چند اہم نکات	۱۵۰
۱. مادّی اور روحانی نعمتیں	۱۵۰
۲. زیتون، کھجور، اور انگور ہی کا ذکر کیوں؟	۱۵۰
۳. تفکر، تعقّل اور تذکّر	۱۵۲
آیت ۱۴ تا ۱۸	۱۵۴
پہاڑ، دریا اور ستارے نعمت ہیں۔	۱۵۴
راہ، نشانی اور رہبر	۱۶۰
آیت ۱۹ تا ۲۳	۱۶۲
مردہ اور بے شعور معبود	۱۶۳
مستکبر کون ہیں؟	۱۶۵
آیت ۲۴ تا ۲۹	۱۶۸
شان نزول	۱۶۹
جو دوسروں کے گناہ اپنے کندھوں پر لاد لیتے ہیں	۱۷۰
چند اہم نکات	۱۷۵
۱. اچھی اور بُری سُنّت	۱۷۵
۲. بے موقع تسلیم حق	۱۷۷
آیت ۳۰ تا ۳۲	۱۷۹
نیک لوگوں کا انجام	۱۷۹
آیت ۳۳ تا ۳۷	۱۸۳
انبیاء کی ذمہ داری واضح تبلیغ ہے	۱۸۴
چند اہم نکات	۱۹۱
۱. "بلاغ مبین" کیا ہے؟	۱۹۱
۲. ہر امت کیلئے ایک رسول	۱۹۱
آیت ۳۵ تا ۴۰	۱۹۲
شان نزول	۱۹۲
معاد اور اختلافات کا خاتمہ	۱۹۳
آیت ۴۱ اور ۴۲	۱۹۶
شان نزول	۱۹۶
مہاجرین کی جزا	۱۹۷
چند اہم نکات	۱۹۷
۱. ہجرت اور مہاجرین	۱۹۷
۲. "ھاجروا فی اللہ" کا مفہوم	۱۹۸
۳. "من بعد ما ظلموا" کا مطلب	۱۹۸
۴. "لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ" کا مفہوم	۱۹۸
۵. مہاجرین کی صفات	۱۹۸
آیت ۴۳ تا ۴۴	۲۰۰
نہیں جانتے تو پوچھ لو	۲۰۰
ایک اہم نکتہ	۲۰۲

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
اہلِ ذکر کون ہیں؟	۲۰۲
آیت ۴۵ تا ۴۷	۲۰۴
مختلف گناہوں کی سزائیں	۲۰۶
آیت ۴۸ تا ۵۰	۲۰۹
سائے تک اللہ کے حضور سجدہ ریز ہیں	۲۰۹
ہمارے سایوں کا ہماری زندگی پر اثر	۲۱۰
آیت ۵۱ تا ۵۵	۲۱۳
ایک دین اور ایک معبود	۲۱۵
آیت ۵۶ تا ۶۰	۲۱۹
جہاں بیٹی کو باعث رسوائی سمجھا جاتا تھا	۲۲۰
چند اہم نکات	۲۲۱
۱. وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں کہتے تھے؟	۲۲۱
۲. بیٹیوں کو زندہ درگور کیوں کیا جاتا تھا؟	۲۲۲
۳. عورت کے مقام کے احیاء میں اسلام کا کردار	۲۲۶
آیت ۶۱ تا ۶۴	۲۲۹
خدا فوراً سزا کیوں نہیں دیتا؟	۲۳۰
اجلِ مسمّیٰ کیا ہے؟	۲۳۲
آیت ۶۵ تا ۶۷	۲۳۵
پانی، پھل اور حیوانات	۲۳۵
چند اہم نکات	۲۳۷
۱. دودھ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟	۲۳۷
۲. دودھ ایک اہم غذا ہے۔	۲۳۸
۳. دودھ ایک خالص اور عمدہ غذا ہے	۲۳۹
آیت ۶۸ اور ۶۹	۲۴۱
شہد کی مکھی اور وحی الٰہی	۲۴۱
۱. "وحی" کا مفہوم	۲۴۲
۲. کیا طبعی الہام شہد کی مکھیوں سے مخصوص ہے؟	۲۴۲
۳. شہد کی مکھی کا گھر	۲۴۳
۴. گھر کا انتخاب	۲۴۳
چند قابلِ توجہ نکات	۲۴۴
۱. شہد کس چیز سے بنتا ہے؟	۲۴۴
۲. ہموار اور مطیع راستے	۲۴۴
۳. شہد کہاں بنتا ہے؟	۲۴۵
۴. شہد کے مختلف رنگ	۲۴۵
۵. شہد، غیر معمولی شفا بخش مادہ ہے	۲۴۵
۶. "للناس" یعنی انسانوں کے لیے	۲۴۷
۷. شہد کے بارے میں دیگر امور	۲۴۸
۸. شہد کی مکھیوں کی عجیب و غریب زندگی	۲۴۹
آیت ۷۰ تا ۷۲	۲۵۱
رزق میں اختلاف کا سبب	۲۵۲
کیا رزق کی تفریق عدالت پر مبنی ہے؟	۲۵۳
چند اہم نکات	۲۵۶
۱. رزق کے اسباب اور سرچشمے	۲۵۶
۲. دوسروں سے برابری کا سلوک	۲۵۹
آیت ۷۳ ، ۷۴	۲۶۱
خدا کے لیے شبیہ کا عقیدہ نہ رکھو	۲۶۱
آیت ۷۵ تا ۷۷	۲۶۴
مومن اور کافر کے لیے مثالیں	۲۶۵
چند اہم نکات	۲۶۸
۱. آزاد اور قیدی انسان	۲۶۸

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۲- انسانی زندگی پر عدالت اور سچائی کا اثر	۲۶۹
۳- ایک روایت پر نظر	۲۶۹
آیت ۷۸ تا ۸۳	۲۷۰
طرح طرح کی مادّی اور روحانی نعمتیں	۲۷۱
چند قابلِ توجہ نکات	۲۷۲
۱- ابتدا میں انسان کچھ نہیں جانتا ہوتا	۲۷۲
۲- آلاتِ شناخت کی نعمت	۲۷۲
۳- اس کا شکر بجالاؤ	۲۷۳
چند قابلِ غور نکات	۲۷۴
۱- فضائے آسمانی میں پرندوں کی پرواز کا اسرار	۲۷۴
۲- آیات کا باہمی ربط	۲۷۶
سائے، گھر اور لباس	۲۷۸
چند اہم نکات	۲۸۱
۱- "نعمت اللہ" سے مراد	۲۸۱
۲- حق و باطل کی کشمکش	۲۸۲
آیت ۸۴	۲۸۲
آیت ۸۵ تا ۸۹	۲۸۳
جب بدکاروں کو کوئی راہ سجھائی نہ دے گی	۲۸۴
چند قابلِ توجہ نکات	۲۸۶
۱- "شرکاء اللہ" کی بجائے "شرکاءھم"	۲۸۶
۲- بے جان بت بھی پیش ہوں گے	۲۸۶
۳- بُت مشرکین کی تکذیب کریں گے	۲۸۶
۴- "فالقوا الیھم القول" کا مفہوم	۲۸۶
چند اہم نکات	۲۸۹
۱- قرآن سب کچھ واضح کرتا ہے	۲۸۹

مضمون	صفحہ نمبر
۲- ہدایت کے چار مرحلے	۲۹۲
آیت ۹۰	۲۹۴
نہایت جامع معاشرتی پروگرام	۲۹۴
خیر و شر کے بارے میں جامع ترین آیات	۲۹۷
آیت ۹۱ تا ۹۴	۳۰۱
شانِ نزول	۳۰۲
عہد و پیمان ـــــ ایمان کی دلیل	۳۰۲
چند اہم نکات	۳۰۵
۱- عہد و پیمان کے احترام کا فلسفہ	۳۰۵
۲- پیمان شکنی کے لیے بہانے	۳۰۷
آیت ۹۵ تا ۹۷	۳۰۸
شانِ نزول	۳۰۸
حیاتِ طیبہ کی بنیاد	۳۰۹
چند اہم نکات	۳۱۱
۱- سرمایۂ جاوداں	۳۱۱
۲- مرد اور عورت کی برابری	۳۱۲
۳- عملِ صالح کی جڑ سرچشمۂ ایمان سے سیراب ہوتی ہے۔	۳۱۲
۴- "حیاتِ طیبہ" کیا ہے؟	۳۱۴
آیت ۹۸ تا ۱۰۰	۳۱۶
قرآن اس طرح سے پڑھو	۳۱۶
چند اہم نکات	۳۱۷
۱- شناخت کی رکاوٹیں	۳۱۷
۲- شیطان کو یہاں رجیم کیوں کہا گیا ہے؟	۳۱۹
۳- گروہِ حق اور گروہِ شیطان	۳۱۹

Marfat.com

مضمون	صفحہ نمبر
۴۔ تلاوتِ قرآن کے آداب	۲۲۰
آیت ۱۰۱ تا ۱۰۵	۲۲۳
شانِ نزول	۲۲۴
رسواکن جھوٹ	۲۲۴
اسلام کی نگاہ میں جھوٹ کی قباحت	۲۲۸
آیت ۱۰۶ تا ۱۱۱	۲۳۲
شانِ نزول	۲۳۲
اسلام سے پھر جانے والے ـــــ مرتدین	۲۳۴
چند اہم نکات	۲۳۶
۱۔ تقیہ اور اس کا فلسفہ	۲۳۶
۲۔ فطری اور ملی مرتد اور فریب خوردہ لوگ	۲۳۸
آیت ۱۱۲ تا ۱۱۴	۲۴۱
جنہوں نے کفرانِ نعمت کیا اور گرفتارِ عذاب ہوئے	۲۴۱
چند اہم نکات	۲۴۲

مضمون	صفحہ نمبر
۱۔ یہ مثال ہے تاریخی واقعہ؟	۲۴۲
۲۔ امن اور رزق فراواں	۲۴۴
۳۔ بھوک اور بدامنی کا لباس	۲۴۴
۴۔ نعماتِ الٰہی کا ضیاع اور کفرانِ نعمت	۲۴۵
آیت ۱۱۵ تا ۱۱۹	۲۴۷
جھوٹے کبھی فلاح نہیں پائیں گے	۲۴۸
ایک سوال کا جواب	۲۴۹
آیت ۱۲۰ تا ۱۲۴	۲۵۴
ابراہیم اپنی ذات میں ایک اُمت تھے	۲۵۵
آیت ۱۲۵ تا ۱۲۸	۲۵۹
مخالفین کے مقابلے میں دس اہم اخلاقی کام	۲۶۰
نعمتوں کی سورت ـــــ سورۂ نحل کے بارے میں آخری بات	۲۶۵
نعمتوں کے ذکر کا مقصد	۲۶۷

Marfat.com

تفسیر نمونہ

جلد گیارہ

کا آغاز ـــــــــــ

سُورۂ حجر ـــــــــــ سے ہوتا ہے

یہ سورۃ
تیرھویں پارے کے اختتام سے شروع ہوتی ہے

Marfat.com

سُورۂ حِجر

مکّہ میں نازل ہوئی

اور

اس کی ۹۹ آیات ہیں

Marfat.com

سورۂ حجر کے مضامین

مفسرین میں مشہور قول کی بناء پر سورۂ حجر مکی سورتوں میں سے ہے۔ تاریخ القرآن میں فہرست ابن ندیم سے منقول ہے کہ یہ پیغمبر اکرمؐ پر مکہ میں نازل ہونے والی باون ویں (۵۲ ویں) سورت ہے۔ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس کی ۹۹ آیات ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورت سے بالکل وہی پہلی سورتوں والا آہنگ وروش اور لب ولہجہ منعکس ہوتا ہے کیونکہ جیسے ہم کہہ چکے ہیں مکی سورتیں زیادہ تر معارف اسلام میں سے بالخصوص توحید، معاد اور مشرکوں، گنہ گاروں اور ظالموں کو ڈرانے جیسے موضوعات پر مشتمل ہوتی ہیں اور ان کے لیے تاریخ کے عبرت آمیز دروس سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اس لحاظ سے اس سورہ کے مضامین کو ان سات حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ وہ آیات کہ جو مبداءِ عالم ہستی کے بارے میں ہیں اور اسرار فطرت کے مطالعہ کے ذریعے اس پر ایمان لانے سے مربوط ہیں۔

۲۔ وہ آیات کہ جن میں معاد و قیامت کا تذکرہ ہے اور جو بدکاروں کے لیے عذاب و سزا سے مربوط ہیں۔

۳۔ وہ آیات جو قرآن کی اہمیت اور اس آسمانی کتاب کی عظمت کے بارے میں ہیں۔

۴۔ وہ آیات کہ جو آدم کی پیدائش، شیطان کی سرکشی اور اس کے انجام کے بارے میں ہیں۔ تمام انسانوں کے لیے ایک تنبیہ اور صدائے بیدار باش کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۵۔ وہ آیات کہ جو اس مذکورہ تنبیہ کی تکمیل کے لیے حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کی قوموں کی سرگذشت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

۶۔ وہ آیات کہ جن میں انذار و بشارت ہے، مؤثر پند و نصائح ہیں، سرکوب کر دینے والی تہدیدیں ہیں۔ اور جاذب نظر تشویقیں ہیں۔

۷۔ وہ آیات کہ جن میں پیغمبر اسلامؐ کو قیام و مقابلہ کے لیے کہا گیا ہے۔ مخالفین کی شدید کے مقابلے میں ان کی دل جوئی کی گئی ہے خصوصاً جبکہ یہ سازشیں ماحول مکہ میں بہت زیادہ اور خطرناک تھیں۔

اس سورہ کا نام اس کی آیت نمبر ۸۰ سے لیا گیا ہے کہ جو اصحاب حجر (قوم صالح) کے بارے میں ہے کیونکہ اس سورہ میں پانچ آیات اصحاب حجر کے بارے میں ہیں اور یہی وہ سورت ہے کہ جو قوم صالح کا تعارف "اصحاب حجر" کے عنوان سے کرواتی ہے۔ اس کی تشریح انشاء اللہ آیات ۸۰ تا ۸۴ میں آئے گی۔

Marfat.com

سورۂ حجر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

۱۔ الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ○

۲۔ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ○

۳۔ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ○

۴۔ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ○

۵۔ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ○

ترجمہ

رحیم و رحمان خدا کے نام سے

۱۔ آلرا۔ یہ کتاب اور قرآن مبین کی آیات ہیں۔

۲۔ (جس وقت) کافر (اپنے اعمال کے بُرے آثار دیکھیں گے) کس قدر آرزو کریں گے۔ کہ وہ مسلمان ہوتے۔

۳۔ چھوڑو انھیں، وہ کھالیں، فائدہ اٹھالیں اور آرزوئیں انھیں غافل کر دیں، لیکن وہ بہت جلد سمجھ لیں گے۔

۴۔ ہم نے کسی شہر و دیار (کے باسیوں) کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اجل معین (اور تغیر ناپذیر زمانہ) رکھتے تھے۔

۵۔ کوئی گروہ اپنی اجل سے آگے بڑھ سکتا ہے نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

بے بنیاد آرزوئیں

اس سورہ کی ابتداء میں پھر ہمیں حروفِ مقطعات (الف۔ لام۔ راء) کا سامنا ہے۔ یہ حروف واضح کرتے ہیں کہ آسمانی کتاب کہ جو ساری نوعِ انسانی کے لیے سعادت کا راستہ کھولنے والی ہے انھی سادہ سے حروف الف، باء سے ترتیب پائی ہے اس کا خام مال وہی ہے جو تمام افرادِ بشر یہاں تک کہ دو تین سالہ بچے کے اختیار میں بھی ہے یہ انتہائی اعجاز ہے کہ ایسے مصالحہ سے اس قسم کا بے نظیر محصول بنایا جائے۔

لہٰذا بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: یہ آسمانی کتاب اور واضح قرآن کی آیات ہیں (تلك اٰيٰت الكتٰب و قراٰن مبين)۔
ہم جانتے ہیں کہ "تلك" دور کا اسم اشارہ ہے حالانکہ قاعدتاً یہاں ھٰذہٖ ہونا چاہیے تھا کہ جو نزدیک کے لیے اسم اشارہ ہے) لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ عربی ادب میں (بلکہ فارسی ادب میں بھی) بعض اوقات کسی کی عظمت بیان کرنے کے لیے دور کے اسمِ اشارہ سے استفادہ کیا جاتا ہے ——— یعنی اس کی وہ عظمت ہے کہ گویا ہم سے بہت دُور آسمانوں کے فاصلے پر ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے بعض اوقات ایک بزرگ شخص کی موجودگی میں ہم کہتے ہیں کہ اگر آنجناب اجازت دیں تو ہم فلاں اقدام کریں۔ یہاں "آں" (وہ) کا لفظ اس کے مقام کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہے جیسا کہ "نکرہ" کی صورت میں قرآن کا ذکر بھی بیانِ عظمت کے لیے ہے۔
بہرحال "کتاب" کے بعد لفظ "قرآن" کا آنا درحقیقت تاکید کے عنوان سے ہے اور لفظ "مبین" کے ذریعے اس کی توصیف اس لیے کی گئی ہے کیونکہ یہ حقائق بیان کرنے والا اور حق کو باطل سے جدا کر کے واضح طور پر پیش کرنے والا ہے۔
یہ جو بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ لفظ "کتاب" یہاں تورات اور انجیل کی طرف اشارہ ہے۔ بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جو ان واضح خدائی آیات کے بارے میں ہٹ دھرمی اور مخالفت میں اصرار کرتے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ لوگ اپنے منحوس کفر، اندھے تعصب اور ہٹ دھرمی پر پشیمان ہوں گے اور "کبھی یہ کافر آرزو کریں گے کہ اے کاش ہم مسلمان ہوتے" (ربما يود الذين كفروا لو كانوا مسلمين)۔
جیسا کہ تفسیر المیزان میں ہے "یود" (دوست رکھتا ہے) سے مراد پسند کرنا، تمنا کرنا اور آرزو کرنا ہے اور لفظ "لو" کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اسلام کی آرزو ایسے زمانے میں کریں گے جب وہ اس کی طرف نہیں آسکتے ہوں گے اور یہ خود اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ اس کی تمنا اور آرزو دوسرے جہان میں اپنے اعمال کے نتائج دیکھنے کے بعد کریں گے۔
حضرت صادق علیہ السلام سے اس سلسلے میں منقول حدیث بھی بالکل اسی معنی کی تائید کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں:
ينادى مناد يوم القيامة يسمع الخلائق انه لا يدخل الجنة الا مسلم فثم يود سائر الخلائق انهم كانوا مسلمين۔

Marfat.com

جب قیامت کا دن ہوگا تو کوئی اس طرح پکارے گا کہ تمام مخلوق اس کی آواز سنے گی، وہ کہے گا: (آج) جنت میں ان لوگوں کے علاوہ کوئی داخل نہیں ہوگا کہ جو اسلام لا چکے ہیں اس وقت سب لوگ آرزو اور تمنا کریں گے کہ اے کاش ہم مسلمان ہوتے[1]

نیز عظیم پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

جس وقت دوزخی جہنم میں جمع ہوں گے اور مسلمانوں کے ایک گنہ گار گروہ کو ان کے ساتھ رکھا جائے گا تو کفار مسلمانوں سے کہیں گے کہ کیا تم مسلمان نہیں تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ تھے تو سہی تو وہ کہیں گے کہ پھر تمھارا اسلام بھی تمھارے لیے فائدہ مند نہ ہوا۔ کیونکہ تم بھی ہمارے ساتھ ایک ہی جگہ پر ہو۔ وہ جواب دیں گے کہ ہم نے (بہت بڑے) گناہ کیے تھے کہ جن کے باعث ہم اس انجام کو پہنچے ہیں (گناہ اور تقصیر کا یہ اعتراف اور دشمن کی وہ سرزنش سبب بنے گی کہ) خداوند عالم حکم دے گا کہ ہر وہ باایمان فرد اور مسلمان کہ جو جہنم میں ہے اسے باہر نکالو۔ تو اس وقت کفار کہیں گے کہ اے کاش ہم بھی اسلام لائے ہوتے[2]

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ کافروں میں ایسے افراد بھی ہیں کہ جن کا ضمیر ابھی بیدار ہے اور جب وہ پیغمبر اسلامؐ کی دعوت کو سنتے ہیں اور کتاب مبین کی آیات کے ان پیارے مضامین کو دیکھتے ہیں تو دل کی گہرائیوں سے ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور آرزو کرتے ہیں کہ اے کاش ہم بھی اسلام لائے ہوتے۔ لیکن تعصب، ہٹ دھرمی یا مادی مفادات انھیں اجازت نہیں دیتے کہ اس عظیم حقیقت کو قبول کرلیں لہٰذا وہ اسی طرح کفر اور بے ایمانی کے قیدخانے میں محصور رہ جاتے ہیں۔

ہمارا ایک صاحب ایمان اور مجاہد دوست یورپ گیا تھا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے اسلام کی خوبیاں ایک عیسائی کے سامنے شمار کیں وہ ایک منصف مزاج آدمی تھا اس نے جواب میں کہا: میں سچ مچ تمھیں مبارک باد دیتا ہوں کہ تم اس قسم کے مذہب کے پیروکار ہو۔ لیکن میں کیا کروں، میری زندگی کے حالات اجازت نہیں دیتے کہ میں اپنے مذہب سے دست بردار ہو جاؤں۔

یہ بات جاذب نظر ہے کہ بعض اسلامی روایات میں ہے کہ جس وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قاصد آنحضرتؐ کا خط لے کر قیصر روم کے پاس پہنچا تو اس نے خصوصیت کے ساتھ آپ کے قاصد کے سامنے اظہار ایمان کیا یہاں تک کہ وہ رومیوں کو اس دین توحید و اسلام کی دعوت دینا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ پہلے ان کی آزمائش کی جائے جب اس کی فوج نے محسوس کیا کہ وہ عیسائیت کو ترک کر دینا چاہتا ہے تو اس نے اس کے قصر کا محاصرہ کر لیا۔ قیصر نے ان سے فوراً کہا کہ میں تو تمھیں آزمانا چاہتا تھا اپنی جگہ واپس چلے جاؤ۔

---

[1] مجمع البیان اور نورالثقلین میں یہ روایت محل بحث آیت کے ذیل میں عیاشی کے حوالے سے درج کی گئی ہے۔

[2] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔ نیز فخر رازی نے اپنی تفسیر میں اسی سے ملتی جلتی ایک حدیث نقل کی ہے (البتہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ)۔ تفسیر طبری میں بھی اسی مضمون کی چند احادیث زیر بحث آیت کے ذیل میں نقل ہوئی ہیں۔

Marfat.com

اِس کے بعد اُس نے رسول اللہ کے قاصد سے کہا: میں جانتا ہوں کہ تمھارا پیغمبر خدا کی طرف سے ہے اور وہی ہے جس کے ہم منتظر تھے لیکن میں کیا کروں کہ میں ڈرتا ہوں کہ میری حکومت میرے ہاتھ سے نکل جائے گی اور میری جان بھی خطرے میں ہے۔[1]

توجہ رہے کہ ان دونوں تفسیروں میں آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اور ممکن ہے آیت کا اشارہ اس جہان میں بھی کفار کے بعض گروہوں کی پشیمانی کی طرف ہو اور اُس جہان میں بھی۔ جب کہ وہ مختلف حوالوں سے اُس جہان میں لوٹ آنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ اس جہان میں (غور کیجیے گا)۔

اس کے بعد قرآن بہت سرزنش کے لہجے میں کہتا ہے: اے پیغمبر! انھیں (ان کی حالت پر چھوڑ دے (تاکہ چوپایوں کی طرح) کھاتے پھریں، اس ناپائیدار زندگی کی لذتیں حاصل کرلیں اور آرزوئیں انھیں اس عظیم حقیقت سے غافل کردیں لیکن یہ بہت جلدی سمجھ جائیں گے (ذرھم یأکلوا ویتمتعوا ویلھھم الامل فسوف یعلمون)۔ چونکہ یہ تو جانور ہیں جو اپنے اصطبل، گھاس پھوس اور مادی لذات کے سوا کچھ نہیں سمجھتے اور ان کی حرکتیں بس انھی چیزوں کے لیے ہیں۔

غرور، غفلت اور لمبی آرزوؤں نے ان کے دلوں پر اس طرح سے پردہ ڈال رکھا ہے اور انھیں اپنے میں ایسا مگن کر رکھا ہے کہ اب وہ ادراکِ حقیقت کی قدرت نہیں رکھتے۔

لیکن جب اجل کا طمانچہ ان کے منہ پر لگا، غرور و غفلت کے پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹے اور انھوں نے اپنے آپ کو آستانۂ موت پر یا عرصۂ قیامت میں پایا تو اس وقت سمجھیں گے کہ کس قدر غفلت میں تھے، کس قدر زیاں کار اور بدبخت تھے اور کس طرح انھوں نے اپنا قیمتی ترین سرمایہ خود اپنے ہاتھوں گنوا دیا ہے۔

بعد والی آیت میں، اس بناء پر کہ کہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ مہلت اور لذائذِ دنیا سے بہرہ وری کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں، مزید ارشاد ہوتا ہے: ہم نے کسی گروہ کو کسی شہر میں نابود نہیں کیا مگر یہ کہ وہ اجلِ معین اور تغیر ناپذیر دور رکھتے تھے۔ (وما اھلکنا من قریۃ الا ولھا کتاب معلوم)۔

اور "کوئی اُمت اور جمعیت اپنی اجلِ معین سے تجاوز نہیں کرسکتی اور نہ کوئی پیچھے رہ سکتی ہے" (ما تسبق من امۃ اجلھا وما یستأخرون)۔

ہر جگہ یہی سنت الٰہی کارفرما رہی ہے کہ اس نے تجدیدِ نظر، بیداری اور آگاہی کے لیے کافی مہلت دی۔ اس نے دردناک حوادث سے بھی دوچار کیا اور وسائلِ رحمت سے بھی نوازا۔ اس نے ڈرایا بھی اور شوق بھی دلایا وہ خطرے سے خبردار کرتا ہے تاکہ سب پر حجت تمام ہوجائے۔

مگر جب یہ مہلت تمام ہوتی ہے تو حتمی انجام انھیں آلیتا ہے۔ دیر اور جلدی کا تربیتی مصالح کی خاطر ممکن ہے لیکن ....

کیا اسی حقیقت کی طرف توجہ کافی نہیں ہے تاکہ سب کے سب گذشتہ لوگوں کی سرنوشت سے عبرت حاصل کریں، اور

---

[1] مکاتیب الرسول جلد ۱ ص ۱۱۲۔

Marfat.com

خدائی مہلت سے بازگشت اور اصلاح کے لیے استفادہ کریں کیا اب بھی ہمیں بیٹھا رہنا چاہیے تاکہ گذشتہ گمراہ اور ظالم قوموں کا سا بُرا انجام ہمارے لیے بھی دہرایا جائے۔ اور بجائے اس کے کہ ہم گذشتہ لوگوں سے عبرت حاصل کریں، آنے والوں کے لیے عبرت بن جائیں۔

ضمنی طور پر آخری دو آیات سے آیاتِ قرآن میں اور خود زیر بحث سورت میں گذشتہ لوگوں کی تاریخ بیان کرنے کا مقصد واضح ہو جاتا ہے۔

ایک اہم نکتہ:

لمبی آرزوئیں غفلت کا سبب ہیں: اس میں شک نہیں کہ امید و آرزو یا عربوں کی تعبیر میں "امل" انسانوں کے چرخِ حیات کی حرکت کا عامل ہے یہاں تک کہ اگر اسے اہلِ دنیا کے دلوں سے صرف ایک دن کے لیے اٹھا لیں تو نظامِ زندگی درہم برہم ہو جائے اور بہت کم افراد میں فعالیت، سعی و کوشش اور جوشِ عمل پیدا ہو۔

اس سلسلے میں پیغمبر اکرمؐ سے یہ مشہور حدیث منقول ہے:

الامل رحمة لامتی و لو لا الامل ما رضعت والدة ولدها و لاغرس غارس شجرًا۔

امید میری امت کے لیے سایۂ رحمت ہے اگر نورِ امید نہ ہو تو کوئی ماں اپنے بچے کو دودھ نہ پلائے، اور کوئی باغبان پودا نہ لگائے[1]

یہ حدیث بھی اسی عمل کی طرف اشارہ ہے لیکن حیات و حرکت کا یہی عامل جب حد سے گذر جائے اور دور دراز کی آرزو کی شکل اختیار کرے تو انحراف و بدبختی کا بدترین عامل ہے یہ بالکل آبِ باراں کی طرح ہے کہ جو سبب حیات ہے لیکن اگر حد سے بڑھ جائے تو غرقابی اور نابودی کا باعث ہو جائے۔

یہی وہ ہلاکت خیز آرزو ہے جس کا ذکر زیر بحث آیات میں آیا ہے اور اسے خدا و حق و حقیقت سے بے خبری کا باعث شمار کیا گیا ہے۔ یہ دور دراز کی آرزوئیں اور لمبی چوڑی امیدیں ہی ہیں جو انسان کو اس طرح اپنے میں مشغول رکھتی ہیں اور عالمِ تخیل میں مستغرق کر دیتی ہیں کہ انسان زندگی اور اس کے اصلی اہداف و مقاصد سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے۔

ایک مشہور حدیث کہ جو نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ سے منقول ہے وہ بھی اس حقیقت کو وضاحت سے بیان کرتی ہے:

ایها الناس ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان: اتباع الهوی و طول الامل، اما اتباع الهوی فیصد عن الحق، واما طول الامل فینسی الاٰخرة۔

اے لوگو! خوفناک ترین چیزیں کہ جن کا مجھے تمھارے بارے میں اندیشہ ہے وہ دو ہیں۔ ہوا و ہوس کی

---

[1] سفینۃ البحار ج ۱ ص ۳۰ (مادہ "امل")۔

Marfat.com

پیروی اور دور دراز کی آرزوئیں، کیونکہ ہوا و ہوس کی پیروی تمہیں حق سے باز رکھے گی اور دور دراز کی آرزو آخرت کو بھلا دے گی۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ کتنے ہی باصلاحیت اور لائق افراد ہیں کہ جو آرزوئے دراز کے دام میں گرفتاری کے زیر اثر ضعیف اور مسخ شدہ وجود بن چکے ہیں کہ جس کی وجہ سے نہ صرف وہ اپنے معاشرے کے لیے مفید نہیں رہے بلکہ اپنے ذاتی مفادات بھی پامال کر چکے ہیں اور ہر قسم کی ترقی اور کمال سے محروم ہو گئے ہیں۔ جیسا کہ دعائے کمیل میں ہے۔

وحبسنی عن نفعی بعد املی

طویل آرزو نے مجھے اپنے حقیقت منافع سے محروم کر دیا ہے۔

اصولی طور پر آرزو جب حد سے گذر جاتی ہے تو ہمیشہ انسانوں کو رنج و تعب میں مبتلا کر دیتی ہے پھر وہ رات دن کوشش کرتا ہے اور اپنے گمان میں سعادت و خوشحالی کی طرف جا رہا ہوتا ہے حالانکہ اسے بدبختی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ایسے افراد اکثر اوقات اس حالت میں جان دے دیتے ہیں ان کی دردناک اور غم انگیز زندگی ان کے لیے باعث عبرت ہے کہ جو دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان رکھتے ہیں۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۴۲

Marfat.com

۶۔ وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ؕ
۷۔ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ○
۸۔ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ○

ترجمہ

۶۔ اور انھوں نے کہا: اے وہ شخص کہ جس پر ذکر (قرآن) نازل ہوا ہے، بے شک تو دیوانہ ہے۔
۷۔ اگر تو سچ کہتا ہے تو ہمارے لیے فرشتے کیوں نہیں لے آتا۔
۸۔ (لیکن انھیں جان لینا چاہیے کہ) ہم فرشتوں کو حق کے بغیر نازل نہیں کرتے اور جس وقت نازل ہوئے تو پھر انھیں مہلت نہیں دی جائے گی (اور انکار کی صورت میں عذاب الٰہی میں نابود ہو جائیں گے)۔

تفسیر

فرشتوں کے نزول کا تقاضا۔

ان آیات میں پہلے تو قرآن اور پیغمبرؐ کے خلاف دشمنی پر مبنی کفار کے اعتراض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: انھوں نے کہا: اے وہ شخص جس پر قرآن نازل ہوا ہے ہم یقینی قسم کھاتے ہیں کہ تو دیوانہ ہے (و قالوا یا ایها الذی نزل علیه الذکر انك لمجنون)۔

پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں ان کے یہ الفاظ انتہائی گستاخی اور جسارت کو مجسم کرتے ہیں۔

ایک طرف تو "یا ایها الذی" (اے وہ شخص) کہا گیا ہے دوسری طرف "نزل علیه الذکر" کے الفاظ ہیں کہ جو انھوں نے قرآن کے استہزاء اور انکار کے طور پر کہے ہیں اور تیسری طرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجنون قرار دینے کے لفظ "ان" اور "لام قسم" کے ذریعے ان کی تاکید ہے۔

جی ہاں! جس وقت ہٹ دھرم اور بے مایہ افراد ایک عظیم اور بے مثل عقل کا سامنا کرتے ہیں تو وہ اس کے ساتھ "مجنون" کا پیوند لگانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ان کے لیے تو ان کی اپنی ناتواں عقل ہی میزان ہوتی ہے اور جو کچھ ان کی میزان میں نہ سما سکے وہ ان کی نگاہ میں بے عقلی اور دیوانگی ہے۔

ایسے افراد اپنے ماحول کے مسائل کے بارے میں خاص قسم کے تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں چاہے وہ گمراہی میں ہی کیوں نہ ہوں

Marfat.com

اسی لیے وہ ہر تازہ دعوت کو غیر عاقلانہ دعوت قرار دے کر مقابلے کی کوشش کرتے ہیں وہ نئی پیش آمدہ چیزوں سے وحشت زدہ ہوتے ہیں اور غلط روشوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں وہ دنیا پرست کہ جو تمام چیزوں کو مادی معیاروں پر پرکھتے ہیں اگر ان کا کسی ایسے انسان سے سامنا ہو کہ جو اپنے تمام مادی مفادات حتیٰ کہ اپنی جان بھی ایک روحانی مقصد کے لیے قربان کردے تو انھیں یقین نہیں آتا کہ وہ عاقل ہے کیونکہ ان کے نزدیک عقل کا کام زیادہ مال و دولت، خوبصورت بیوی، پر تعیش زندگی اور ظاہری مقام و منصب کا حصول ہے۔

بالکل واضح سی بات ہے کہ اگر کسی کی فکر بس مال و دولت، عورتوں اور مقام و منصب تک محدود ہے جو اس کے سامنے کہا جاتا ہے کہ: اگر آسمانی سورج میرے ایک ہاتھ پر اور چاند دوسرے ہاتھ پر رکھ دو اور تمھارے چھوٹے سے ماحول کی بجائے تمام نظام شمسی پر میری حکومت ہو تو بھی میں اپنی دعوت سے دستبردار نہیں ہوں گا، تو وہ یہ بات کرنے والے کو دیوانہ ہی قرار دے گا۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ یہ بے عقل افراد خدائی رہبروں کے ساتھ ایسے ایسے پیوند چسپاں کرتے تھے کہ جو بعض اوقات بالکل ایک دوسرے کی ضد ہوتے تھے کبھی انھیں "دیوانہ" کہتے اور کبھی "جادوگر"۔ حالانکہ جادوگر تو ایک خاص زیرکی اور ہوشیاری کا حامل ہوتا ہے اور عین "دیوانہ" کا مدمقابل ہے۔

یہ لوگ نہ صرف پیغمبر کی طرف ایسی غیر عاقلانہ نسبتیں دیتے تھے بلکہ بہانہ جوئی کے طور پر کہتے تھے۔ "اگر سچ کہتے ہو تو پھر ہمارے لیے فرشتے کیوں نہیں لاتے؛ تاکہ وہ تیری گفتگو کی تصدیق کریں اور ہم ایمان لے آئیں (لو ما تأتینا بالملٰئکة ان کنت من الصٰدقین)۔

خدا تعالیٰ انھیں جواب دیتا ہے: ہم ملائکہ کو سوائے حق کے نہیں بھیجتے (ما ننزل الملائکة الا بالحق) اور اگر فرشتے نازل ہوں (اور حقیقت ان کے لیے حسی پہلو اختیار کرلے) اور اس کے بعد وہ ایمان نہ لائیں تو پھر انھیں مہلت نہیں دی جائے گی اور وہ عذاب الٰہی کے ذریعے نابود ہو جائیں گے (و ما کانوا اذًا منظرین)

"ما ننزل الملٰئکة الا بالحق" کی تفسیر کے سلسلے میں مفسرین کے مختلف بیانات ہیں:۔

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم فرشتوں کو صرف بطور اعجاز حق واضح کرنے کے لیے نازل کریں گے نہ کہ ان کی بہانہ جوئی کے لیے کہ وہ دیکھ لیں اور پھر بھی ایمان نہ لائیں۔ دوسرے لفظوں میں معجزہ کوئی بازیچۂ اطفال نہیں کہ لوگوں کی من پسند سے رونما ہوتا رہے۔ بلکہ یہ تو اثبات حق کے لیے اور جو لوگ حق کے خواہاں ہیں ان کے لیے یہ امر بقدر کافی ثابت ہو چکا ہے کیونکہ پیغمبر اسلام نے قرآن جیسا معجزہ ہاتھ میں ہونے کے باوجود دوسرے معجزات بھی دکھا کر اپنی رسالت کو ثابت کیا تھا۔

۲۔ ایک احتمال یہ ذکر کیا گیا ہے کہ "حق" یہاں "موت" کے معنی میں ہے یعنی فرشتے صرف موت اور قبض روح کے وقت نازل ہوں گے۔ کسی اور وقت نہیں۔

لیکن یہ تفسیر بہت بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوطؑ کے واقعات میں، یہاں تک کہ مسلمانوں کے بارے میں بعض سے متعلق ہے کہ ان پر فرشتے نازل ہوئے۔

Marfat.com

۳۔ بعض نے کہا ہے کہ "حق" سے مراد یہاں وہی آخری دنیاوی عذاب اور نابود کرنے والی مصیبت ہے۔ دوسرے لفظوں میں "عذاب استیصال" ہے یعنی اگر فرشتے نازل ہوں اور پھر یہ ایمان نہ لائیں کیونکہ ان میں موجود ہٹ دھرمی کی وجہ سے یہ ایمان نہیں لائیں گے تو ان کی نابودی بھی ساتھ ہو گی۔

آیت کا دوسرا جملہ "وما کانوا اذاً منظرین" بھی اس معنی کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن پہلی تفسیر کے مطابق اس کا الگ نیا مفہوم ہے۔

۴۔ یہ احتمال بھی ہے کہ "حق" یہاں شہود کے معنی میں ہے یعنی جب تک یہ افراد اس دنیا میں ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے پردے پڑے ہیں اور یہ ایسے حقائق نہیں دیکھ سکتے کہ جو ماورائے مادّہ سے مربوط ہیں صرف دوسرے جہان میں عالمِ شہود ہو گا کہ جہاں پردے ہٹ جائیں گے تو پھر یہ فرشتگانِ الٰہی کو دیکھ سکیں گے۔

اس میں بھی دوسری تفسیر والا اشکال موجود ہے کیونکہ قومِ لوط کے بے ایمان اور گمراہ افراد تک نے عذاب پر مامور فرشتوں کو اسی دنیا میں دیکھا تھا[1]

اس بناء پر صرف پہلی اور تیسری تفسیر ظاہر آیت سے مناسبت رکھتی ہے۔

باقی رہا یہ مسئلہ کہ آیت میں ہے کہ اگر ان تمام واضح دلائل کے بعد بھی ان کے تقاضا کے مطابق حسی معجزہ پیش کیا جائے تو پھر انھیں مہلت نہیں دی جائے گی یہ اس بناء پر ہے کہ ایسی حالت میں ان کے لیے ہر پورے معنی کے لحاظ سے اتمام حجت ہو جائے گا، اور تمام بہانے ختم ہو جائیں گے اور چونکہ زندگی کی مہلت، اتمام حجت، احتمالِ تجدید نظر اور حق کی طرف بازگشت کے لیے ہے اور جن پر پوری طرح اتمام حجت ہو جائے ان کے لیے مہلت کوئی معنی نہیں رکھتی لہٰذا ان کی عمر کے اختتام کا اعلان ہو جاتا ہے اور وہ اس سزا اور عذاب تک جا پہنچتے ہیں جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں (غور کیجیے گا)۔

---

[1] سورۂ ہود، آیہ ۸۱۔

Marfat.com

۹. اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ○

ترجمہ

۹. ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم قطعی طور پر اس کی حفاظت کریں گے۔

تفسیر

قرآن کی حفاظت

کفار نے بہت بہانہ سازیاں کیں۔ یہاں تک کہ پیغمبرؐ اور قرآن کے بارے میں استہزاء کیا۔ گذشتہ آیات میں اس کا ذکر موجود ہے اس کے بعد زیر بحث آیت میں ایک عظیم اور نہایت اہم حقیقت بیان کی گئی ہے یہ بیان حقیقت ایک طرف تو پیغمبر اکرمؐ کی دلجوئی کے لیے ہے۔ اور دوسری طرف تمام سچے مومنین کے اطمینان کی خاطر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس قرآن کو کہ جو مایۂ تذکر ہے ہم نے نازل کیا ہے اور ہم یقینی طور پر اس کی حفاظت کریں گے (انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون)۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ قرآن کسی یار و مددگار کے بغیر ہے اور وہ اس کے آفتاب وجود کو کیچڑ سے چھپا دیں گے یا اس کے نور کو پھونکوں سے بجھا دیں گے ——— یہ تو وہ چراغ ہے جسے حق تعالیٰ نے روشن کیا ہے اور یہ وہ آفتاب ہے جس کے لیے غروب ہونا نہیں ہے۔

یہ چند ایک افراد اور ناتواں گروہ تو معمولی سی چیز ہے اگر دنیا بھر کے جابر، اہل اقتدار، سیاستدان، ظالم، منحرف اہل فکر اور جنگ آزما جمع ہو جائیں اور اس کے نور کو بجھانا چاہیں تو وہ بھی ایسا نہیں کر سکیں گے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے اپنے اوپر لے رکھا ہے۔

یہ کہ قرآن کی حفاظت سے مراد کن امور کی حفاظت ہے ——— اس سلسلے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں:

۱۔ بعض نے کہا ہے کہ تحریف و تغیر اور کمی بیشی سے حفاظت مراد ہے۔

۲۔ بعض نے کہا ہے کہ آخر دنیا تک فنا و نابودی سے حفاظت مقصود ہے۔

۳۔ بعض دیگر نے کہا ہے کہ قرآن کے خلاف گمراہ کرنے والی منطق کے مقابلے میں حفاظت مراد ہے۔

لیکن یہ تفاسیر نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے تضاد نہیں رکھتیں بلکہ "انا له لحفظون" کے عام مفہوم میں شامل ہیں تو پھر کیوں ہم اس محافظت کو ایک گوشے میں محصور کر دیں جبکہ یہ مطلق طور پر اور اصطلاح کے مطابق حذف متعلق کے ساتھ آئی ہے حق یہ ہے کہ اس آیت کے ذریعے خدا تعالیٰ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ قرآن کی ہر لحاظ سے حفاظت و نگہداری کرے گا اسے ہر قسم کی تحریف سے بچائیگا اسے فنا و نابودی سے محفوظ رکھے گا اور وسوسے پیدا کرنے والے سوفسطائیوں اور بدیہیات کے منکرین سے اس کی محافظت کرے گا۔

Marfat.com

باقی رہا بعض قدماء مفسرین کا یہ احتمال کہ یہاں ذاتِ پیغمبر کی حفاظت مراد ہے اور " لہ " کی ضمیر پیغمبرؐ کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ قرآن کی بعض آیات (مثلاً طلاق ۱۰) میں لفظ " ذکر " کا اطلاق ذاتِ پیغمبر پر ہوا ہے ——— یہ بہت بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیرِ بحث آیت سے قبل کی آیت میں لفظ " ذکر " صراحت کے ساتھ قرآن کے معنی میں آیا ہے۔ اور مسلّم ہے کہ یہ بعد والی آیت اسی معنی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

عدمِ تحریفِ قرآن

تمام شیعہ سنی علماء میں مشہور و معروف یہ ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی تحریف نہیں ہوئی اور جو قرآن آج ہمارے ہاتھ میں ہے، بالکل وہی قرآن ہے جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا، یہاں تک کہ اس میں کوئی لفظ اور کوئی حرف بھی کم یا زیادہ نہیں ہوا۔

قدماء و متاخرین میں سے وہ عظیم شیعہ علماء کہ جنھوں نے اس حقیقت کی تصریح کی ہے ان میں سے حسبِ ذیل علماء کے نام لیے جا سکتے ہیں:

۱۔ مرحوم شیخ طوسی ——— جو شیخ الطائفہ کے نام سے مشہور ہیں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "تفسیر تبیان" کے آغاز میں اس سلسلے میں روشن واضح اور قطعی بحث کی ہے۔

۲۔ سید مرتضیٰ ——— جو چوتھی صدی ہجری کے اعاظم علماء امامیہ میں سے ہیں۔

۳۔ رئیس المحدثین مرحوم صدوق محمد بن علی بن بابویہ ——— وہ عقائدِ امامیہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن میں کسی قسم کی کوئی تحریف نہیں ہوئی"۔

۴۔ عظیم مفسر مرحوم طبرسی نے بھی اپنی تفسیر کے مقدمہ میں اس سلسلے میں ایک واضح بحث کی ہے۔

۵۔ مرحوم کاشف الغطاء ——— جو بزرگ علماء متاخرین میں سے ہیں۔

۶۔ مرحوم محقق یزدی نے کتاب عروۃ الوثقیٰ میں جمہور مجتہدین شیعہ سے عدم تحریف قرآن نقل کیا ہے۔

۷۔ بہت سے دوسرے بزرگواروں مثلاً شیخ مفید، شیخ بہائی، قاضی نور اللہ اور دیگر شیعہ محققین نے یہی عقیدہ نقل کیا ہے۔

اہل سنت کے بزرگ اور محققین بھی زیادہ تر یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔

اگرچہ بعض شیعہ اور سنی محدثین کہ جن کی اطلاعات قرآن کے بارے میں ناقص تھیں انھوں نے قرآن میں وقوعِ تحریف کا ذکر کیا ہے لیکن دونوں مذاہب کے بزرگ علماء کی وضاحت سے یہ عقیدہ باطل قرار پا کر فراموش ہو چکا ہے۔

یہاں تک کہ مرحوم سید مرتضیٰ " المسائل الطرابلسیات " کے جواب میں کہتے ہیں:

"صحتِ نقلِ قرآن دنیا کے مشہور شہروں، تاریخ کے عظیم واقعات اور مشہور و معروف کتب کے بارے میں ہماری اطلاعات کی طرح واضح اور روشن ہے۔

کیا کوئی شخص مکہ اور مدینہ یا لندن اور پیرس جیسے شہروں کے ہونے میں کوئی شک و شبہ کر سکتا ہے اگرچہ اس نے کبھی بھی ان شہروں کی طرف سفر نہ کیا ہو۔

Marfat.com

کیا کوئی شخص ایران پر مغلوں کے حملے، فرانس کے عظیم انقلاب یا پہلی اور دوسری عالمی جنگ کا منکر ہو سکتا ہے۔

ایسا کیوں نہیں ہو سکتا ——— اس لیے یہ تمام چیزیں تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں۔

قرآن کی آیات بھی اسی طرح ہیں ——— اس تشریح کے ساتھ کہ جو ہم بعد میں بیان کریں گے۔

اگر بعض افراد نے اپنے مفادات کی غرض سے شیعہ و سنی میں تفرقہ ڈالنے کے لیے شیعوں کی طرف تحریف کے اعتقاد کی نسبت دی ہے تو ان کے دعویٰ کے بطلان کی دلیل علماء شیعہ کی بڑی اور عظیم کتب ہیں۔

یہ بات عجیب نہیں ہے کہ فخر رازی جیسا شخص کہ جو شیعوں سے مربوط مسائل میں خاص حساسیت اور تعصب رکھتا ہے محل بحث آیت کے ذیل میں کہتا ہے کہ یہ آیت "انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحٰفظون" مذہب شیعہ کے بطلان کی دلیل ہے کیونکہ وہ قرآن میں تغیر اور کمی بیشی کے قائل ہوتے ہیں۔

ہم صراحت سے کہتے ہیں کہ اگر اس کی مراد بزرگان اور محققین شیعہ ہیں تو ان میں سے کوئی بھی اس قسم کا عقیدہ نہ رکھتا تھا اور نہ رکھتا ہے اور اگر اس کی مراد یہ ہے کہ اس سلسلے میں شیعوں کے درمیان ایک ضعیف قول موجود ہے تو اس کی نظیر اہل سنت میں بھی موجود ہے کہ جس کی نہ وہ اعتناء کرتے ہیں نہ ہم۔

معروف محقق کاشف الغطاء اپنی کتاب "کشف الغطاء" میں کہتے ہیں:۔

لاریب انہ "ای القرآن" محفوظ من النقصان بحفظ الملک الدیان کما دل علیہ صریح القرآن و اجماع العلماء فی کل زمان ولا عبرۃ بنادر۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن خدا کی حفاظت کے سائے میں ہر قسم کی کمی اور تحریف سے محفوظ رہا ہے جیسا کہ صریح قرآن اس پر دلالت کرتا ہے اور ہر زمانے کے علماء کا اس پر اجماع رہا ہے اور شاذ و نادر افراد کی مخالفت کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (تفسیر آلاء الرحمٰن ص ۲۵)

تاریخ اسلام نے اس قسم کی ناروا نسبتیں کہ جن کا سرچشمہ تعصب کے سوا کچھ نہیں، بہت دیکھی ہیں ہم جانتے ہیں کہ ان میں سے بعض دشمنوں کی طرف سے پیدا کردہ غلط فہمیاں تھیں کہ جو اس قسم کے مسائل کھڑے کرتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد و وحدت ہرگز برقرار نہ رہے۔

معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ مشہور حجازی مؤلف عبداللہ علی القصیمی اپنی کتاب الصراع میں شیعوں کی مذمت کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

شیعہ ہمیشہ سے مساجد کے دشمن تھے یہی وجہ ہے کہ جو شخص شیعوں کے شہروں میں جائے، شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک اسے بہت کم مساجد دکھائی دیں گی۔[1]

---

[1] اس کی عبارت اس طرح ہے۔

والشیعۃ ہم ابدا اعداء المساجد ولہذا یقل ان یشاہد الضارب فی طول بلادہم و عرضہا مسجدًا

(الصراع جلد ۲ ص ۲۳، جیسا کہ علامہ امینی نے الغدیر ج ۳ ص ۳۰۰ پر نقل کیا ہے)

Marfat.com

خوب غور کریں کہ ـــــــ ہم ان تمام مساجد کو شمار کرتے کرتے تھک جاتے ہیں کہ جو شاہراہوں، بازاروں، کوچوں بلکہ شیعہ محلوں میں موجود ہیں۔ بعض مقامات پر تو ایک ہی علاقے میں اتنی زیادہ مسجدیں ہیں کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ بس کرو، آؤ کوئی اور کام بھی کرو۔

لیکن اس کے باوجود ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایک مشہور مؤلف اس صراحت سے ایسی بات کرتا ہے کہ جو ہم جیسے لوگوں کے نزدیک تو محض مضحکہ خیز ہے کہ جو ان مناطق اور شیعہ علاقوں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان حالات میں اگر فخر رازی کوئی ایسی نسبت دیتا ہے تو زیادہ تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

عدم تحریفِ قرآن ـــــــ کے دلائل

۱۔ **حافظانِ قرآن :** عدم تحریفِ قرآن کے بارے میں ہمارے پاس بہت زیادہ دلائل و براہین موجود ہیں ان میں زیادہ واضح اور روشن زیرِ بحث آیت اور قرآن کی کچھ اور آیات کے علاوہ اس عظیم آسمانی کتاب کی تاریخ بھی ہے۔

مقدمہ کے طور پر اس نکتے کی یاد دہانی ضروری ہے کہ وہ ضعیف اقلیت کہ جس نے تحریفِ قرآن کا احتمال ذکر کیا ہے، وہ صرف قرآن میں کمی کے سلسلے میں ہے۔ ورنہ کسی نے بھی یہ احتمال پیش نہیں کیا کہ موجودہ قرآن میں کسی چیز کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (غور کیجیے گا)

یہاں سے گزر کر اگر ہم اس موضوع پر غور و فکر کریں کہ قرآن مسلمانوں کے لیے سب کچھ تھا ـــــــ قانونِ اساسی، زندگی کا دستور العمل، حکومت کا پروگرام، مقدس آسمانی کتاب اور رمزِ عبادت ـــــــ سب کچھ تو قرآن تھا ـــــــ تو اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصولی طور پر اس میں کمی بیشی کا امکان ہی نہیں۔

قرآن ایک ایسی کتاب تھی کہ پہلے دور کے مسلمان ہمیشہ نمازوں میں، مسجدوں میں، گھروں میں، میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرتے ہوئے اپنے مکتب کی حقانیت پر استدلال کرنے کے لیے اسی سے استفادہ کرتے تھے ـــــــ یہاں تک کہ تاریخِ اسلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمِ قرآن عورتوں کا حق مہر قرار دیتے تھے ـــــــ اور اصولی طور پر ـــــــ تنہا وہ کتاب کہ جو تمام محافل کا موضوع تھی اور ہر بچے کو ابتدائے عمر سے جس سے آشنا کیا جاتا تھا اور جو شخص بھی اسلام کا کوئی درس پڑھنا چاہتا اسے اس کی تعلیم دی جاتی تھی ـــــــ جی ہاں وہ قرآن ـــــــ یہی قرآن مجید ہے۔

کیا اس کیفیت کے ہوتے ہوئے کسی شخص کو یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ اس آسمانی کتاب میں تغیر و تبدل ہو گیا ہو ـــــــ خصوصاً جبکہ ہم نے اسی تفسیر کی جلد اوّل کی ابتداء میں ثابت کیا ہے کہ قرآن ایک مجموعہ کی صورت میں، اسی موجودہ صورت میں خود زمانہ پیغمبر میں جمع ہو چکا تھا اور مسلمان سختی سے اسے یاد کرنے اور حفظ کرنے کو اہمیت دیتے تھے۔ اصولی طور پر اس زمانے میں افراد کی شخصیت زیادہ تر اس بات سے پہچانی جاتی تھی کہ انھیں قرآن کی آیات کس حد تک یاد ہیں۔

قرآن کے حافظوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ تواریخ میں ہے کہ حضرت ابوبکر کے زمانے میں ایک جنگ میں قرآن کے

Marfat.com

چار سو قاری مارے گئے تھے۔[1]

"بئر معونہ" مدینہ کی نزدیکی آبادیوں میں سے تھی۔ یہاں ایک واقعہ رونما ہوا جس کے نتیجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں اس علاقے میں ایک جنگ رونما ہوگئی۔ اس جنگ میں اصحاب پیغمبرؐ میں سے قاریانِ قرآن کی ایک کثیر جماعت نے شربتِ شہادت نوش کیا یہ تقریباً ستر افراد تھے۔[2]

ان سے اور ان جیسے دیگر واقعات سے واضح ہو جاتا ہے کہ حافظ و قاری اور معلمین قرآن اس قدر زیادہ تھے کہ صرف ایک میدانِ جنگ میں ان میں سے اتنی تعداد نے جامِ شہادت نوش کیا ــــــــــ اور تعداد ایسی ہونا ہی چاہیے تھی کیونکہ ہم نے کہا ہے کہ قرآن مسلمانوں کے لیے صرف قانونِ اساسی نہیں ہے بلکہ ان کا سب کچھ اسی سے تشکیل پاتا ہے۔ خصوصاً ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی کتاب نہ تھی اور تلاوت و قرأت اور حفظ و تعلیم و تعلّم قرآن کے ساتھ مخصوص تھا قرآن ایک متروک کتاب نہ یہ گھر یا مسجد کے کسی کونے میں فراموشی کے گرد و غبار کے نیچے پڑی ہوئی نہ تھی کہ کوئی اس میں کمی یا زیادتی کر دیتا۔

حفظ قرآن کا مسئلہ ایک سنت اور ایک عظیم عبادت کے عنوان سے ہمیشہ مسلمانوں کے درمیان تھا اور رہے یہاں تک کہ قرآن ایک کتاب کی صورت میں بہت زیادہ پھیل گیا اور تمام جگہوں پر پہنچ گیا ــــــــــ بلکہ آج بھی چھاپہ خانے کی صنعت کے وجود میں آنے کے بعد جبکہ اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ قرآن ہی چھپتا اور نشر ہوتا ہے پھر بھی حفظِ قرآن کے مسئلے نے ایک قدیم سنت اور عظیم افتخار کے طور پر اپنی اہمیت و حیثیت کو محفوظ رکھا ہے اور ہر شہر و دیار میں ہمیشہ ایک جماعت حافظِ قرآن تھی اور آج بھی ہے۔

اس وقت بھی حجاز اور کئی دیگر اسلامی ممالک میں "تحفظ القرآن الکریم" یا دوسرے ناموں سے ایسے مدارس موجود ہیں، جہاں طالب علموں کو پہلے مرحلے میں قرآن حفظ کرایا جاتا ہے۔ سفر مکہ کے دوران اس شہر مقدس میں ان مدارس کے سربراہوں سے جو ملاقات ہوئی اس سے معلوم ہوا ہے ان مدارس میں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مشغول تحصیل ہیں۔ جاننے والوں میں سے ایک شخص نے بتایا کہ اس وقت پاکستان میں تقریباً پندرہ لاکھ حافظانِ قرآن موجود ہیں۔

جیسا کہ دائرۃ المعارف فرید وجدی نے نقل کیا ہے جامعۃ الازہر مصر کی اسلامی یونیورسٹی میں داخلے کی ایک شرط پورے قرآن کا حفظ ہونا ہے اس کے لیے چالیس میں سے کم از کم بیس نمبر رکھے گئے ہیں۔

مختصر یہ کہ خود آنحضرتؐ کے حکم و تاکید سے کہ جو بہت زیادہ روایات میں آئی ہے حفظِ قرآن کی سنت زمانہ پیغمبرؐ سے لے کر آج تک ہر دور میں جاری و ساری ہے۔ کیا ایسی حالت میں تحریفِ قرآن کے بارے میں کسی احتمال کا امکان ہے؟

۲۔ کاتبانِ وحی: ان تمام امور کے علاوہ کاتبانِ وحی کا معاملہ بھی غور طلب ہے یہ وہ افراد تھے جو آنحضرتؐ کے حکم او تاکید سے آپ پر قرآن کی آیات نازل ہونے کے بعد انھیں لکھ لیتے تھے ان کی تعداد چودہ سے لے کر تینتالیس[۴۳] تک بیان کی گئی ہے۔

---

[1] البیان فی تفسیر القرآن ص ۲۶۰ بحوالہ منتخب کنز العمال۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۵۰۔

Marfat.com

ابوعبداللہ زنجانی اپنی نہایت قیمتی کتاب "تاریخ قرآن" میں لکھتے ہیں۔

کان للنبی کتابًا یکتبون الوحی وھم ثلاثۃ و اربعون اشھرھم الخلفاء الاربعۃ وکان الزمھم للنبی زید بن ثابت وعلی بن ابی طالب علیہ السلام۔

پیغمبرؐ کے مختلف کاتب اور لکھنے والے کہ جو وحی لکھا کرتے تھے اور وہ تنتالیس افراد تھے کہ جن میں زیادہ مشہور خلفاء اربعہ تھے۔ لیکن اس سلسلے میں پیغمبرؐ کے سب سے بڑھ کر ساتھی زید بن ثابت اور علی ابن ابی طالب علیہ السلام تھے[1]

وہ کتاب کہ جسے اس قدر لکھنے والے تھے کیسے ممکن ہے کہ تحریف کرنے والے اس کی طرف ہاتھ بڑھا سکتے۔

۲۔ **تمام رہبرانِ اسلام نے اسی قرآن کی دعوت دی ہے:** یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اسلام کے عظیم پیشواؤں کے کلمات کا مطالعہ نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ابتدائے اسلام سے باہم یک زبان لوگوں کو اسی موجودہ قرآن کی تلاوت، مطالعہ اور اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتے تھے اور یہ امر خود نشاندہی کرتا ہے کہ یہ آسمانی کتاب اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر بعد تک تحریف ناپذیر مجموعہ کی صورت میں موجود رہی ہے۔

نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام کے کلمات اس دعویٰ کے زندہ گواہ ہیں۔

خطبہ ۱۳۳ میں آپؑ فرماتے ہیں:۔

وکتاب اللہ بین اظھرکم، ناطق لا یعیا لسانہ، وبیت لا تھدم ارکانہ، وعز لا تھزم اعوانہ۔

اور کتاب اللہ تمہارے درمیان ایسا ناطق ہے جس کی زبان کبھی گنگ نہیں ہوتی۔ یہ ایسا گھر ہے جس کے ستون کبھی منہدم نہیں ہوتے اور یہ ایسا سرمایۂ عزت ہے جس کے انصار کبھی مغلوب نہیں ہوتے۔

خطبہ ۱۷۶ میں فرماتے ہیں:۔

واعلموا ان ھذا القرآن ھو الناصح الذی لا یغش والھادی الذی لا یضل۔

جان لو کہ یہ قرآن ایسا ناصح ہے جو اپنی نصیحت میں کبھی خیانت نہیں کرتا اور ایسا ہادی ہے جو کبھی گمراہ نہیں کرتا۔

نیز اسی خطبے میں ہے:۔

وما جالس ھذا القرآن احد الا قام عنہ بزیادۃ او نقصان، زیادۃ من ھدی، او نقصان من عمی۔

---

[1] تاریخ القرآن ص ۲۴۔

Marfat.com

، کوئی شخص اس قرآن کا ہم نشین نہیں ہوتا مگر یہ کہ اس سے پاس سے زیادتی یا نقصان کیساتھ اٹھتا ہے ۔ ہدایت کی زیادتی یا گمراہی کی کمی۔

اسی خطبے کے آخر میں ہے:

ان اللہ سبحانہ لم یعظ احداً بمثل ھذا القرآن ، فانہ حبل اللہ المتین وسببہ الامین

خدا نے کسی کو اس قرآن جیسی وعظ و نصیحت نہیں کی۔ کیونکہ یہ خدا کی محکم رسی اور اس کا قابلِ اطمینان وسیلہ ہے۔

خطبہ ۱۹۸ میں ہے:۔

ثم انزل علیہ الکتاب نوراً لا تطفأ مصابیحہ ، وسراجاً لا یخبو توقدہ ......

ومنھاجاً لا یضل نھجہ .... وفرقاناً لا یخمد برھانہ

اس کتاب کے بعد خدا نے اپنے نبی پر ایک کتاب نازل کی ——— وہ کتاب جو خاموش نہ ہونے والا نور ہے اور جو ایسا چراغ پر فروغ ہے کہ جس میں تاریکی آ ہی نہیں سکتی اور یہ ایسا راستہ ہے جس پر چلنے والے گمراہ نہیں ہو سکتے اور یہ حق کی باطل سے جدائی کا ایسا سبب ہے جس کی برہان خاموش نہیں ہوتی۔

ایسی تعبیرات حضرت علی علیہ السلام اور دیگر پیشوایانِ دین کے کلمات و ارشادات میں بہت زیادہ ہیں۔
فرض کریں کہ اگر دستِ تحریف اس آسمانی کتاب کی طرف بڑھا ہوتا تو کیا پھر بھی ممکن تھا کہ اس کی طرف دعوت دی جاتی۔ اور اسے راہ کشا، حق کی باطل سے جدائی کا ذریعہ، نہ بجھنے والا نور، خاموش نہ ہونے والا چراغ، خدا کی محکم رسی اور اس کا امین و قابلِ اطمینان وسیلہ قرار دے کر تعارف کروایا جاتا۔

۴۔ آخری دین اور ختمِ نبوت کا تقاضا:۔ اصولی طور پر پیغمبر اسلام کی خاتمیت قبول کر لینے کے بعد اور یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ دینِ اسلام آخری خدائی دین ہے اور قرآن کا پیغام دنیا کے خاتمے تک برقرار رہے گا کس طرح یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ خدا اسلام اور پیغمبر خاتم کی اس واحد سند کی حفاظت نہیں کرے گا۔
اسلام کے ہزاروں سال تک باقی رہنے، جاوداں ہونے اور آخری دنیا تک رہنے کے ساتھ کیا تحریفِ قرآن کا کوئی مفہوم ہو سکتا ہے؟

۵۔ روایاتِ ثقلین:۔ روایات ثقلین کہ جو طرق معتبرہ و متعددہ سے پیغمبر اسلام سے نقل ہوئی ہیں قرآن کی اصالت اور ہر قسم کے تغیر و تبدل سے محفوظ رہنے پر ایک اور دلیل ہیں کیونکہ ان روایات کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

میں تمہارے درمیان میں سے جا رہا ہوں اور دو گرانمایہ چیزیں تمہارے لیے بطور یادگار چھوڑے جا رہا ہوں۔ پہلی قرآن اور دوسری میری اہل بیت۔ اگر تم نے ان کا دامن نہ چھوڑا، تو ہرگز

Marfat.com

گمراہ نہیں ہوگے [۱]

کیا ایسی بات کسی ایسی کتاب کے لیے صحیح ہے جو تحریف کا شکار ہو گئی ہو۔

۶۔ **قرآن جھوٹی اور سچی روایات کے لیے کسوٹی ہے:** ان سب پہلوؤں سے قطع نظر قرآن کا تعارف سچی اور جھوٹی روایات واحادیث کو پرکھنے کے لیے معیار کے طور پر کروایا گیا ہے بہت سی روایات کہ جو منابع اسلام میں آئی ہیں ان میں ہے کہ جس حدیث کے سچے یا جھوٹے ہونے کے بارے میں شک کرو اسے قرآن کے سامنے پیش کرو، جو حدیث قرآن کے موافق ہے وہ حق ہے اور جو حدیث اس کے مخالف ہے وہ باطل اور غلط ہے۔

فرض کریں کہ قرآن میں کمی کے لحاظ سے ہی تحریف ہوئی ہوتی تب بھی ہرگز ممکن نہ تھا کہ اس کا تعارف حق و باطل کو پرکھنے کی کسوٹی کے طور پر کروایا جاتا۔

روایاتِ تحریف

مسئلہ تحریف کے بارے میں جو بعض لوگوں کے ہاتھ اہم ترین دستاویز ہے وہ ایسی مختلف روایات ہیں جن کا حقیقی مفہوم نہیں سمجھا گیا یا پھر ان کی سند کے بارے میں تحقیق نہیں کی گئی جس کی وجہ سے اس قسم کی بُری تعبیر وجود میں آئی ہے۔

ایسی روایات مختلف قسم کی ہیں:

۱۔ ایسی روایات جن میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت علیؑ نے قرآن جمع کرنا شروع کیا جب اسے جمع کر چکے تو اسے صحابہ کے ایک گروہ کے پاس لے آئے انھوں نے مقام خلافت کے ارد گرد کو گھیر رکھا تھا۔ آپ نے پیش فرمایا تو انھوں نے اسے قبول نہ کیا۔ اس پر حضرت علیؑ نے کہا: پھر تم اسے کبھی نہ دیکھو گے۔

لیکن ان روایات میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے پاس جو قرآن تھا وہ دوسرے قرآنوں سے مختلف نہیں تھا۔ البتہ تین چیزوں کا فرق تھا۔

پہلا یہ کہ اس کی آیات اور سورتیں ترتیب نزولی کے مطابق منظم کی گئی تھیں۔

دوسرا یہ کہ ہر آیت اور سورۃ کی شانِ نزول اس کے ساتھ لکھی ہوئی تھی۔

تیسرا یہ کہ جو تفاسیر آپ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنی تھیں وہ اس میں درج تھیں۔ نیز اس میں آیات ناسخ و منسوخ کی نشاندہی بھی کی گئی تھی۔

---

[۱] حدیث ثقلین متواتر احادیث میں سے ہے یہ حدیث اہل سنت کی بہت سی کتب میں صحابہ کی ایک جماعت کی وساطت سے پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہوئی ہے ان صحابہ میں ابوسعید خدری، زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابوہریرہ، حذیفہ بن اسید، جابر بن عبداللہ انصاری، عبداللہ حنطب، عبد بن حمید، جبیر بن مطعم، ضمرہ اسلمی، ابوذر غفاری، ابو رافع اور ام سلمہ وغیرہ شامل ہیں۔

Marfat.com

لہٰذا وہ قرآن جو حضرت علی علیہ السلام نے جمع کیا تھا اس میں اس قرآن سے ہٹ کر کوئی نئی چیز نہ تھی اور جو چیز زیادہ تھی وہ تفسیر تاویل، شانِ نزول اور ناسخ و منسوخ کی تمیز وغیرہ تھی ———— دوسرے لفظوں میں وہ قرآن بھی تھا اور قرآن کی اصلی تفسیر بھی تھی۔

کتاب سلیم بن قیس میں ہے:

ان امیر المؤمنین (ع) لما رای غدر الصحابة وقلة وفائهم لزم بیته، واقبل علی القرآن، فلما جمعه کله، وکتابه بیده، وتأویله الناسخ والمنسوخ، بعث الیه ان اخرج فبایع، فبعث الیه انی مشغول فقد آلیت علی نفسی لا ارتدی برداء الا لصلاة حتی اؤلف القرآن واجمعه[1]

جس وقت امیر المومنین علیہ السلام نے صحابہ کی بے وفائی اور دوستوں کی کمی دیکھی تو گھر نہ چھوڑا اور قرآن کی طرف متوجہ ہوئے آپ قرآن جمع کرنے اور اسے اپنے ہاتھ سے لکھنے میں مشغول ہو گئے یہاں تک کہ تاویل اور ناسخ و منسوخ سب کو جمع کر لیا اس دوران میں انہوں نے آپ کے پاس کسی کو بھیجا کہ گھر سے باہر نکلیں اور بیعت کریں آپ نے جواب میں کہلا بھیجا کہ میں مشغول ہوں، میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک قرآن جمع نہ کر لوں سوائے نماز کے عبا کندھے پر نہیں ڈالوں گا۔

۲۔ ان روایات کی دوسری قسم وہ ہے جو تحریفِ معنوی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تحریف تین طرح کی ہے:۔

۱۔ تحریف لفظی

۲۔ تحریف معنوی

۳۔ تحریف عملی

۱۔ تحریف لفظی یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ اور عبارت میں کمی بیشی اور تغیر کیا جائے اور یہ وہ تحریف ہے جس کا ہم اور تمام محققینِ اسلام شدت سے انکار کرتے ہیں۔

۲۔ تحریف معنوی یہ ہے کہ آیت کا معنی اور تفسیر اس طرح سے کی جائے کہ وہ اس کے حقیقی مفہوم کے برخلاف ہو۔

۳۔ تحریف عملی یہ ہے کہ اس کے خلاف عمل کیا جائے۔

مثلاً تفسیر علی بن ابراہیم میں ابوذر سے منقول ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی:۔

یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ

جس دن کچھ لوگوں کے چہرے تو سفید ہوں گے اور کچھ کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ (آل عمران – ۱۰۶)

---

[1] بحار الانوار ج ۱۹ ص ۱۱۔

Marfat.com

تو پیغمبرؐ نے فرمایا:۔

روز قیامت لوگوں سے سوال کیا جائے گا کہ تم نے ثقلین (قرآن اور عترت پیغمبرؐ) کے ساتھ کیا سلوک کیا تو لوگ کہیں گے:

اما الاکبر فحرفناہ، ونبذناہ وراء ظهورنا۔۔۔۔۔۔

ہم نے ثقل اکبر (قرآن) کی تحریف کی اور اسے پس پشت ڈال دیا۔۔۔۔۔۔

واضح ہے کہ یہاں تحریف سے مراد وہی مفہوم قرآن کو دگرگوں کرنا اور اسے پس پشت ڈال دینا ہے۔

۳۔ تیسری قسم ان روایات کی ایسی روایات ہیں جو جعلی ہیں۔ یہ روایات دشمنوں، منحرفوں یا نادانوں نے قرآن کو بے اعتبار کرنے کے لیے گھڑی ہیں مثلاً وہ متعدد روایات جو احمد بن محمد بن سیّاری سے نقل ہوئی ہیں کہ جن کی تعداد ایک سو اٹھاسی[1] تک جا پہنچی ہے۔ مرحوم حاجی نوری نے کتاب "فصل الخطاب" میں انہیں فراوانی سے نقل کیا ہے۔

ان احادیث کا راوی سیاری بہت سے بزرگ علماءِ رجال کے بقول فاسد المذہب، ناقابلِ اعتماد اور ضعیف الحدیث تھا اور بعض کے بقول صاحب غلو، منحرف، تناسخ کے ساتھ مشہور اور کذاب تھا۔ مشہور صاحب کتاب رجال کشی کے بقول امام جواد علیہ السلام نے اپنے خط میں سیاری کے دعووں کو باطل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

البتہ روایاتِ تحریف سیّاری میں منحصر نہیں ہیں لیکن ان کا زیادہ تر حصّہ اسی کی طرف سے ہے۔

ان جعلی روایات میں کچھ مضحکہ خیز روایات بھی نظر آتی ہیں جو شخص تھوڑا بہت بھی مطالعہ رکھتا ہے وہ فوراً ان روایات کی خرابی کو سمجھ لیتا ہے مثلاً ایک روایت کہتی ہے کہ سورۂ نساء کی آیہ ۳ میں "وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا ما طاب لکم من النساء" (اور اگر تمھیں ڈر ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان عورتوں سے نکاح کرو جو تمھیں اچھی لگتی ہیں) شرط اور جزاء کے درمیان میں سے ایک تہائی سے زیادہ قرآن ساقط ہو گیا ہے۔

حالانکہ ہم سورۂ نساء کی تفسیر میں کہہ چکے ہیں کہ اس آیت میں شرط اور جزا پوری طرح ایک دوسرے سے مربوط ہیں یہاں تک کہ اس میں سے ایک لفظ بھی ساقط نہیں ہوا۔

علاوہ ازیں ایک تہائی سے زیادہ تو پھر اس حساب سے کم از کم چودہ پاروں کے برابر بنتا ہے۔

یہ بات انتہائی مضحکہ خیز ہے کہ کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ ان سب کاتبانِ وحی اور زمانہ پیغمبرؐ سے لے کر آج تک قرآن کے حافظوں اور قاریوں کے ہوتے ہوئے اس کے چودہ پارے ضائع ہو گئے اور کوئی آگاہ بھی نہ ہوا۔

ان جھوٹوں اور جعل سازوں نے اس تاریخی حقیقت کی طرف توجہ نہیں کی کہ قرآن کہ جو اسلام کا قانونِ اساسی ہے اور شروع سے مسلمانوں کا سب کچھ اسی سے تشکیل پاتا ہے رات دن گھروں اور مسجدوں میں اس کی تلاوت ہوتی رہتی ہے کیا اس عالم میں اس کا ایک لفظ بھی ساقط کیا جا سکتا تھا چہ جائیکہ اس کے چودہ پارے غائب کر دیئے جائیں۔ یہ اتنا بڑا جھوٹ ایسی احادیث گھڑنے والوں کے پیدا ہونے کی واضح دلیل ہے۔

---

[1] یہ تعداد کتاب "برہان روشن" کے مؤلف نے لکھی ہے۔

Marfat.com

بہت سے بہانہ تراش کتاب فصل الخطاب کا سہارا لیتے ہیں ۔ اس کتاب کی طرف ہم نے سطور بالا میں اشارہ کیا ہے یہ مرحوم حاجی نوری کی تالیف ہے اور تحریف کے سلسلے میں لکھی گئی ہے اس کے بارے میں ہم نے جو کچھ اوپر کہا ہے اس کے علاوہ اس بات سے اس کی کیفیت واضح ہوجاتی ہے کہ مرحوم حاج شیخ آقا بزرگ تہرانی کہ جو مرحوم حاجی نور کے شاگرد مبرز ہیں ، اپنے استاد کے حالات کے ذیل میں "مستدرک الوسائل" کی پہلی جلد میں لکھتے ہیں :۔

> باقی رہا کتاب "فصل الخطاب" کے بارے میں تو میں نے بارہا اپنے استاد سے سنا کہ فرماتے تھے کہ وہ مطالب جو فصل الخطاب میں ہیں وہ میرا ذاتی عقیدہ نہیں ہے ۔ یہ کتاب تو میں نے بحث واشکال کے لیے لکھی ہے اور اشارتاً عدم تحریف کے بارے میں اپنا عقیدہ بھی بیان کردیا ہے اور بہتر تھا کہ میں کتاب کا نام "فصل الخطاب فی عدم تحریف الکتاب" رکھتا ۔

اس کے بعد مرحوم محدث تہرانی کہتے ہیں :

> عملی لحاظ سے ہم اپنے استاد کی روش اچھی طرح دیکھتے تھے کہ وہ روایات تحریف کو کچھ بھی وزن دینے کے قائل نہ تھے بلکہ انھیں ایسی روایات سمجھتے تھے جنھیں دیوار پر دے مارنا چاہیے ۔ ہمارے استاد کی طرف تحریف کی نسبت وہی شخص دے سکتا ہے جو ان کے عقیدے سے آشنائی نہ رکھتا ہو ۔

آخری بات یہ ہے کہ بعض ایسے لوگ جو مسلمانوں کے لیے اس آسمانی کتاب کی عظمت کو محسوس نہیں کرتے تھے انھوں نے کوشش کی کہ اس قسم کے خرافات اور اباطیل سے قرآن کو اس کی اصالت اور بنیاد سے گرادیں ۔ گذشتہ اور موجودہ زمانے میں بہت سے ہاتھوں نے اس سلسلے میں کام کیا ہے اور کر رہے ہیں ۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے اخبارات میں پڑھا تھا کہ ایادی اسرائیل اور صیہونزم کی طرف سے قرآن شائع کیا اور اس میں بہت سی آیات تبدیل کردیں لیکن یہ ان کا اندھا پن تھا ۔ علماء اسلام فوراً دشمن کی اس سازش سے آگاہ ہوئے اور ان نسخوں کو اکٹھا کرلیا ۔ یہ سیاہ دل دشمن نہیں جانتے تھے کہ قرآن میں سے اگر ایک نقطہ بھی تبدیل ہوجائے تو قرآن کے مفسرین ، حفاظ اور قارئین فوراً اس سے آگاہ ہوجائیں گے ۔

وہ چاہتے ہیں کہ نور خدا کو بجھادیں لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں کرسکتے ۔

یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم ویأبی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون (توبہ — ۳۲)

Marfat.com

۱۰۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ شِیَعِ الْاَوَّلِیْنَ ○
۱۱۔ وَمَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ○
۱۲۔ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِیْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِیْنَ ○
۱۳۔ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ ○
۱۴۔ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِیْهِ یَعْرُجُوْنَ ○
۱۵۔ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۔ ہم نے تجھ سے پہلے (بھی) گذشتہ امتوں کے درمیان پیغمبر بھیجے ہیں۔

۱۱۔ کوئی پیغمبر ان کے پاس نہیں آتا تھا مگر یہ کہ وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

۱۲۔ ہم اسی طرح (اور تمام وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے) قرآن کو مجرموں کے دلوں کے اندر راستہ دیتے ہیں۔

۱۳۔ (لیکن اس کے باوجود) وہ اس پر ایمان نہیں لائیں گے اور گذشتہ امتوں کی روش بھی اسی طرح تھی۔

۱۴۔ اور اگر ہم آسمان سے ان کے لیے کوئی دروازہ کھول دیں اور وہ مسلسل اس میں اوپر کی طرف جائیں

۱۵۔ تو کہیں گے کہ ہماری چشم بندی کی گئی ہے بلکہ ہمیں (سرتاپا) مسحور کر دیا گیا ہے۔

تفسیر

ہٹ دھرمی اور محسوسات کا انکار

ان آیات میں پیغمبر اکرمؐ اور مومنین کو اپنی دعوت میں درپیش مشکلات کے مقابلے میں تسلی و تشفی کے لیے گذشتہ انبیاء کی زندگی اور گمراہ و متعصب قوموں کے مقابلے میں ان کی مصیبتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: تجھ سے پہلے ہم نے گذشتہ امتوں کے درمیان بھی نبی بھیجے تھے (و لقد ارسلنا من قبلك فی شیع الاولین)۔

Marfat.com

لیکن وہ لوگ ایسے ہٹ دھرم اور سخت مزاج تھے کہ "جو پیغمبر بھی ان کے پاس آیا وہ اس کا تمسخر اڑاتے (وما یأتیھم من رسول الا کانوا بہ یستھزءون)۔

یہ استہزاء چند امور کی وجہ سے ہوتا تھا

۔۔۔۔ انبیاء کی شان و شوکت کو کم کرنے اور حق کے متلاشی اور حق طلب افراد کو اُن سے دُور کرنے کے لیے۔

۔۔۔۔ خدائی رسولوں کی منطق کے مقابلے میں ان کی اپنی ناتوانی کی وجہ سے چونکہ وہ لوگ ان کے دندان شکن دلائل کا جواب نہیں دے سکتے تھے لہٰذا تمسخر کا سہارا لیتے یعنی بے منطق نادانوں کا حربہ استعمال کرتے تھے۔

۔۔۔۔ اس بناء پر کہ انبیاء بدعت شکن تھے اور غیر مناسب رسوم و رواج کے خلاف قیام کرتے تھے لیکن جاہل متعصب کہ جو ان غلط رسوم و رواج کو ابدی سمجھتے تھے انھیں اس کام پر تعجب ہوتا تھا اور وہ استہزاء کرنے لگتے تھے۔

۔۔۔۔ یہ لوگ اس لیے بھی استہزاء کرتے تھے کہ اپنے خوابیدہ ضمیر کو سلائے رکھیں اور کہیں کوئی ذمہ داری اور مسئولیت ان کے سر نہ آجائے۔

۔۔۔۔ اس لیے کہ بہت سے انبیاء کے ہاتھ مالِ دنیا سے تہی ہوتے تھے اور ان کی زندگی سادہ ہوتی تھی جو لوگ اپنے دل کے اندھے پن کی وجہ سے شخصیت کو نئے لباس، اعلیٰ سواری اور رنگین زندگی میں منحصر سمجھتے تھے انھیں تعجب ہوتا تھا کہ کیا ایک فقیر اور تہی دست انسان ان دولت مندوں اور خوشحال لوگوں کا رہبر و رہنما ہو سکتا ہے؟ لہٰذا وہ اس کا تمسخر اڑانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔

۔۔۔۔ آخر کار یہ بھی تھا کہ وہ دیکھتے تھے کہ انبیاء کی دعوت قبول کرنے سے ان کی شہوات و خواہشات محدود ہو جائیں گی اور ان کی حیوانی آزادی چھن جائے گی۔ اور ان کے لیے فرائض اور ذمہ داریاں پیدا ہو جائیں گی لہٰذا وہ استہزاء سے کام لیتے تاکہ اپنے آپ کو ان فرائض اور ذمہ داریوں سے بچا سکیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا: اسی طرح ہم آیاتِ قرآن ان مجرموں کے دلوں میں بھیجتے ہیں (کذٰلک نسلکہ فی قلوب المجرمین)۔

لیکن ان تمام تبلیغ، تاکید، منطقی بیان اور معجزات دکھانے کے باوجود یہ متعصب تمسخر اڑانے والے "اس پر ایمان نہیں لاتے" (لا یؤمنون بہ)۔

البتہ یہ انھی پر منحصر نہیں ہے" ان سے پہلے گزشتہ اقوام کی بھی یہی روش تھی (وقد خلت سنۃ الاولین)۔

شہوات میں غوطہ زنی اور باطل پر ہٹ دھرمی کے باعث ان کا معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اگر ہم ان کے لیے آسمان میں کوئی دروازہ کھول دیں اور وہ ہمیشہ آسمان کی طرف چڑھیں اور اتریں (ولو فتحنا علیھم باباً من السماء فظلوا فیہ یعرجون) تو کہیں گے کہ ہماری چشم بندی کی گئی ہے (لقالوا انما سکرت ابصارنا)۔ بلکہ ہمیں جادو کر دیا گیا ہے اور جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں، اس میں قطعاً کوئی حقیقت نہیں ہے (بل نحن قوم مسحورون)۔

Marfat.com

یہ جائے تعجب نہیں کہ انسان عناد اور ہٹ دھرمی کے اس درجے پر پہنچ جائے کیونکہ انسان کی پاک روح اور خرابی سے بچی ہوئی فطرت کہ جو ادراک حقائق اور واقعیات کے اصلی چہرے کے مشاہدہ پر قدرت رکھتی ہے، گناہ جہالت اور حق سے دشمنی رکھنے کے زیر اثر آہستہ آہستہ تاریکی میں جا گرتی ہے البتہ ابتدائی مراحل میں اسے پاک کرنا پوری طرح ممکن ہے لیکن اگر خدانخواستہ یہ حالت انسان میں راسخ ہو جائے اور "ملکہ" کی شکل اختیار کرلے تو پھر اسے آسانی سے ختم نہیں کیا جاسکتا اور یہ وہ مقام ہے کہ حق کا چہرہ انسان کی نظر میں دگرگوں ہو جاتا ہے یہاں تک کہ محکم ترین عقلی دلائل اور واضح ترین حسی براہین اس کے دل پر اثر نہیں کرتے اور اس کا معاملہ معقولات اور محسوسات دونوں کے انکار تک جا پہنچتا ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ **"شیع کا مفہوم"**: "شیع" "شیعہ" کی جمع ہے "شیعہ" ایسی جمعیت اور گروہ کو کہا جاتا ہے جس کے افراد خطِ مشترک کے حامل ہوں مفردات میں راغب نے کہا ہے:

> "شیع" "شیاع" کے مادہ سے پھیلاؤ اور تقویت کے معنی میں ہے "شاع الخبر" اس وقت کہا جاتا ہے جب خبر متعدد اور قوی ہو جائے "شاع القوم" اس وقت کہا جاتا ہے جب جمعیت پھیل جائے اور زیادہ تعداد میں ہو اور "شیعہ" ان لوگوں کو کہتے ہیں کہ انسان جن کی وجہ سے قوی ہو۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں اس کی اصل "مشایعت" بمعنی متابعت سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیعہ پیروکار اور تابع کے معنی میں ہے اور شیعہ علیؑ انھیں کہا جاتا ہے جو حضرت علیؑ کے پیروکار ہوں اور ان کی امامت کا اعتقاد رکھتے ہوں۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ مشہور حدیث حضرت ام سلمہ سے مروی ہے۔

شیعۃ علی ھم الفائزون یوم القیٰمۃ

(قیامت کے دن نجات پانے والے علیؑ کے پیرو ہیں)

یہ حدیث بھی اسی معنی پر دلالت کرتی ہے۔

بہرحال اس لفظ کی اصل "شیاع" بمعنی پھیلاؤ اور تقویت سمجھیں یا مشایعت بمعنی متابعت جانیں ــــــــ شیعہ اور تشیع کے مفہوم میں ایک طرح کی فکری و مکتبی ہم بستگی موجود ہونے کی دلیل ہے۔

ضمنی طور پر گذشتہ اقوام کے لیے "شیع" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انبیاء کے خلاف پراگندہ صورت میں عمل نہیں کرتے تھے بلکہ وہ خط مشترک اور ایک ہی پروگرام کے حامل تھے کہ جو ہم آہنگ اقدامات سے تقویت پاتا ہے۔

اگر گمراہ لوگ اس طرح باہم مل کر اقدامات کرتے ہوں تو کیا راہ حق کے سچے پیروکاروں کو اپنے راستے میں ہم آہنگی اور مشترکہ منصوبہ بندی اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

۲۔ **"نسلکہ" کی ضمیر کا مرجع**: یہ لفظ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ مجرموں اور مخالفوں کو اپنی آیات اس طرح سے سمجھاتا ہے کہ گویا وہ ان کے دلوں میں داخل ہو گئی ہوں۔

Marfat.com

لیکن افسوس کی بات ہے کہ عدم قابلیت اور عدم آمادگی کے سبب وہ باہر نکل آتی ہیں جیسے مقوی اور مفید غذا خراب اور غیر صحیح معدہ میں جذب نہیں ہوتی ۔ بالکل یہی حقیقت " نسلکہ " کہ جس کا مادۂ اصلی " سلوک " سے ہے سمجھی جا سکتی ہے ۔

لہٰذا " نسلکہ " کی ضمیر " ذکر " (قرآن) کی طرف لوٹتی ہے کہ جو گذشتہ آیات میں آیا ہے اسی طرح بعد والے جملے " لا یؤمنون بہ " میں " بہ " کی ضمیر اسی معنی کی طرف لوٹتی ہے یعنی ان تمام چیزوں کے باوجود وہ لوگ ان آیات پر ایمان نہیں لائیں گے اس بناء پر دو ضمیروں کے درمیان پوری طرح ہم آہنگی موجود ہے ۔

اسی معنی میں اس تعبیر کی نظیر سورۂ شعراء کی آیہ ۲۰۰ اور ۲۰۱ میں نظر آتی ہے ۔

بعض نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ " نسلکہ " کی ضمیر استہزاء کی طرف لوٹتی ہے کہ جو گذشتہ آیت سے مستفاد ہوتا ہے لہٰذا جملے کا معنی یہ ہوگا : ہم نے اس استہزاء کرنے کو (ان کے گناہوں اور ہٹ دھرموں کی وجہ سے) ان کے دل میں داخل کر دیا ہے ۔

لیکن یہ تفسیر کوئی اور اشکال نہ بھی رکھتی ہو تاہم دو ضمیروں کے درمیان سے ہم آہنگی ختم کر دیتی ہے اور اس کی کمزوری کے لیے یہی کافی ہے (غور کیجیے گا) ۔

ضمنی طور پر مندرجہ بالا جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ مبلّغین کا فریضہ صرف یہ نہیں کہ مسائل لوگوں کے کانوں کو سنا دیں بلکہ انھیں تمام وسائل سے استفادہ کرنا چاہیے تاکہ حق بات ان کے دل میں اتار دیں اس طرح سے کہ وہ دلنشیں ہو جائے یوں حق طلب لوگوں کو ارشاد و ہدایت ہو جائے گی اور ہٹ دھرم افراد پر اتمام حجت ہو جائے گی ۔

یعنی ـــــــ تمام سمعی بصری اور عملی ذرائع سے استفادہ کرنا چاہیے ۔ واقعات اور داستانوں سے کام لینا چاہیے ۔ شعر و ادب اور ہنر و فن سے حقیقی اور اصلاحی معنی میں استفادہ کرنا چاہیے تاکہ کلمات حق لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جائیں ۔

۳۔ گذشتہ لوگوں کی روش : انبیاء پر طرف دار باطل کی نکتہ چینی اور مردانِ خدا سے لوگوں کو دور کرنے کی سازشیں کوئی نئی چیز نہیں اور کسی خاص زمانے یا علاقے میں منحصر نہیں بلکہ جیسا کہ مذکورہ بالا تعبیر سے معلوم ہوتا ہے قدیم زمانے سے گمراہ قوموں میں ایسی سازشیں موجود ہیں ۔

لہٰذا ان سے ہرگز دہشت زدہ نہیں ہونا چاہیے اور اپنے اندر مایوسی اور ناامیدی کو جگہ نہیں دینا چاہیے ۔ یا دشمنوں کی طرف سے پیدا کردہ کثیر مشکلات سے نہیں ڈرنا چاہیے ۔

یہ بات تمام راہیانِ حق کے لیے ایک مؤثر دلجوئی اور تسلّی ہے ۔

اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کسی دور اور کسی علاقے میں ہم دعوتِ حق نشر کریں اور پرچم عدل لہرائیں لیکن ہٹ دھرم اور سخت مخالفت کرنے والے دشمن کی طرف سے ہمیں ردعمل کا سامنا کرنا پڑے تو ہم بہت ہی زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں ۔ انبیاءِ الٰہی اور ان کے سچے پیروکار ان مخالفتوں کی وجہ سے کبھی مایوس نہیں ہوئے ۔ بلکہ ان کے لیے ضروری ہوتا تھا کہ ہر روز اپنی دعوت کی گہرائی اور گیرائی میں اضافہ کریں ۔

۴۔ " فظلوا فیہ یعرجون " کا مفہوم : ۔ یہ جملہ اور مندرجہ بالا آیات میں آنے والے بعد کے جملے اچھی طرح نشاندہی کرتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ آسمان سے کوئی دروازہ ان کے لیے کھول دیا جائے (ظاہراً آسمان یہاں اس تہ بہ تہ فضا کی

Marfat.com

طرف اشارہ ہے جو زمین کے اطراف میں ہے کہ جس سے آسانی سے نکلنا ممکن نہیں ہے) اور مسلسل روز روشن میں اس میں آ ئیں جائیں پھر بھی وہ شدید ہٹ دھرمی سے کہیں گے کہ ہماری چشم بندی کردی گئی ہے اور ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔

توجہ رہے کہ" ظلوا" دن میں کسی کام کو جاری رکھنے کی دلیل ہے عرب یہ لفظ رات کے موقع کے لیے استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کی جگہ " باتوا" کہتے ہیں جو مادہ " بیتوتہ " (رات گزارنا) سے ہے۔

زیادہ تر مفسرین نے یہی تفسیر انتخاب کی ہے لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ "ظلوا" میں ضمیر فرشتوں کی طرف لوٹتی ہے یعنی اگر وہ فرشتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ وہ آسمان کی طرف جارہے ہیں اور پلٹ رہے ہیں تو پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔

علاوہ اس کے کہ یہ تفسیر قبل اور بعد کی آیات سے کہ جو عموماً مشرکین کے بارے میں ہیں سے مناسبت نہیں رکھتی (کیونکہ ملائکہ کا ذکر صرف پہلی چھ آیات میں آیا ہے اور ان کی طرف ضمیر کا لوٹنا بہت بعید ہے) بلاغت کلام میں بھی نقص کا باعث ہے کیونکہ قرآن یہ کہنا چاہتا ہے کہ ——— یہاں تک کہ اگر یہ لوگ خود بصورت اعجاز روز روشن میں آسمان کی طرف جائیں اور پلٹ آئیں تو بھی حق کے سامنے سرتسلیم خم نہیں کریں گے (غور کیجیے گا)۔

۵۔ "سکرت ابصارنا" کا مطلب: "سکرت" "سکر" کے مادہ سے چھپانے کے معنی میں ہے یعنی ہٹ دھرم کافر کہتے ہیں کہ ہماری حقیقت میں آنکھ پر گویا پردہ ڈال دیا گیا ہے اور اگر ہم اپنے تئیں آسمان کی طرف محو پرواز دیکھیں تو یہ ایک خیالی بات ہے یہ بالکل وہی چیز ہے جسے فارسی زبان میں "چشم بندی" اور "نظر بندی"[۱] سے تعبیر کرتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ دوسرے کے ہاتھ کی صفائی کی وجہ سے انسان حقیقت کو صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتا بلکہ اس کے خلاف محسوس کرتا ہے۔

یہ جو اس کے بعد جملہ " بل نحن قوم مسحورون " (بلکہ ہم تو جادو زدہ ہیں) آیا ہے ——— اگرچہ فریب نظر بھی ایک قسم کا جادو ہے لیکن شاید یہ اس طرف اشارہ ہو کہ معاملہ چشم بندی سے بھی بالا ہو گیا ہے اور ہمیں سرتاپا جادو کر دیا گیا ہے نہ صرف ہماری آنکھ جادو کے زیر اثر ہے بلکہ ہمارا سارا وجود جادو کے سبب اپنا حقیقی احساس گنوا بیٹھا ہے اور جو کچھ محسوس کرتا ہے، خلاف حقیقت ہے۔

دوسرے لفظوں میں ——— جب ہم کسی انسان کو کسی ذریعے سے اوپر لے جائیں اور نیچے لے آئیں تو وہ اس حالت کو نہ صرف اپنی آنکھ سے بلکہ پورے وجود کے ساتھ محسوس کرتا ہے لہٰذا اگر کسی کی پوری طرح چشم بندی کر دی جائے تو وہ پھر بھی اپنے اوپر نیچے آنے جانے کو محسوس کرے گا۔ یعنی فرض کریں کہ ان مشرکین کو ہم آسمان کی طرف لے جائیں تو پہلے کہیں گے کہ ہماری نظر کو فریب دیا گیا ہے اور بعد میں متوجہ ہوں گے کہ یہ حالت تو بدون چشم قابل احساس ہے تو کہیں گے کہ اصولی طور پر تو سر سے لے کر پاؤں تک ہمارا پورا وجود سحر زدہ ہے اور اس پر جادو کیا گیا ہے۔

---

[۱] اردو میں اسے " فریب نظر " کہتے ہیں (مترجم)

Marfat.com

۱۶۔ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ۝

۱۷۔ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۝

۱۸۔ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ۝

ترجمہ

۱۶۔ ہم نے آسمان میں بُرج قرار دیئے ہیں اور انھیں ناظرین کے لیے زینت عطا کی ہے۔

۱۷۔ اور اس کی ہر شیطان مردود سے حفاظت کی ہے۔

۱۸۔ مگر استراقِ سمع کرنے والے کہ شہابِ مبین جن کا تعاقب کرتے ہیں (اور انھیں ہانکتے ہیں)۔

تفسیر

شیطان شہاب کے ذریعے ہانکے جاتے ہیں:

ان آیات میں توحید اور شناخت خدا کی دلیل کے طور پر نظام آفرینش کے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان آیات کے ذریعے قرآن و نبوت کے بارے میں گزشتہ آیات کی بحث مکمل کی گئی ہے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ہم نے آسمان میں بُرج قرار دیئے ہیں (ولقد جعلنا فی السماء بروجًا)۔

"بروج" "برج" کی جمع ہے اس کا اصلی معنی "ظہور" ہے اسی بنا پر اطرافِ شہر کی دیوار یا اجتماعِ لشکر کے اس مخصوص حصے کو بُرج کہا جاتا ہے جو خاص ظہور رکھتا ہو۔ نیز اسی بناء پر جب عورت اپنی زینت ظاہر و آشکار کرے تو "تبرجت المرئۃ" کہتے ہیں۔

بہرحال آسمانی بُرج سورج اور چاند کی منازل کی طرف اشارہ ہیں زیادہ دقیق تعبیر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب ہم کرۂ زمین سے چاند اور سورج کی طرف نگاہ کریں تو سال کے مختلف مواقع پر انھیں ہم ایک خاص صورتِ فلکی میں دیکھتے ہیں (ستاروں کے مختلف مجموعے ہیں ان میں سے ہر ایک نے ایک خاص شکل اختیار کی ہوتی ہے، اسے صورتِ فلکی کہتے ہیں) اور کہا جاتا ہے کہ سورج بُرجِ حمل، ثور، میزان، عقرب یا قوس میں ہے[۱]

[۱] "حمل" بھیڑ کے بچے کو کہتے ہیں "ثور" بیل کے معنی میں ہے۔ "میزان" ترازو کو کہا جاتا ہے۔ "عقرب" بچھو کو کہتے ہیں اور "قوس" کمان کے معنی میں ہے ستاروں کے مختلف مجموعے ہیں جو تقریبًا ان شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔

Marfat.com

ان آسمانی برجوں کا وجود، آفتاب و ماہتاب کی منزلیں اور وہ خاص نظام جو ان کی حرکت کے لیے ان برجوں میں موجود ہے کہ جس سے ہماری دنیائے ہستی کی تقویم بنتی ہے ———— آفریدگار اور خالق کے علم و قدرت پر یہ ایک واضح دلیل ہے یہ عجیب و غریب نظام جو دقیق بھی ہے اور باریک حساب کا حامل ہے مسلسل اور رواں دواں ہے، ظاہر کرتا ہے کہ جہان کی خلقت ایک منصوبے اور ہدف کے تحت ہے اور اس میں ہم جتنا زیادہ غور و فکر کریں ہم اس جہان کے خالق کے اتنا ہی قریب ہوجاتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے آسمان کو اور ان فلکی صورتوں کو ناظرین کی زینت عطا کی ہے (وزیناھا للناظرین)۔[1]

ایک تاریک ستاروں بھری رات میں آسمان کی طرف نظر اٹھائیں تو ہم دیکھیں گے کہ مختلف گوشوں میں ستاروں کے مختلف گروہ موجود ہیں گویا ہر گروہ کی اپنی ایک انجمن ہے۔ اور وہ آپس میں آہستہ آہستہ راز و نیاز کی باتیں کر رہے ہیں۔ بعض خیرہ خیرہ ہماری طرف دیکھتے ہیں مگر آنکھ سے اشارہ بھی نہیں کرتے اور بعض ہیں کہ مسلسل اشارہ کر رہے ہیں گویا ہمیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ بعض چمکتے ہوئے یوں لگتے ہیں کہ جیسے ہمارے قریب ہوتے جا رہے ہیں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنے کم رنگ نور کے ساتھ گویا آسمانوں کی ان پہنائیوں سے بغیر آواز کے صدا دے رہے ہیں کہ ہم بھی یہاں ہیں ———— یہ خوبصورت شاعرانہ منظر جو شاید بعض کے لیے تکرار مشاہدہ کے باعث معمول کا جلوہ ہو لیکن اس پر جتنا بھی غور و فکر کریں ———— یہ قابلِ دید، جاذبِ نظر اور شوق انگیز ہے اور جب چاند اپنی مختلف شکلوں میں ان گروہ در گروہ ستاروں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو یہ منظر اور بھی تازہ اور اعجاب انگیز ہوجاتا ہے۔

غروبِ آفتاب کے بعد ستارے یکے بعد دیگرے نمودار ہوتے ہیں گویا کسی پردے کی اوٹ سے باہر کی طرف دوڑ رہے ہوں۔ یہی تارے دمِ صبح خیرہ کن آفتاب کی قوت کے سامنے ٹھہر نہیں پاتے، بھاگ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔

اس سے قطع نظر علمی زیبائیوں اور فراواں اسرار کی نگاہ سے آسمان کا چہرہ اس قدر خوبصورت ہے کہ ہزاروں سال سے تمام علماء اور دانش مندوں کی آنکھ اسی کی طرف لگی ہوئی ہے۔ خصوصاً آج کی دنیا میں نہایت طاقتور ٹیلی سکوپس اور ستارے دیکھنے والی عظیم دوربینوں کے ذریعے اس کی طرف دیکھا جاتا ہے اور ہر وقت اس ظاہراً خاموش مگر پُر غوغا عالم کے تازہ اسرار اہلِ دنیا کے لیے منکشف ہو رہے ہیں، سچ ہے کہ:

چرخ با ایں اختران نغز و خوش و زیباستی

آسمان ان عمدہ، اچھے اور زیبا ستاروں کے ساتھ ہے

بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے اس آسمان کو ہر مردود، شوم اور ملعون شیطان سے محفوظ رکھا ہے۔ (وحفظناھا من کل شیطٰن رجیم)۔

مگر وہ شیطان جو "استراقِ سمع" (خبریں چرانا) کی ہوس کرتے ہیں ان کا تعاقب شہابِ مبین کرتے ہیں اور انھیں پیچھے کی

---

[1] "زیناھا" کی ضمیر "سماء" کی طرف لوٹتی ہے کیونکہ "سماء" مؤنث مجازی ہے۔

Marfat.com

طرف ہانکتے ہیں (الا من استرق السمع فاتبعہ شہاب مبین)۔

شیطان شہاب کے ذریعے کیسے ہانکے جاتے ہیں؟

زیرِ نظر آخری آیت ان آیات میں سے ہے جس کے متعلق مفسرین نے بہت کچھ کہا ہے اور ہر ایک نے ایک خاص راستہ طے کیا ہے اور اس سے ایک معیّن نتیجہ نکالا ہے۔

چونکہ بعینہٖ یہی مضمون سورۂ صافات (آیہ ۶، ۷) اور سورۂ جن (آیہ ۹) میں آیا ہے اور یہ ایسے مسائل میں سے ہے کہ جس کے بارے میں ممکن ہے بے خبر افراد کچھ ایسے سوالات اٹھائیں جو جواب کے بغیر رہ جائیں لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے بزرگ عظیم اسلامی مفسرین کی آراء پر ایک نگاہ ڈال لیں اور پھر جس رائے کو ہم ترجیح دیں اسے بیان کیا جائے۔

۱۔ بعض مفسرین مثلاً تفسیر فی ظلال کا مؤلف ——— ان آیات اور اس قسم کی دیگر آیات سے بڑے آرام سے یہ کہہ کر گزر گئے ہیں کہ یہ ایسے حقائق ہیں جن کا ادراک ہمارے لیے ممکن نہیں ہے اور ضروری ہے کہ جو کچھ ہمارے حقیقی اعمال میں سے ہماری زندگی میں مؤثر ہے اسے اہمیت دیں۔ لہٰذا انھوں نے ان آیات کی اجمالی سی تفسیر پر قناعت کرتے ہوئے اس مسئلے کی توضیح سے صرفِ نظر کیا ہے۔

تفسیر فی ظلال کا مؤلف لکھتا ہے:

> شیطان کیا ہے؟ وہ کس طرح استراق سمع کرنا چاہتا ہے اور وہ کیا چرانا چاہتا ہے؟ یہ سب چیزیں خدائی غیوب میں سے ہیں کہ نصوص کے ذریعے جن کی دست یابی نہیں ہو سکتی اور ان کے بارے میں تحقیق وجستجو کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس سے ہمارے عقیدے میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کا اس کے سوا کوئی فائدہ نہیں کہ فکر انسانی ایسی چیزیں میں مشغول ہو جاتی ہے جو اس کے ساتھ کوئی خاص ربط نہیں رکھتی اور اس سے انسان اپنی زندگی میں حقیقی عمل انجام دینے سے رُک جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ان کے بارے میں تحقیق سے کسی جدید حقیقت کے بارے میں ہمیں کوئی نیا ادراک نہیں ملتا۔[۱]

لیکن اس میں شک نہیں کہ قرآن ایک ایسی عظیم انسان ساز، تربیت کنندہ اور حیات بخش کتاب ہے کہ اگر کوئی چیز حیاتِ انسانی کے ساتھ ربط نہ رکھتی ہو تو وہ اس میں ہرگز نہ ہوگی۔

یہ کتاب ساری کی ساری درس ہے ——— درسِ زندگی ہے علاوہ ازیں کوئی شخص اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ قرآن میں ایسے حقائق ہوں کہ جنھیں معلوم نہ کیا جا سکتا ہو، کیا قرآن نور اور کتاب مبین نہیں ہے اور کیا یہ لوگوں کے فہم و تدبر اور ہدایت کے لیے نازل نہیں ہوا۔ تو کیسے ان آیات کو سمجھنا ہم سے ربط نہیں رکھتا؟

۱۔ تفسیر فی ظلال ج ۵ ص ۳۹۶۔

Marfat.com

بہر حال ان آیات اور ان جیسی آیات کے بارے میں یہ طرز اعتراض ہمیں پسند نہیں ہے۔

۲۔ مفسرین کی ایک اہم جماعت خصوصاً متقدمین مفسرین کا اصرار ہے کہ آیت کے ظاہری معنیٰ کو پوری طرح محفوظ رکھا جائے۔ ان کے نزدیک "سماء" اسی آسمان کی طرف اشارہ ہے اور "شہاب" اسی "شہاب" کی طرف اشارہ ہے یعنی وہی سرگرداں سنگریزے جو اس فضائے بیکراں میں گردش کر رہے ہیں اور کبھی کبھار وہ زمین کی قوتِ ثقل کی زد میں آجاتے ہیں تو زمین کی طرف کھنچ آتے ہیں۔ ہوا کی لہروں سے تیزی سے ٹکرانے کی بنا پر وہ سرخ اور شعلہ ور ہو جاتے ہیں اور خاکستر بن جاتے ہیں۔

نیز "شیطان" وہی خبیث، رانده اور سرکش موجودات ہیں جو آسمانوں کی طرف جانا چاہتے ہیں اور ہمارے اس جہان کی کچھ خبریں کہ جو آسمانوں میں منعکس ہوتی ہیں انھیں استراق سمع سے (مخفی طور پر کان لگا کر) معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن شہاب تیروں کی طرح ان کی طرف آتے ہیں اور انھیں ایسا کرنے سے باز رکھتے ہیں۔[۱]

۳۔ مفسرین کی ایک اور جماعت نے ان آیات کی تعبیرات کو تشبیہ، کنایہ اور امثال کے طور پر لیا ہے۔ یعنی اصطلاحاً انھیں سمبالک (SYMBOLIC) سمجھا ہے ان مفسرین میں المیزان کے عالی قدر مفسر اور صاحب تفسیر الجواہر طنطاوی شامل ہیں۔ ان مفسرین نے اس تشبیہ وکنایہ کو مختلف صورتوں میں بیان کیا ہے۔

الف۔ تفسیر المیزان میں ہے:

مفسرین نے شیاطین کے استراق سمع اور شہاب کے ذریعے ان کے ہانکے جانے کے بارے میں جو مختلف توجیہات کی ہیں ایسی چیز پر مبنی ہیں جو کبھی کبھی ظاہر آیات و روایات سے ذہن میں آتی ہیں وہ یہ کہ افلاک زمین پر محیط ہیں ان میں فرشتوں کے مختلف گروہ موجود ہیں ہر گروہ کے لیے ان افلاک میں کئی دروازے ہیں کہ جن میں سے ان فرشتوں کے علاوہ کوئی نہیں جا سکتا۔ ان فرشتوں میں سے کچھ اپنے ہاتھ میں شہاب لیے ہوئے ہیں اور وہ استراق سمع کرنے والے شیاطین کی تاک میں ہیں کہ ان کے ذریعے ان کی سرکوبی کریں اور انھیں ہانکیں۔

حالانکہ آج کی دنیا میں واضح ہو چکا ہے کہ ایسے نظریات بے بنیاد ہیں ایسے کوئی افلاک ہیں نہ دروازے اور نہ ہی ایسی اور چیزیں۔

جو کچھ یہاں بطور احتمال کہا جا سکتا ہے یہ ہے کہ ایسے بیانات کلام الٰہی میں امثال کی طرح ہیں کہ جو غیر حسی حقائق واضح کرنے کے لیے حسی لباس میں ذکر ہوتے ہیں۔ جیسا کہ خدا فرماتا ہے:

وتلك الامثال نضربها للناس وما يعقلها الا العالمون

---

[۱] فخر رازی نے اپنی تفسیر کبیر اور آلوسی نے روح المعانی میں اس تفسیر کا ذکر کرنے کے بعد ہیئت قدیمہ کے حوالے سے پیدا ہونے والے مختلف اشکالات کے جواب بھی دیئے ہیں اور کہا ہے کہ آج کی ہیئت کی طرف توجہ کرتے ہوئے افلاک کا پیاز کے چھلکوں کی طرح ہونے کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

Marfat.com

(یہ امثال ہیں کہ جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور صاحبانِ علم کے علاوہ انھیں کوئی نہیں سمجھ سکتا۔
(عنکبوت ــــــ ۴۳)

ایسی مثالیں قرآن میں بہت زیادہ ہیں مثلاً عرش، کرسی، لوح اور کتاب۔

لہٰذا آسمان کہ جو فرشتوں کا مسکن ہے، سے مراد ایک عالم ملکوتی ہے جو عالم طبیعت سے ماوراء ہے کہ جو اس جہانِ محسوس سے برتر و بالاتر ہے اور اس آسمان کی باتیں چوری چھپے سننے کے لیے شیطانوں کے قریب ہونے اور ان کی طرف شہاب پھینکے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ عالم ملائکہ سے قریب ہوں تاکہ اسرارِ خلقت اور حوادثِ آیندہ کے بارے میں آگاہی حاصل کریں لیکن وہ ملائکہ معنوی و ملکوتی انوار سے ان شیطانوں کو ہانکتے ہیں۔ کیونکہ ان انوار کو برداشت کرنے کی وہ تاب نہیں رکھتے ہیں[1]

ب۔ طنطاوی اپنی مشہور تفسیر میں بھی کہتا ہے:۔

ایسے علماء جو حیلہ گر اور ریا کار ہیں اور عام لوگ جو ان کی پیروی کرتے ہیں یہ اہلیت نہیں رکھتے کہ آسمانوں کے عجائبات، عالمِ بالا کی شگفتگیاں، اس کے بے کراں کرات اور ان پر حکم فرما نظم و حساب سے آگاہ ہوں ـــــــ خدا نے انھیں اس علم و دانش سے محروم رکھا ہے اور ستاروں بھرے خوبصورت اور مزیّن آسمان کے تمام اسرار ان افراد کے اختیار میں دیئے ہیں جو عقل و ہوش اور اخلاص و ایمان رکھتے ہیں۔

فطری اور طبیعی ہے کہ پہلا گروہ اس آسمان کے اسرار میں نفوذ سے روک دیا جاتا ہے اور درگاہِ الٰہی سے دھتکارا ہوا شیطان چاہے نوعِ بشر سے ہو یا غیر بشر سے، ان حقائق تک رسائی کا حق نہیں رکھتا اور جس وقت وہ ان کے نزدیک ہوتا ہے تو دھتکار دیا جاتا ہے۔

ایسے افراد ممکن ہے بہت سال جئیں اور پھر مر جائیں مگر ان اسرار تک ہرگز نہیں پہنچ پاتے۔ ان کی آنکھیں کھلی تو ہوتی ہیں لیکن حقائق دیکھنے کی تاب نہیں رکھتیں ــــــــــ

کیا ایسا نہیں ہے کہ اس کا علم اس کے عاشقوں کے سوا کسی کو نہیں ملتا اور اس کے جمال کا نظارہ اس کے عارفوں کے سوا کوئی نہیں کر سکتا[2]

طنطاوی ایک اور جگہ کہتا ہے:

اس میں کیا مانع ہے کہ یہ تعبیرات کنایہ ہوں۔ منع حسی منع عقلی کی طرف اشارہ ہو جبکہ کنایہ

---

[1] المیزان ج ۱۷ ص ۱۳۰ سورۂ صافات کی آیات کے ذیل میں۔

[2] تفسیر طنطاوی ج ۸ ص ۱۱۔

Marfat.com

بلاغت کی بہترین انواع میں سے ہے ۔

کیا ہم دیکھتے نہیں کہ بہت سے لوگ جو ہمارے آس پاس زندگی گذارتے ہیں وہ اس زمین کے حدود اربعہ میں محبوس اور قید ہیں ان کی آنکھ کبھی جہانِ بالا کی طرف نہیں اٹھتی اور وہ صدائے بالا پر کان نہیں دھرتے اور اس جہان کے امور اور عجائبات کی انھیں کوئی خبر نہیں وہ خود خواہی، شہوت، کینہ وری، طمع، حرص اور خانماں ساز شہاب کے ذریعے ان اعلیٰ معانی کے ادراک سے ہانکے گئے ہیں (اور اگر کسی روز وہ ایسی خواہش کریں تو اپنے قلب و روح کی ان آلودگیوں کے باعث وہ ہانکے جائیں گے)[1]

ج :۔ ایک اور مقام پر اس نے جو گفتگو کی ہے اس کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے :

جس وقت انسانوں کی ارواح اس دنیا سے جہانِ برزخ کی طرف منتقل ہوتی ہیں ان کا زندوں کی روحوں کے ساتھ تعلق اور ارتباط ہوتا ہے اور جہاں ان کے درمیان مناسبت اور میلان ہو اور وہ احضارِ ارواح وغیرہ کے ذریعے ان سے ارتباط اور تفاہم برقرار رکھ سکیں تو کچھ مسائل ان کے اختیار میں دے دیئے جاتے ہیں جو بعض اوقات حق اور بعض اوقات باطل ہوتے ہیں کیونکہ وہ عوالم اعلیٰ تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے بلکہ ان کی رسائی صرف نچلے عوالم تک ہو سکتی ہے ۔ مثلاً جیسے مچھلی اپنے محیط سے باہر نکل کر ہوا میں پرواز نہیں کر سکتی، وہ بھی طاقت نہیں رکھتے کہ اپنے جہان کے حدود اربعہ سے نکل کر بالاتر چلے جائیں ۔

د :۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ جدید سائنسی انکشافات نشاندہی کرتے ہیں کہ بہت دور کی فضا سے طاقتور ریڈیائی لہروں کا ایک سلسلہ مسلسل جاری ہے انھیں کرۂ زمین میں ریڈیائی پیغامات وصول کرنے والے مخصوص مرکز کے ذریعے اخذ کیا جا سکتا ہے ۔ کسی شخص کو معلوم نہیں کہ ان انتہائی طاقتور لہروں کا سرچشمہ کہاں ہے ۔ بعض سائنس دان کہتے ہیں کہ قوی احتمال ہے کہ دُور کے آسمانی کُرّوں میں بہت سی زندہ موجودات موجود ہیں کہ جو تمدن کے لحاظ سے ہم سے بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں ۔ لہٰذا وہ چاہتی ہیں کہ اپنی خبریں ہماری اس دنیا تک پہنچائیں ان خبروں میں ایسے مسائل بھی ہیں جو ہمارے لیے نئے ہیں وہ موجودات کہ جنھیں دیو اور پری کہتے ہیں کوشش کرتے ہیں کہ ان لہروں سے فائدہ اٹھائیں لیکن طاقتور شعائیں انھیں دور پھینک دیتی ہیں[2]

یہ تھے علماء اور مفسرین کے مختلف نظریات ۔

نتیجہ بحث :

ان آیات کی تفسیر کے سلسلے میں مباحث بہت طویل ہو گئے ہیں اب مکمل نتیجہ حاصل کرنے کے لیے ہمیں چند نکات کی طرف توجہ کرنا چاہیے ۔

۱۔ لفظ "سماء" (آسمان) بہت سی آیات قرآن میں اسی مادی آسمان کے معنی میں ہے مثلاً سورۂ اعراف کی آیہ ۴۰ میں ہے ۔

---

[1] تفسیر طنطاوی ج ۱۸ ص ۱۰۔

[2] ترجمہ قرآن برفراز اعصار ۔ مؤلفہ ع ۔ نوفل صفحہ ۲۵۸۔

Marfat.com

ان الذین کذبوا بأیاتنا واستکبروا عنھا لا تفتح لھم ابواب السماء

وہ لوگ کہ جنھوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے اور ان کے سامنے تکبر اختیار کیا ہے آسمان کے دروازے ان کے رُخ پر نہیں کھلیں گے۔

ہوسکتا ہے یہاں آسمان مقام قربِ خدا کے لیے کنایہ ہو جیسا کہ سورۂ فاطر کی آیہ ۱۰ میں ہے۔

الیہ یصعد الکلم الطیب والعمل الصالح یرفعہ

پاکیزہ باتیں اس کی طرف اوپر جاتی ہیں اور وہ عمل صالح کو بلند کرتا ہے۔

واضح ہے کہ اعمال صالح اور پاکیزہ باتیں کوئی ایسی چیز نہیں کہ جو اس آسمان کی طرف اوپر جائیں بلکہ ان کی پیش رفت مقام قربِ خدا کی طرف ہوتی ہے اور وہ روحانی عظمت و رفعت حاصل کرتے ہیں۔

اصولی طور پر آیاتِ قرآن کے بارے میں "انزل" اور "نزل" کی تعبیر واضح طور پر بتاتی ہے کہ مقام قدس پروردگار سے قلبِ پیغمبرؐ پر نزول مراد ہے۔

سورہ ابراہیم کی آیہ ۲۴ میں ہے:

الم ترکیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے اچھی بات کی کیا اچھی مثال پیش کی ہے کہ گویا ایک پاکیزہ درخت ہے اس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی ٹہنیاں آسمان میں ہیں۔

اس کی تفسیر میں ہم نے پڑھا ہے کہ یہ پاکیزہ درخت جسے خدا نے مثال کے طور پر بیان کیا ہے اس کی جڑ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور علیؑ اس کی جڑ اور شاخ (وہی شاخ کہ جو آسمان تک پہنچی ہوئی ہے) اور دیگر ائمہ اس کی کچھ چھوٹی شاخیں ہیں[1]

ایک حدیث میں ہے:

کذلک الکافرون لاتصعد اعمالھم الی السماء

اسی طرح ہیں کفار کہ جن کے اعمال آسمان کی طرف اوپر نہیں جاتے۔

واضح ہے کہ ایسی احادیث میں آسمان اس حسی آسمان کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ یہاں سے ہم نتیجہ نکالتے ہیں کہ آسمان مادی مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے اور معنوی مفہوم میں بھی۔

۲۔ نجوم (ستارے) بھی ایک مادی مفہوم رکھتے ہیں کہ جو یہی ستارے ہیں جو آسمان میں نظر آتے ہیں اور ایک اس لفظ کا معنوی مفہوم ہے کہ جو علماء اور بڑی شخصیت کی طرف اشارہ ہے کہ جو انسانی معاشروں کو روشنی بخشتے ہیں اور جیسے لوگ ستاروں کے ذریعے تاریک راتوں میں بیابانوں اور سمندروں میں اپنا راستہ ڈھونڈتے ہیں، انسانی معاشروں میں عام لوگ بھی زندگی اور سعادت کی راہ ان علماءِ آگاہ اور صاحبِ ایمان رہبروں کی مدد سے پاتے ہیں۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۱۰۔

Marfat.com

مشہور حدیث جو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہے :

مثل اصحابی فیکم کمثل النجوم بایھا اخذ اھتدی

میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کسی کی اقتداء ہو جائے باعثِ ہدایت ہے [1]

یہ بھی اسی معنی کی طرف اشارہ ہے ۔

سورۂ انعام کی آیہ ۹۷ اس طرح ہے :

وھو الذی جعل لکم النجوم لتھتدوا بھا فی ظلمات البر والبحر

اور وہ ذات کہ جس نے تمھارے لیے ستارے بنائے تاکہ خشکی اور دریا کی تاریکیوں میں ان کے ذریعے تمھاری ہدایت ہو۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں اس آیت کے ذیل میں منقول ہے کہ امامؑ نے فرمایا :

النجوم آل محمد

ستاروں سے مراد خاندانِ پیغمبر ہے [2]

۲۔ زیر بحث آیات کی تفسیر میں وارد ہونے والی متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں کی طرف شیاطین کے صعود کی ممانعت اور ستاروں کے ذریعے ان کا ہانکا جانا پیغمبر اکرم کی ولادت کے وقت سے ہوا اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کی پیدائش کے وقت سے شیاطین ایک حد تک ممنوع ہوئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے بعد مکمل طور پر ممنوع ہو گئے [3]

ان تمام باتوں سے جو ہم نے بیان کی ہیں یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ "سماء" کا یہاں معنوی مفہوم ہے اور یہ حق، ایمان اور روحانیت کے آسمان کی طرف اشارہ ہے اور ہر وقت شیطانوں کی کوشش ہے کہ وہ اس چار دیواری میں داخل ہونے کے لیے راہ پالیں اور سچے مومنین اور حامیانِ حق کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسوں کے ذریعے نفوذ پیدا کرلیں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن مردانِ الٰہی اور راہبرانِ راہِ حق ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انبیاء و آئمہ سے لے کر مجتہد علماء تک اپنے علم و تقوٰی کی طاقتور موجوں کے ساتھ ان پر حملہ کرتے ہیں اور انھیں اس آسمان کے قریب ہونے سے ہانکتے ہیں ۔

اسی مقام پر حضرت مسیحؑ کے تولد اور اس سے بالاتر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تولد اور شیطان کو دھتکارنے کے درمیان

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۹ ۔ یہ روایت سنی روایات سے ملتی جلتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس کا اطلاق اور عموم قابل عمل نہیں ہے کیونکہ صحابہ میں ہر قسم کے لوگ حتیٰ کہ منافقین بھی داخل ہیں اگر یہ روایت صحیح ہے تو اس سے یا تو سلمان و ابوذر جیسے خاص اصحاب مراد ہیں یا اصحاب کساء اور اہل بیت مراد ہیں ۔ ہمارے اس نظریئے کی تائید سورۂ انعام کی آیہ ۹۷ کے ذیل میں آنے والی مذکورہ بالا روایت بھی کرتی ہے ۔

[2] نور الثقلین جلد ۱ ص ۷۵۰ ۔

[3] نور الثقلین جلد ۳، ص ۵ ، تفسیر قرطبی ج ۵، ص ۳۶۲۶ ۔

Marfat.com

ربط معلوم کیا جا سکتا ہے۔

نیز یہیں پر آسمان کی طرف صعود اور اسرار سے آگاہی کے درمیان ارتباط معلوم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس مادی آسمان میں کوئی خاص خبریں نہیں ہیں سوائے خلقت کی عجیب و غریب چیزوں کے کہ جو روئے زمین سے بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ نیز آج کی دنیا میں یہ مسئلہ یقینی ہو چکا ہے کہ اس بیکراں فضا میں پھیلے ہوئے ان آسمانی کرات میں سے بعض مُردہ ہیں اور بعض زندہ ہیں اور ان کے ساکنان بھی ہیں لیکن شاید ان کی زندگی ہم سے بہت زیادہ مختلف ہو۔

یہ موضوع بھی بہت قابلِ ملاحظہ ہے کہ شہاب صرف زمین کی فضا سے پیدا ہوتے ہیں۔ اطراف زمین کی ہوا سے پتھر کے ٹکڑے اٹھتے ہیں اور شعلہ ور ہوتے ہیں انھی سے شہاب پیدا ہوتے ہیں ورنہ زمین کی فضا سے باہر کوئی شہاب نہیں ہوتا البتہ زمینی فضا سے باہر کچھ پتھر سرگرداں ہیں لیکن انھیں شہاب نہیں کہا جاتا لیکن جب وہ زمینی فضا میں داخل ہوتے ہیں تو گرم ہو کر شعلہ ور ہو جاتے ہیں اور انسان کی نظروں کے سامنے آگ کی ایک لکیر کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے یہ حرکت کرتے ہوئے ستارے ہیں۔

نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آج کے انسان نے کئی مرتبہ زمین کی فضا سے باہر کی طرف عبور کیا ہے اور اس سے بہت بلند یہاں تک کہ چاند تک پہنچا ہے (توجہ رہے کہ زمین کی فضا ایک سو سے لے کر دو سو کلومیٹر سے زیادہ نہیں ہے جبکہ چاند ہم سے تیس لاکھ کلومیٹر سے بھی زیادہ فاصلے پر ہے)۔

لہٰذا اگر مراد یہی مادی شہاب اور مادی آسمان ہو تو یہ مان لینا چاہیے کہ یہ علاقہ انسانی سائنسدانوں پر ظاہر ہو چکا ہے اور اس میں کوئی اسرار کی بات نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ بہت سے قرآن و شواہد جو ہم نے ذکر کیے ہیں اسے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے مراد حق و حقیقت کا آسمان ہے، اور شیاطین وہی وسوسہ پیدا کرنے والے ہیں کہ جو کوشش کرتے ہیں کہ اس آسمان تک رسائی حاصل کر سکیں اور مخفی طور پر کان لگا کر باتیں سنیں اور لوگوں کو گمراہ کریں۔ ستارے اور شہاب یعنی رہبرانِ الٰہی اور علماء اپنے قلم کی طاقتور لہروں اور موجوں سے انھیں پیچھے کی طرف ہانکتے ہیں اور دھتکار دیتے ہیں۔

لیکن ———— قرآن بحرِ بیکراں ہے اور ہو سکتا ہے کہ آنے والے علماء ان آیات کے سلسلے میں نئے حقائق تک دسترس حاصل کر لیں کہ آج ہم جن تک ہم رسائی حاصل نہیں کر سکے۔

Marfat.com

۱۹۔ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ○

۲۰۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ○

۲۱۔ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ○

ترجمہ

۱۹۔ اور ہم نے زمین کو پھیلایا اور اس میں ثابت پہاڑ ڈالے اور تمام موزوں نباتات میں سے اس میں اگایا۔

۲۰۔ اور ہم نے تمھارے لیے طرح طرح کے وسائلِ زندگی فراہم کیے اور اسی طرح ان کے لیے بھی جنھیں تم روزی نہیں دے سکتے۔

۲۱۔ تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں لیکن ہم معیّن انداز سے سوا اسے نازل نہیں کرتے۔

تفسیر

ہر چیز کا خزانہ ہمارے پاس ہے:

یہاں آیاتِ آفرینش کا ایک حصہ اور زمین میں عظمتِ خدا کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں تاکہ گذشتہ بحث تکمیل کو پہنچے۔

پہلے بات زمین سے شروع کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے زمین کو پھیلایا (والارض مددنھا)۔

"مد" دراصل وسعت دینے اور پھیلانے کے معنی میں ہے اور احتمال قوی یہ ہے کہ یہاں زمین کی خشکیوں کے پانی سے باہر نکلنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ابتداء میں کرۂ زمین کی ساری سطح سیلابی بارشوں کے زیرِ اثر پانی کے نیچے ڈوبی ہوئی تھی سالہا سال اسی حال میں گذر گئے، سیلابی بارشیں کم ہوئیں۔ پانی زمین کے گڑھوں میں جا گزیں ہوا۔ آہستہ آہستہ خشکیاں پانی کے نیچے سے نمودار ہونے لگیں۔ یہی وہ چیز ہے جو روایاتِ اسلامی میں "دحو الارض" کے نام سے مشہور ہے۔ پہاڑوں کی خلقت چونکہ ان کے زیادہ فوائد کی وجہ سے توحید کی ایک نشانی ہے، اس لیے ان کا ذکر کرتے ہوئے مزید فرمایا گیا ہے: ہم نے زمین مستقر اور ثابت پہاڑ ڈالے ہیں (والقینا فیھا رواسی)۔

پہاڑوں کے لیے "القاء" (پھینکنا) کی تعبیر استعمال کی گئی ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ پہاڑ زمین کی وہ سلوٹیں ہیں جو زمین کے چہرے کے

Marfat.com

تدریجاً سرد ہونے کی بناء پر یا آتش فشانی مواد کی وجہ سے وجود میں آئے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ تعبیر اس لحاظ سے ہو کہ "القاء" "ایجاد" کے معنی میں بھی آیا ہے۔ ہم اپنی روزمرہ زبان میں بھی کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں زمین کے لیے ایک پلان بنایا ہے اور اس میں چند کمرے ڈالے ہیں یعنی بنائے اور ایجاد کیے ہیں۔

بہرحال یہ پہاڑ علاوہ اس کے کہ جڑ سے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں اور زرہ کی طرح زمین کے اندرونی خلفشار اور دباؤ کے مقابلے میں لرزتے نہیں، طوفانوں کی طاقت کو بھی درہم برہم کر دیتے ہیں اور ہوا کی رفتار کو پوری طرح کنٹرول کرتے ہیں یہ پہاڑ پانی کے ذخیروں کے لیے بہت اچھی جگہ ہیں جو یہاں برف کی صورت میں یا چشموں کی صورت میں موجود ہوتا ہے۔

خصوصاً لفظ "رواسی" استعمال کیا گیا ہے کہ جو "راسیہ" کی جمع ہے اور یہ ثابت اور مضبوط کے معنی میں ہے جو کچھ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے اس کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ خود بھی ثابت اور مستقر ہیں اور زمین کے نازک چھلکے اور انسانوں کی زندگی کے ثبات و قرار کا باعث ہیں۔

انسانی زندگی اور تمام جانداروں کی زندگی کے لیے بہترین عامل یعنی نباتات کی طرف بات کا رخ رکھتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے زمین پر موزوں نباتات میں سے اگایا ہے (وانبتنا فیھا من کل شیءٍ موزون)۔

"موزون" کس قدر خوبصورت اور رسا تعبیر ہے۔ یہ لفظ دراصل "وزن" کے مادہ سے ہر چیز کے اندازہ شناسائی کے معنی میں لیا گیا ہے[1]۔ یہ دقیق حساب، عجیب نظم وضبط اور نباتات کے تمام اجزاء کے متناسب اندازوں کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک بلکہ ہر ایک کا ہر جز تنا، شاخ، پتہ، پھول، پھل اور گٹھلی سب کچھ معین حساب کتاب کا حامل ہے۔

کرۂ زمین میں شاید لاکھوں قسم کے نباتات ہیں کہ جو مختلف خواص اور طرح طرح کے آثار رکھتے ہیں ان میں سے ہر ایک اللہ کی پہچان کا دریچہ ہے ان میں سے ہر ایک کا پتہ پتہ معرفت کردگار کی ایک کتاب ہے۔

اس جملے کے معنی میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس سے مراد مختلف معدنیات کا پہاڑوں میں پیدا ہونا ہے کیونکہ عرب لفظ "انبات" معدن اور کان کے بارے میں استعمال کرتے ہیں۔

بعض روایات میں بھی اس معنی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ سے اس آیت کی تفسیر پوچھی گئی تو فرمایا: ۔

> مراد یہ ہے کہ خدا نے پہاڑوں میں سونے، چاندی، جواہرات اور باقی دھاتوں کی کانیں اور معدنیات پیدا کی ہیں[2]

یہ احتمال بھی ہے کہ "انبات" (اگانا) یہاں وسیع معنی میں ہو کہ جس میں تمام مخلوقات جنھیں خدا نے زمین میں پیدا کیا ہے، شامل ہوں۔ سورہ نوح میں اس عظیم پیغمبر کی زبانی ہے کہ آپ لوگوں سے کہتے تھے:

---

[1] "الوزن معرفة قدر الشيء" (مفردات راغب)

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۷ (توجہ رہے کہ اس تفسیر کے مطابق "فیھا" کی ضمیر پہاڑوں کی طرف لوٹے گی۔)

Marfat.com

واللہ انبتکم من الارض نباتا

اور خدا نے تمھیں نباتات کی طرح زمین سے اگایا ہے (نوح ـــــــــ ۱۷)

بہرحال کوئی مانع نہیں کہ آیت وسیع مفہوم رکھتی ہو اور اس میں انسان، نباتات اور معدنیات وغیرہ سبھی شامل ہوں۔

انسان کے وسائل حیات چونکہ نباتات و معدنیات میں منحصر نہیں ہیں لہٰذا بعد والی آیت میں ان تمام نعمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے زمین میں تمھارے لیے انواع و اقسام کے وسائل زندگی بنائے ہیں (وجعلنا لکم فیھا معایش)۔

نہ صرف تمھارے لیے بلکہ تمام زندہ موجودات کے لیے اور وہ کہ جنھیں تم روزی نہیں دیتے اور تمھاری دسترس سے باہر ہیں (ومن لستم لہ برٰزقین)۔ جی ہاں! ہم نے ان سب کو ان کی ضروریات فراہم کی ہیں۔

"معایش" "معیشۃ" کی جمع ہے اور یہ وسیلہ، ذریعہ، انسانی زندگی کی ضروریات کو کہتے ہیں کہ بعض اوقات جن کے پیچھے خود انسان جاتا ہے اور بعض اوقات وہ اس کے پیچھے آتی ہیں اگرچہ بعض مفسرین نے لفظ "معایش" کی تفسیر صرف زراعت، نباتات اور کھانے پینے کی چیزوں سے کی ہے لیکن واضح ہے کہ مفہوم لغت پوری طرح وسیع ہے اور تمام وسائل حیات پر محیط ہے۔

مفسرین نے من لستم لہ برٰزقین کی دو تفسیریں کی ہیں۔

پہلی یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ انسانوں، حیوانوں اور زندہ موجودات سب کے لیے اپنی نعمات بیان کرے کہ انسان جنھیں غذا دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔

دوسری یہ کہ خدا چاہتا ہے کہ انسانوں کو متوجہ کرے کہ ہم نے بھی تمھارے لیے اس زمین میں وسیلہ زندگی قرار دیا ہے اور زندہ موجودات بھی تمھارے اختیار میں دیئے ہیں (مثلاً چوپائے) کہ جنھیں تم روزی دینے کی توانائی نہیں رکھتے۔ خدا انھیں روزی دیتا ہے اگرچہ یہ کام تمھارے ہاتھوں انجام پاتا ہے[1] لیکن ہماری نظر میں پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے اور اس کی ادبی دلیل بھی ہم نے فٹ نوٹ میں بیان کر دی ہے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں موجود ایک حدیث بھی ہم اس تفسیر کی تائید میں پاتے ہیں جہاں من لستم لہ برٰزقین کے بارے میں ہے

لکل ضرب من الحیوان قدرنا شیئًا مقدرًا

---

[1] تفسیر اوّل کی بنا پر "من" (من لستم لہ برٰزقین) کا عطف "لکم" کی ضمیر پر ہوتا ہے اور دوسری تفسیر کی بنا پر "معایش" پر۔ بعض نے پہلی تفسیر پر اعتراض کیا ہے کہ مجرور کا اسم ظاہر ضمیر مجرور پر عطف نہیں ہوتا مگر یہ کہ حرف جر کی تکرار ہو یعنی یہاں ضروری تھا کہ لام "من" کے سر پہ بھی آتی۔ دوسرا یہ کہ "من" کا اطلاق انسان کے علاوہ دیگر زندہ موجودات پر کس طرح ہوا ہے۔ لیکن یہ دونوں اعتراض صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ عبارات عرب میں حرف جر کی تکرار نہ ہونے پر شواہد موجود ہیں اور اسی طرح غیر ذوی العقول موجودات پر "من" کے اطلاق کی بھی مثالیں ہیں۔ دوسری تفسیر پہ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ لفظ "معایش" اتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ تمام وسائل زندگی یہاں تک کہ چوپائے وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں، لہٰذا "معایش" کے ذکر کے بعد اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔ اسی بناء پہ ہم نے پہلی تفسیر کو ترجیح دی ہے۔

Marfat.com

تمام جانوروں کے لیے ہم نے کوئی نہ کوئی چیز مقدر کی ہے[1]

زیر بحث آخری آیت میں درحقیقت ایک سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ جو بہت سے لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ خدا اس قدر ارزاق و نعمات انسانوں کے قبضے میں کیوں نہیں دیتا کہ وہ ہر قسم کی سعی و کوشش سے بے نیاز ہو جاتے۔

ارشاد ہوتا ہے: تمام چیزوں کے خزانے ہمارے پاس ہیں لیکن ہم ان کی معین مقدار کے علاوہ نازل نہیں کرتے (وان من شیئ الاعندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم)۔

لہٰذا ایسا نہیں ہے کہ ہماری قدرت محدود ہے اور اپنی نعمات کے ختم ہونے پر ہم وحشت زدہ ہیں بلکہ ہر چیز کا منبع، مخزن اور سرچشمہ ہمارے پاس ہے اور ہم ہر زمانے میں ہر مقدار ایجاد کرنے کی قدرت رکھتے ہیں لیکن اس عالم کی تمام چیزیں کسی حساب کے ماتحت ہیں اور ارزاق بھی خدا کی طرف سے بمقدار حساب نازل ہوتی ہیں ——— ایک اور جگہ قرآن کہتا ہے:۔

ولو بسط الله الرزق لعباده لبغوا فی الارض ولکن ینزل بقدر ما یشاء (شوریٰ - ۲۷)

اگر خدا اپنے بندوں کے لیے بے حساب روزی پھیلا دیتا تو وہ جادۂ حق سے منحرف ہو جاتے، لیکن جتنی مقدار وہ چاہتا ہے نازل کرتا ہے۔ (شوریٰ ——— ۲۷)

پوری طرح واضح ہے کہ سعی و کوشش، انسانی زندگی سے سستی، کاہلی اور دل مردگی دور کرنے کے علاوہ حرکت و نشاط پیدا کرتی ہے اور یہ انسانوں کی صحیح و سالم فکری و جسمانی مشغولیت کے لیے بہت ہی اچھا وسیلہ ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو تمام چیزیں بے حساب انسان کے اختیار میں ہوتیں۔ اور نہ معلوم پھر دنیا کا کیا منظر ہوتا۔

کچھ بیکار انسان سیر شکم کے ساتھ بغیر کسی کنٹرول کے شور و غل مچاتے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس جہان کے لوگ اہل جنت کی طرح نہیں ہیں کہ جن کے قلب و روح سے ہر طرح کی شہوت، خواہش نفسانی، خودخواہی غرور اور رنج کی گرد دھل چکی ہو بلکہ یہ ایسے انسان ہیں کہ تمام نیک و بد صفات کے حامل ہیں انھیں اس جہان کی بھٹی سے کندن بن کر نکلنا چاہیے۔ سعی و کوشش اور صحیح حرکت و اشتغال سے بہتر کندن بنانے کے لیے کون سی چیز ہو سکتی ہے لہٰذا جس طرح فقر و فاقہ اور احتیاج و نیاز انسان کو انحراف اور بدبختی کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں اسی طرح حد سے زیادہ بے نیازی بھی فساد اور تباہی کا باعث ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ خدا کے خزانے کیا ہیں؟ قرآن حکیم کی متعدد آیات میں ہے کہ خدا کے خزانے رکھتا ہے۔ آسمان و زمین کے خزانے خدا کی ملکیت ہیں یا ہر چیز کے خزانے اس کے پاس ہیں۔

"خزائن" جمع ہے "خزانہ" کی جس کا معنی ہے وہ جگہ جہاں انسان اپنے اموال حفاظت کے لیے جمع کرتا ہے یہ اصل میں مادہ

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۹۔

Marfat.com

"خزن" (بروزن "وزن") سے کسی چیز کے حفظ و نگہداری کے معنی میں ہے واضح ہے کہ جمع آوری اور ذخیرہ کرنے اور کسی چیز کو محفوظ کرنے کے لیے وہی شخص اقدام کرتا ہے جس کی قدرت محدود ہو اور جو ہر زمانے میں جو کچھ چاہے فراہم نہ کر سکے لہٰذا وہ قدرت کے موقع پر جس چیز کو ضروری سمجھتا ہے اسے ضرورت کے موقع کے لیے ذخیرہ کر لیتا ہے اور خزانہ میں جمع کر لیتا ہے۔

لیکن ——— کیا یہ امور خدا کے بارے میں تصور کیے جا سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین مثلاً طبرسی نے مجمع البیان میں، فخر رازی نے تفسیر کبیر میں اور راغب نے مفردات میں "خزائن اللہ" کی "مقدراتِ الٰہی" کے ساتھ تفسیر کی ہے یعنی تمام چیزیں قدرتِ خدا کے خزانے میں جمع ہیں اس میں سے جتنی مقدار وہ ضروری اور قرینِ مصلحت سمجھتا ہے ایجاد کرتا ہے۔

جبکہ بعض دیگر عظیم مفسرین نے کہا ہے کہ "خزائن اللہ" سے مراد امور کا وہ مجموعہ ہے کہ جو عالمِ ہستی اور جہانِ مادہ میں موجود ہیں لیکن اس عالم کی اعلیٰ اور مخصوص موجودات محدود مقدار میں پیدا ہوتی ہیں بغیر اس کے کہ امکان وجود انہی میں منحصر ہو۔[1]

یہ تفسیر اگرچہ اصولی طور پر قابلِ قبول مسئلہ ہے لیکن "عندنا" (ہمارے پاس) کی تعبیر پہلی تفسیر کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔

بہر حال خزائن اللہ جیسی تعبیرات کا انتخاب عام مفہوم میں خدا کے بارے میں صادق نہیں آتا۔ لیکن خدا چاہتا ہے کہ خود لوگوں کی زبان میں اُن سے بات کرے۔

جو کچھ ہم نے کہا ہے اس سے ضمنی طور پر یہ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ بعض مفسرین کی طرف سے "خزائن" کے مفہوم کو پانی اور بارش میں معین و محدود کرنے پر نہ صرف کوئی دلیل موجود نہیں ہے بلکہ یہ مفہوم آیت کی وسعت کے ساتھ بھی مناسبت نہیں رکھتا۔

۲۔ نزولِ مقامی اور نزولِ مکانی: جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے نزول ہمیشہ نزولِ مکانی یعنی اوپر سے نیچے آنے کے معنی میں نہیں ہوتا بلکہ کبھی نزول مقامی کے معنی میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جس وقت کوئی نعمت کسی بڑے شخص کی طرف سے زیرِ دست لوگوں کو ملے تو اسے نزول سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی بناء پر قرآن مجید میں یہ لفظ خدا کی نعمتوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے چاہے وہ آسمان سے نازل ہوں مثلاً بارش یا زمین میں پرورش پاتی ہوں مثلاً حیوانات، جیسا کہ سورۂ زمر کی آیت ۶ میں ہے:

وانزل لکم من الانعام ثمانیة ازواج

(اور اس نے تمہارے لیے آٹھ قسم کے چوپائے نازل کیے۔

نیز لوہے کے بارے میں سورۂ حدید کی آیہ ۲۵ میں ہے۔

وانزلنا الحدید

اور ہم نے لوہا نازل کیا۔

اسی طرح دیگر مثالیں بھی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ "نزول" اور "انزال" یہاں وجود، ایجاد اور خلقت کے معنی میں ہے البتہ چونکہ خدا کی طرف سے بندوں کے لیے ہے لہٰذا اس قسم کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔

---

[1] المیزان جلد ۱۲ ص ۱۴۸۔

Marfat.com

۲۲. وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ
وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ○
۲۳. وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ○
۲۴. وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ○
۲۵. وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ○

ترجمہ

۲۲. ہم نے ہوائیں (بادلوں کے ایک دوسرے سے ملنے، ان کے بارآور ہونے اور) تلقیح کے لیے بھیجیں، اور آسمان سے ہم نے پانی نازل کیا اور اس سے سیراب کیا جبکہ تم ان کی حفاظت اور نگہداری کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔

۲۳. اور ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں اور ہم (سارے عالم کے) وارث ہیں۔

۲۴. ہم تمہارے متقدمین کو بھی جانتے تھے اور متاخرین کو بھی۔

۲۵. تیرا پروردگار یقینی طور پر (قیامت میں) سب کو جمع اور محشور کرے گا کیونکہ وہ حکیم اور دانا ہے۔

تفسیر:

ہوا اور بارش:

گذشتہ آیات میں بعض اسرار آفرینش کا تذکرہ تھا اور خدا کی نعمتوں کا بیان تھا۔ مثلاً زمین، پہاڑ، نباتات اور وسائل زندگی کی خلقت۔

زیر نظر پہلی آیت میں ہواؤں کے چلنے اور بارشوں کے نزول میں ان اسرار آفرینش کے نقش مؤثر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: ہم نے ہوائیں بھیجیں جبکہ وہ بارآور کرنے والی ہیں (بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہیں اور انھیں بارآور کرتی ہیں) (وارسلنا الریاح لواقح) اور ان کے پیچھے ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا (فانزلنا من السماء ماء)۔ اور اس ذریعے سے ہم نے سب کو سیراب (فاسقینکموہ) حالانکہ تم اس کی حفاظت اور نگہداری کی طاقت نہ رکھتے تھے (وما انتم لہ بخازنین)۔

Marfat.com

"لواقح" "لاقح" کی جمع ہے جس کا معنی ہے بارآور کرنے والا۔ یہاں ان ہواؤں کی طرف اشارہ ہے جو بادلوں کے ٹکڑوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہیں اور باہم پیوند کرتی ہیں اور انھیں بارش کے لیے تیار کرتی ہیں۔

بعض معاصرین نے اس آیت کو ہواؤں کے ذریعے نباتات کی تلقیح اور گردافشانی کے لیے اشارہ قرار دیا ہے اور اس طرح ایک سائنسی مسئلے کے حوالے سے اس کی تفسیر کی ہے کہ جو نزولِ قرآن کے زمانے میں انسانی معاشرے میں محلِ توجہ نہ تھا اس طرح انھوں نے اسے قرآن کے اعجازِ علمی کے دلائل میں سے شمار کیا ہے لیکن اس حقیقت کو قبول کرنے کے باوجود کہ ہواؤں کا چلنا نر نباتات کے نطفے کو مادہ نباتات تک پہنچانے اور انھیں بارآور کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتا ہے، مندرجہ بالا آیت کو اس طرف اشارہ قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ اس لفظ کے فوراً بعد آسمان سے نزول باراں کا ذکر (وہ بھی فاء تفریع کے ساتھ) آیا ہے جو نشاندہی کرتا ہے کہ ہواؤں کا تلقیح کرنا بارش برسنے کی تمہید ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا تعبیر بادلوں اور ان سے بارش پیدا ہونے کے لیے خوبصورت ترین تعبیر ہے ہوسکتا ہے کہ کہا جائے کہ بادلوں کو ماں باپ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جو ہواؤں کی مدد سے ملاپ کرتے ہیں اور بارآور ہوتے ہیں۔ اور اپنی اولاد یعنی بارش کے دانوں کو زمین پر رکھتے ہیں۔

وما انتم لہ بخازنین (تم ان پانیوں کی حفاظت اور ذخیرہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے) ـــــــ ممکن ہے یہ جملہ آبِ باراں کو نزول سے پہلے ذخیرہ کرنے کی طرف اشارہ ہو ـــــــ یعنی ان بادلوں پر تمھارا کوئی بس نہیں کہ جو بارش کے اصلی منبع ہیں۔ نیز ممکن ہے نزولِ باراں کے بعد ذخیرہ کرنے کی طرف اشارہ ہو ـــــــ یعنی تم میں یہ طاقت نہیں کہ نزولِ باراں کے بعد زیادہ مقدار میں پانی جمع اور محفوظ رکھ سکو۔ یہ خدا ہے جو اسے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی صورت میں منجمد کرکے یا زمین کی گہرائیوں میں بھیج کر محفوظ کرلیتا ہے جو بعد میں چشموں، ندیوں اور کنوؤں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

مباحثِ توحید کے بعد معاد و قیامت اور اس کے مقدمات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے ہم ہیں جو زندہ کرتے ہیں اور ہم ہیں جو مارتے ہیں (وانا لنحن نحیی و نمیت)۔ اور تمام روئے زمین کے اور اس سارے عالم کے وارث ہم ہیں (ونحن الوارثون)۔

یہ حیات و موت کے مسئلے کی طرف اشارہ ہے جو درحقیقت اہم ترین اور قطعی ترین مسائل میں سے ہے یہ مسئلہ معاد کی بحث کے لیے تمہید بھی بن سکتا ہے اور توحید کی بحث کا نقطہ تکمیل بھی۔ کیونکہ ظہورِ حیات عالمِ ہستی کے عجیب ترین مسائل میں سے ہے اور اس مظہر کی تحقیق اور اس کا مطالعہ ہمیں خالقِ حیات سے اچھی طرح آشنا کرسکتا ہے۔ اصولی طور پر موت و حیات کا نظام بے پایاں قدرت و علم کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسری طرف موت و حیات کا وجود خود اس امر کی طرف دلیل ہے کہ اس عالم کے موجودات خود سے کچھ نہیں رکھتے اور جو کچھ رکھتے ہیں وہ کسی اور کی طرف سے ہے اور آخر کار ان سب کا وارث اللہ ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: ہم ان کے گذشتگان اور آنے والوں کو جانتے ہیں (ولقد علمنا المستقدمین منکم ولقد علمنا المستأخرین)۔

لہٰذا وہ خود بھی اور ان کے اعمال بھی ہمارے علم کے سامنے واضح اور آشکار ہیں اور اس لحاظ سے معاد و قیامت اور ان

Marfat.com

سب کے اعمال کا حساب و کتاب پوری طرح ہمارے سامنے ہے۔

اس بناء پر اس گفتگو کے فوراً بعد فرمایا گیا ہے: یقیناً تیرا پروردگار ان سب کو قیامت میں ایک نئی زندگی کی طرف پلٹائے گا اور انھیں جمع و محشور کریگا (وان ربك هو يحشرهم) کیونکہ وہ حکیم بھی ہے اور علیم بھی (انه حكيم عليم)۔

اس کی "حکمت" کا تقاضا ہے کہ موت تمام چیزوں کا اختتام نہ بنے کیونکہ اگر زندگی اس جہان کی انھی چار دن کی حیات میں منحصر ہو تو آفرینش جہاں لغو اور بے معنی ہو جائے اور خدا وند حکیم سے بعید ہے کہ اس کی خلقت ایسی بے نتیجہ ہو لیکن اگر یہ آفرینش ایک لامتناہی حیات اور دائمی سیر و سلوک کی تیاری کے لیے مقدمہ ہے یا دو لفظوں میں ابدی اور جاوداں زندگی کے لیے تمہید ہو تو ایک مکمل مفہوم و معنی کی حامل ہو گی اور اس کی حکمت سے ہم آہنگ ہو گی اس لیے کہ حکیم کوئی کام بے حساب و کتاب نہیں کرتا اور اس کا علیم ہونا سبب بنتا ہے کہ معاد و حشر کے معاملے میں کوئی مشکل پیدا نہ ہو ہر ذرہ خاکی جو کسی بھی انسان کا کسی گوشے میں جا پڑا ہے وہ اسے جمع کرے گا اور اسے نئی حیات بخشے گا۔ دوسری طرف سب کے اعمال کا دفتر اس جہانِ طبیعت کے دل میں بھی ثبت ہے اور انسانوں کے قلب و روح میں بھی اور وہ ان سب سے آگاہ ہے۔

اس بناء پر خدا کا حکیم و علیم ہونا حشر و نشر اور معاد و قیامت پر جچی تلی اور پُر مغز دلیل شمار ہوتا ہے۔

متقدمین اور متاخرین کون ہیں؟

"ولقد علمنا المستقدمين منكم ولقد علمنا المستأخرين" ——— اس آیت کے بارے میں مفسرین نے بہت سے احتمالات کا ذکر کیا ہے۔

- ——— مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں چھ تفسیریں بیان کی ہیں۔
- ——— قرطبی نے آٹھ احتمال ذکر کیے ہیں
- ——— ابوالفتح رازی نے تقریباً دس احتمال پیش کیے ہیں۔

لیکن ——— ان سب کا گہرا مطالعہ اور تحقیق کی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ان سب کو ایک ہی تفسیر میں جمع کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ:۔

لفظ "متقدمین" اور "متاخرین" وسیع معنی رکھتے ہیں۔ ان میں زمانے کے لحاظ سے پہلے اور بعد میں آنے والے اعمالِ خیر میں آگے بڑھ جانے والے، جہاد اور دشمنانِ حق سے مبارزہ کرنے والے یہاں تک کہ نماز جماعت کی صفوں میں آگے اور پیچھے رہنے والے اور اسی قسم کے دیگر لوگ شامل ہیں۔

اس جامع معنی کی طرف توجہ رکھتے ہوئے وہ تمام احتمالات جمع کر کے قبول کیے جا سکتے ہیں اور اس آیت میں تقدم و تاخر کے بارے میں ذکر کیے گئے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز جماعت کی پہلی صف میں شرکت کی بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے۔

آپ نے فرمایا:۔

Marfat.com

"خدا اور اس کے فرشتے ان صفوں میں پیش قدمی کرنے والوں پر درود بھیجتے ہیں"

اس تاکید کے بعد لوگوں نے پہلی صف میں شرکت کے لیے بہت ہجوم کیا۔ ایک قبیلہ "بنی عذرہ" تھا۔ ان لوگوں کے گھر مسجد سے دُور تھے انھوں نے کہا کہ ہم اپنے گھر بیچ کر مسجد نبوی کے قریب ہی گھر خرید لیتے ہیں تاکہ صف اوّل میں پہنچ سکیں۔ اس پر مندرجہ بالا آیت نازل ہوئی اور انھیں بتایا گیا کہ خدا تمھاری نیتوں کو جانتا ہے یہاں تک کہ تم اگر آخری صف میں بھی کھڑے ہوئے تو بھی تمھاری نیت چونکہ پہلی صف میں کھڑا ہونے کی ہے تمھیں اپنی نیت کی جزا ملے گی۔[1]

مسلّم ہے کہ اس شانِ نزول کا محدود ہونا آیت کے وسیع مفہوم کے محدود ہونے کا ہرگز سبب نہیں ہو سکتا۔

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

۲۶۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۚ ○

۲۷۔ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ○

۲۸۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ
حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○

۲۹۔ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ○

۳۰۔ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ ○

۳۱۔ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ○

۳۲۔ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ○

۳۳۔ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ
مَّسْنُوْنٍ ○

۳۴۔ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۙ ○

۳۵۔ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ○

۳۶۔ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○

۳۷۔ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۙ ○

۳۸۔ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ○

۳۹۔ قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِیْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِی الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ۙ ○

۴۰۔ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ○

Marfat.com

۴۱۔ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ○
۴۲۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ○
۴۳۔ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○
۴۴۔ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ○

ترجمہ

۲۶۔ ہم نے انسان کو خشک شدہ مٹی سے پیدا کیا کہ جو بدبودار (سیاہ رنگ) کیچڑ سے لی گئی تھی۔
۲۷۔ اور اس سے پہلے ہم جن کو گرم اور جلانے والی آگ سے خلق کیا تھا۔
۲۸۔ اور یاد کرو وہ وقت کہ جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا: میں بشر کو خشک شدہ مٹی جو بدبودار کیچڑ سے لی گئی ہے، سے خلق کروں گا۔
۲۹۔ جب ہم اس کام کو انجام دے چکیں اور اس میں اپنی (ایک شائستہ اور عظیم) روح پھونکیں تو سب کے سب اسے سجدہ کرنا۔
۳۰۔ تمام فرشتوں نے بلا استثناء سجدہ کیا۔
۳۱۔ سوائے ابلیس کے کہ جس نے سجدہ کرنے والوں میں سے ہونے سے انکار کر دیا۔
۳۲۔ (اللہ نے) فرمایا اے ابلیس! تو ساجدین کے ساتھ کیوں شامل نہیں ہوا؟
۳۳۔ اس نے کہا: میں ہرگز ایسے بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے بدبودار کیچڑ سے لی گئی خشک شدہ مٹی سے بنایا ہے۔
۳۴۔ فرمایا: ان (فرشتوں) کی صف سے نکل جا کہ تو ہماری درگاہ سے راندہ گیا ہے۔
۳۵۔ اور تجھ پر روزِ قیامت تک لعنت (اور رحمتِ حق سے دُوری) ہوگی۔
۳۶۔ اس نے کہا: پروردگارا! مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے (اور زندہ رکھ)۔
۳۷۔ فرمایا: تو مہلت حاصل کرنے والوں میں سے ہے۔

Marfat.com

۳۸۔ (لیکن روزِ قیامت تک نہیں بلکہ) معین دن اور وقت تک۔
۳۹۔ اس نے کہا: پروردگارا! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں مادی نعمتوں کو زمین میں ان کی نگاہ میں مزین کروں گا اور سب کو گمراہ کروں گا۔
۴۰۔ مگر تیرے مخلص بندے۔
۴۱۔ (اللہ نے) فرمایا: یہ میری مستقیم اور سیدھی راہ ہے (اور ہمیشہ کی سنت ہے)
۴۲۔ (کہ) تو میرے بندوں پر تسلط حاصل نہیں کر سکے گا مگر وہ گمراہ جو تیری پیروی کریں گے۔
۴۳۔ اور جہنم ان سب کی وعدہ گاہ ہے۔
۴۴۔ اس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لیے ان میں سے ایک معین گروہ تقسیم شدہ ہے۔

تفسیر

خلقتِ انسان:

گذشتہ آیات میں مخلوقِ خدا کے ایک حصے اور نظامِ ہستی کا بیان تھا۔ اسی مناسبت سے ان آیات میں تخلیق کے عظیم شاہکار یعنی انسان کی خلقت کو بیان کیا گیا ہے۔ متعدد پر معنی آیات کے ذریعے اس خلقت کے بہت سے پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے۔

ہم پہلے تو آیات کی اجمالی تفسیر بیان کرتے ہیں اس کے بعد اہم نکات پر علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے
ارشاد ہوتا ہے: ہم نے انسان کو صلصال سے (یعنی اس مٹی سے جو خشک شدہ ہو اور کسی چیز سے ٹکراتے وقت آواز دیتی ہو) پیدا کیا ہے کہ جو حماٍ مسنون (سخت تاریک، متغیر اور بدبودار کیچڑ) سے لی گئی ہے (ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حماٍ مسنون)۔

اور اس سے پہلے "جنوں" کو ہم نے گرم اور جلانے والی آگ سے پیدا کیا ہے (والجان خلقنٰہ من قبل من نار السموم)۔

"سموم" لغت میں جلانے والی ہوا کے معنی میں ہے گویا یہ ہوا انسانی جسم کے تمام سوراخوں سے نفوذ کرتی ہے کیونکہ عرب انسانی جسم کے بہت ہی چھوٹے سوراخوں کو "مسام" کہتے ہیں۔ "سموم" بھی اسی مناسبت سے ایسی ہوا کو کہا جاتا ہے۔ مادہ "سم" (زہر) بھی اسی سے ہے کیونکہ وہ بدن میں نفوذ کر کے انسان کو قتل کر دیتی ہے یا بیمار کر دیتی ہے۔
جنوں کے ذکر کے بعد قرآن پھر خلقتِ انسان کے موضوع کی طرف لوٹتا ہے۔ فرشتوں سے اللہ تعالیٰ کی خلقتِ انسان کے

Marfat.com

بارے میں جو پہلی گفتگو ہوئی اسے یوں بیان کیا گیا ہے : یاد کرو وہ وقت جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا ، فرمایا: میں بشر کو تاریک رنگ بدبودار کیچڑ سے لی گئی خشک مٹی سے پیدا کروں گا (واذ قال ربك للملٰئكة انی خالق بشرًا من صلصال من حمإٍ مسنون) جب میں اس کی خلقت کو انجام و کمال تک پہنچا لوں اور اپنی (ایک شریف پاک اور باعظمت) روح اس میں پھونک دوں تو سب کے سب اسے سجدہ کرنا (فاذا سویته ونفخت فیه من روحی فقعوا له سٰجدین)۔

خلقت انسان تکمیل کو پہنچ گئی اور انسان کے لیے جو جسم و جان مناسب تھا اسے دے دیا گیا اور سب کچھ انجام پا گیا،، تو اس وقت تمام فرشتوں نے بلا استثناء سجدہ کیا (فسجد الملٰئكة كلهم اجمعون) یہ وہ تنہا شخص جس نے اس فرمان کی اطاعت نہ کی وہ " ابلیس " تھا۔ لہٰذا مزید فرمایا : سوائے ابلیس کے کہ جس نے ساجدین کے ساتھ ہونے سے انکار کیا (الا ابلیس ابیٰ ان یکون مع السٰجدین)۔

اس موقع پر ابلیس سے باز پرس کی گئی اور خدا نے " اس سے کہا "اے ابلیس ! تو ساجدین میں شامل کیوں نہیں ہے (قال یا ابلیس مالك الا تکون مع السٰجدین)۔

ابلیس کہ جو غرور اور خود خواہی میں ایسا غرق تھا کہ اس کی عقل و ہوش غائب چکے تھے۔ پروردگار کی پرستش کے جواب میں بڑی گستاخی سے بولا" میں ہرگز ایسے بشر کو سجدہ نہیں کروں گا جسے تو نے بدبودار کیچڑ سے لی گئی خشک مٹی سے پیدا کیا ہے" (قال لم اکن لاسجد لبشر خلقته من صلصال من حمإٍ مسنون)۔

نورانی اور چمکنے والی آگ کہاں اور سیاہ اور متعفن مٹی کہاں۔ کیا مجھ جیسا ایک اعلیٰ موجود پست تر موجود کے سامنے خضوع کر سکتا ہے، یہ کون سا قانون ہے ؟

وہ چونکہ غرور اور خود خواہی کے باعث خلقت و آفرینش کے اسرار سے بے خبر تھا اور خاک کی برکات کو فراموش کر چکا تھا کہ جو ہر خیر و برکت کا منبع ہے اور اس سے بڑھ کر وہ شریف اور عظیم الٰہی روح تھی جو آدم میں موجود تھی اس نے اسے لائق اعتناء نہ سمجھا۔ اچانک اپنے بلند مقام سے گر پڑا اب وہ اس لائق نہ رہا تھا کہ صف ملائکہ میں کھڑا ہو سکے لہٰذا خدا تعالیٰ نے اسے فوراً فرمایا: " یہاں سے (بہشت سے یا آسمانوں سے یا ملائکہ کی صفوں سے) باہر نکل جا کہ تو راندۂ درگاہ ہے (قال فاخرج منها فانك رجیم)۔

اور جان لے کہ تیرا یہ غرور تیرے کفر کا سبب بن گیا ہے اور اس کفر نے تجھے ہمیشہ کے لیے دھتکارا ہوا کر دیا ہے تجھ پر روز قیامت تک لعنت اور رحمت خدا سے دوری ہے (وان علیك اللعنة الیٰ یوم الدین)۔

ابلیس نے جب اپنے آپ کو بارگاہ الٰہی سے دھتکارا ہوا پایا اور احساس کیا کہ انسان اس کی بدبختی کا سبب بنا ہے تو کینہ کی آگ اس کے دل میں بھڑک اٹھی اور اس نے اولاد آدم سے انتقام لینے کی ٹھان لی حالانکہ اصلی مجرم وہ خود تھا نہ کہ آدم اور نہ فرمان خدا لیکن غرور اور خود خواہی نے جس میں اس کی ہٹ دھرمی بھی شامل تھی اس حقیقت کو سمجھنے کی اجازت نہ دی ۔ لہٰذا اس نے عرض کیا پروردگارا ! اب جب معاملہ ایسا ہے تو مجھے روز قیامت تک مہلت دے دے۔ (قال رب فانظرنی الیٰ یوم یبعثون)۔

Marfat.com

یہ تقاضا اس لیے نہ تھا کہ وہ توبہ کرے، اپنے کیے پر پشیمان ہو یا تلافی کے درپے ہو بلکہ اس لیے تھا کہ اپنی ہٹ دھرمی، عناد، دشمنی اور خیرہ سری کو جاری رکھ سکے۔ خدا نے اس کی خواہش کو قبول کرلیا اور فرمایا" یقیناً تو مہلت یافتہ افراد میں سے ہے" (قال فانك من المنظرین) لیکن روز قیامت مخلوق کے مبعوث ہونے تک کے لیے نہیں جیسا کہ تو نے چاہا ہے بلکہ معین وقت اور زمانے کے لیے (الی یوم الوقت المعلوم)۔

اس بارے میں کہ" یوم الوقت المعلوم" سے کون سا دن مراد ہے مفسرین نے کئی ایک احتمالات ذکر کیے ہیں:

بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس جہان کا اختتام اور ذمہ داری کے دور کا خاتمہ ہے کیونکہ قرآن کی آیات کے ظاہری مفہوم کے مطابق اس کے بعد تمام مخلوق نابود ہوجائے گی اور صرف خدا کی ذات پاک باقی رہ جائے گی۔ لہٰذا ابلیس کی درخواست ایک حد تک قبول کی گئی۔

بعض دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ "وقت معلوم" سے ایک معین زمانہ مراد ہے جسے خدا جانتا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اس سے آگاہ نہیں ہے کیونکہ اگر خدا تعالیٰ اسے واضح کردیتا تو ابلیس کو گناہ اور سرکشی کی زیادہ تشویق ہوتی۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ اس سے مراد یوم قیامت ہے کیونکہ وہ اس دن تک زندہ رہنا چاہتا تھا تاکہ حیات جاوید پائے اور اس کی بات مان لی گئی خصوصاً جبکہ سورۂ واقعہ کی آیہ ۵۰ میں" یوم الوقت المعلوم" کی تعبیر روز قیامت کے بارے میں بھی آئی ہے لیکن یہ احتمال بہت ہی بعید معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو خدا نے اس کی درخواست کی مکمل طور پر موافقت کی ہوتی جبکہ مندرجہ بالا آیات کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ اس کی درخواست کی پوری موافقت نہیں کی گئی اور صرف" یوم وقت المعلوم" تک درخواست مانی گئی ہے۔

بہرحال پہلی تفسیر آیت کی روح اور ظاہری مفہوم کے ساتھ زیادہ مطابقت رکھتی ہے اور امام صادق علیہ السلام سے منقول بعض روایات میں بھی اس معنی کی تصریح ہوئی ہے[1]

اس مقام پر ابلیس نے اپنی باطنی نیت کو آشکار کردیا۔ اگرچہ خدا سے کوئی چیز پوشیدہ نہ تھی تاہم وہ کہنے لگا: "پروردگارا! اس بنا پر کہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے (اور اس انسان نے میری بدبختی کا سامان فراہم کیا ہے) میں زمین کی مادی نعمتوں کو ان کی نگاہ میں دلفریب بناؤں گا اور انسان کو ان میں مشغول رکھوں گا اور آخر کار سب کو گمراہ کرکے رہوں گا (قال رب بما اغویتنی لازینن لهم فی الارض و لاغوینهم اجمعین)۔

لیکن وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اس کے وسوسے خدا کے مخلص بندوں کے دل پر ہرگز اثر انداز نہیں ہوں گے اور اس کے جال انھیں نہیں پھانس سکیں گے۔ خلاصہ یہ کہ خالص و مخلص بندے اس قدر طاقت ور ہیں کہ شیطانی زنجیریں توڑ ڈالیں گے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۱۳ حدیث ۴۵۔

Marfat.com

لہذا فوراً اپنی بات میں استثناء کرتے ہوئے اس نے کہا: "مگر تیرے وہ بندے جو خالص شدہ ہیں (الا عبادك منهم المخلصين)۔

واضح ہے کہ خدا نے شیطان کو گمراہ نہیں کیا تھا بلکہ ابلیس کی یہ بات شیطنت آمیز تھی۔ اصطلاح کے مطابق اپنے آپ کو بری قرار دینے کے لیے اور گمراہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کرنے کے لیے اس نے یہ بات کی تھی اور یہ سب ابلیسوں اور شیطانوں کی رسم ہے کہ اولاً وہ اپنے گناہ دوسروں کے سر ڈال دیتے ہیں اور ثانیاً ہر جگہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے برے اعمال کی غلط توجیہ پیش کریں نہ صرف بندگانِ خدا کے سامنے بلکہ خود خدا کے سامنے بھی کہ جو ہر چیز سے آگاہ ہے۔

ضمناً توجہ رہے کہ "مخلصین" "مُخلَص" (لام کی فتح کے ساتھ)۔ جیسا کہ ہم سورۂ یوسف کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کہ "مخلص" اس شخص کو کہتے ہیں جو ایمان و عمل کے اعلیٰ درجہ پر تعلیم و تربیت اور جہادِ نفس کے بعد پہنچا ہو۔ جس پر شیطان اور کسی اور کے بھی وسوسوں کا کوئی اثر نہ ہو۔[1]

خدا نے شیطان کی تحقیر اور راہِ حق کے متلاشیوں اور طریقِ توحید کے راہیوں کی تقویت کے لیے فرمایا: یہ میری مستقیم راہ ہے (قال هٰذا صراط علی مستقيم)۔

تو میرے بندوں پر کوئی تسلط نہیں رکھتا مگر وہ کہ جو ذاتی طور پر تیری پیروی کریں (ان عبادي ليس لك عليهم سلطان الا من اتبعك من الغوين)۔

یعنی درحقیقت تو لوگوں کو گمراہ نہیں کر سکتا بلکہ یہ تو منحرف انسان ہیں جو اپنے ارادے اور رغبت سے تیری دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور تیرے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یہ آیت انسانوں کے ارادے کی آزادی کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ ابلیس اور اس کا لشکر کسی کو زبردستی برائی کی طرف کھینچ کر نہیں لے جاتا بلکہ یہ خود انسان ہی ہیں جو اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے دل کا دریچہ اس کے لیے کھولتے ہیں اور اسے مداخلت کی اجازت دیتے ہیں خلاصہ یہ کہ شیطانی وسوسے اگرچہ مؤثر ہیں لیکن آخری فیصلہ شیطان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خود انسان کے بس میں ہے کیونکہ انسان اس کے مقابلے میں کھڑا ہو کر اسے ٹھکرا سکتا ہے۔ درحقیقت خدا تعالیٰ شیطان کے دفاع سے یہ خیال باطل اور تصور خام نکال دینا چاہتا ہے کہ وہ بلا مقابلہ انسان پر حکومت حاصل کرے گا۔

اس کے بعد شیطان کے پیروکاروں کو نہایت صریح دھمکی دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جہنم ان سب کی وعدہ گاہ ہے (وان جهنم لموعدهم اجمعين)۔

یہ گمان نہ کریں کہ وہ سزا اور عذاب کے چنگل سے فرار کر سکیں گے یا معاملہ ان کے حساب و کتاب تک نہیں پہنچے گا ان سب کے حساب کتاب کی ایک ہی جگہ اور ایک ہی مقام پر دیکھ بھال کی جائے گی۔

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۹ ص (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

وہی دوزخ کہ جس کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لیے شیطان کے پیروکاروں کا ایک گروہ تقسیم ہوا ہے
(لھا سبعۃ ابواب لکل باب منھم جزء مقسوم)۔
یہ درحقیقت گناہوں کے دروازے ہیں جن کے ذریعے مختلف افراد دوزخ میں داخل ہوں گے۔ ہر گروہ ایک گناہ کے ارتکاب کے ذریعے ایک در سے دوزخ میں جائے گا۔ جیسا کہ جنت کے دروازے اطاعتیں، اعمالِ صالح اور مجاہدات ہیں کہ جن کے ذریعے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے۔

چند اہم نکات:

۱۔ تکبر ــــــ عظیم بدبختیوں کا سرچشمہ: ابلیس اور خلقتِ آدم کی داستان قرآن کی مختلف سورتوں میں آئی ہے اس میں اہم ترین نکتہ ابلیس کا تکبّر کی وجہ سے انتہائی بلند مقام سے محروم ہوجانا ہے کہ جس پر وہ فائز تھا۔
ہم جانتے ہیں کہ ابلیس فرشتوں میں سے نہیں تھا (جیسا کہ سورۂ کہف کی آیہ ۵۰ سے معلوم ہوتا ہے) لیکن اس نے اطاعتِ الٰہی کے ذریعے ایسا بلند مقام حاصل کر لیا تھا کہ ملائکہ کی صفوں میں شامل ہوگیا تھا بلکہ یہاں تک کہ بعض کے بقول فرشتوں کا معلم بن گیا تھا اور جیسا کہ نہج البلاغہ کے خطبہ قاصعہ سے معلوم ہوتا ہے اس نے ہزار سال خدا کی عبادت کی تھی لیکن وہ یہ تمام مقامات گھڑی بھر کے تکبّر کے باعث کھو بیٹھا اور خود پرستی اور تعصّب میں ایسا گرفتار ہوا کہ عذر خواہی اور توبہ کی طرف نہ لوٹا بلکہ اس نے اپنا کام اسی طرح جاری رکھا اور ہٹ دھرمی کے راستے پر ایسا جما رہا کہ اس نے مصمّم ارادہ کر لیا کہ اولادِ آدم میں سے تمام ظالموں اور گنہ گاروں کے جرائم میں وسوسہ ڈال کر شرکت کرے گا اور ان سب کے کیفرِ کردار . . . .
یہ ہے خود خواہی، غرور، تعصّب، خود پسندی اور استکبار کا نتیجہ۔
نہ صرف ابلیس بلکہ ہم نے اپنی آنکھوں سے شیطان صفت انسانوں کو دیکھا ہے یا ان کے حالات تاریخ کے سیاہ صفحات میں دیکھے ہیں کہ جس وقت وہ غرور و تکبّر اور خود غرضی کے مرکب پر سوار ہوئے تو انھوں نے ایک دنیا کو خاک و خون میں غلطاں کر دیا گویا آنکھوں میں اترے ہوئے خون اور جہالت کے پردے نے ان کی ظاہری اور باطنی آنکھوں کو بے کار کر دیا اور وہ کسی حقیقت کو نہ دیکھ پائے۔ انھوں نے دیوانہ وار ظلم و جور کی راہ میں قدم اٹھایا اور آخر کار اپنے آپ کو بدترین گڑھے میں گرا دیا یہ غرور و تکبّر جلا ڈالنے والی اور وحشت ناک آگ ہے جیسا کہ ہو سکتا ہے کہ ایک انسان سالہا سال محنت و مشقت کرے، گھر بنائے اس کا ساز و سامان جمع کرے اور زندگی گذارنے کا سرمایہ فراہم کرے لیکن اس کی تمام محنتوں کا ماحصل آگ کا صرف ایک شعلہ چند لمحوں میں خاکستر بنا دے۔
اسی طرح پوری طرح ممکن ہے کہ ہزار ہا سال کی محنتوں کا ماحصل خدا کے سامنے ایک گھڑی کے غرور کے باعث کھو بیٹھے اس سے بڑھ کر واضح اور ہلا دینے والا سبق کیا ہوگا۔
تعجب کی بات یہ ہے کہ اس کی توجہ اپنے واضح اور روشن نکتے کی طرف بھی نہ تھی کہ آگ خاک پر برتری نہیں رکھتی کیونکہ تمام برکات کا سرچشمہ خاک ہے۔ نباتات، حیوانات، معدنیات سب کا تعلق مٹی سے ہے اور پانی ذخیرہ کرنے کے مقامات

Marfat.com

اسی کے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ہر زندہ موجود کی پیدائش کا سرچشمہ خاک ہے لیکن آگ کا کام جلانا ہے آگ بہت سے مواقع پر ویرانی اور تباہی و بربادی کا سبب بن جاتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام اسی خطبہ قاصعہ میں ابلیس کو "عدو اللہ" (دشمنِ خدا) امام المتعصّبین (متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں کا پیشوا) اور سلف المتکبرین (متکبرین کا بزرگ) کہہ کر پکارتے ہیں اور فرماتے ہیں:

> اسی لیے خدا نے عزت کا لباس اس کے بدن سے اتار دیا اور ذلت کی چادر اس کے سر پر ڈال دی۔

اس کے بعد مزید فرماتے ہیں:۔

> الاترون کیف صغرہ اللہ بتکبرہ، و وضعہ بترفعہ، فجعلہ فی الدنیا مدحورًا واعدلہ فی الاٰخرۃ سعیرًا
>
> کیا دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح خدا نے اسے اس کے تکبّر کی وجہ سے حقیر اور چھوٹا کر دیا اور برتری کی خواہش کے سبب اسے پست کر دیا وہ دنیا میں راندہ درگاہ ہوا اور دارِ آخرت میں اس کے لیے دردناک عذاب فراہم کیا۔[1]

ضمنی طور پر جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے ابلیس مکتب جبر کا بانی و مبانی ہے وہ مکتب جو ہر انسان کے وجدان کے خلاف ہے اور اس کے پیدا ہونے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ گنہ گار انسان اپنے اعمال سے اپنے آپ کو بری ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ ابلیس نے اپنی برأت کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کی کوشش کا حق رکھتا ہے، اسی عظیم گناہ کا ارتکاب کیا اور کہا: خداوندا! تو نے مجھے گمراہ کیا ہے لہٰذا میں بھی اسی بناء پر مخلصین کے علاوہ تمام اولاد آدم کو گمراہ کروں گا۔

۲۔ <u>شیطان کن لوگوں پر تسلّط حاصل کر لیتا ہے</u>؟ ہم دوبارہ اس نکتے کا ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ شیطانی وسوسوں کا اثر جبری نہیں بلکہ ہم اپنی رغبت سے اس کے وسوسوں کو دل میں جگہ دیتے ہیں ورنہ حتیٰ کہ خود شیطان بھی جانتا ہے کہ وہ مخلصین پر اثرانداز نہیں ہو سکتا۔ وہ کہ جنہوں نے اپنے آپ کو تربیت کے زیرِ سایہ خالص کیا ہے اور شرک کے زنگ کو اپنی روح سے دور کیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے حاصل ہونے والے مفہوم کو دوسرے الفاظ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ شیطان اور گمراہوں کا تعلق پیشوا اور پیروکاروں کا سا ہے نہ کہ مجبور کرنے والے اور مجبوروں کا سا۔

۳۔ <u>جہنم کے دروازے</u>:۔ مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ جہنم کے سات دروازے ہیں (بعید نہیں کہ سات کا عدد یہاں عددِ تکثیر ہو یعنی جہنم کے بہت سے دروازے ہیں جیسا کہ سورۂ لقمان کی آیہ ۲۷ میں بھی سات کا عدد اسی معنی میں آیا ہے)۔

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ ۱۹۲۔

Marfat.com

لیکن واضح ہے کہ دروازوں کی یہ تعداد (جنت کے دروازوں کی طرح) نہ داخل ہونے والوں کی کثرت کی وجہ سے ہے کہ وہ ایک چھوٹے سے دروازے سے نہیں گزر سکتے اور نہ ہی یہ تکلف کے پہلو سے ہے بلکہ درحقیقت یہ ان مختلف عوامل کی طرف اشارہ ہے جو انسان کو جہنم کی طرف کھینچ لے جاتے ہیں گناہوں کی ہر قسم جہنم کا ایک دروازہ ہے۔

نہج البلاغہ کے خطبہ جہاد میں ہے:

ان الجهاد باب من ابواب الجنه فتحه الله لخاصة اوليائه۔

جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے خدا نے اپنے خاص بندوں کے لیے کھولا ہے[1]۔

ایک مشہور حدیث ہے۔

ان السيوف مقاليد الجنة۔

تلواریں جنت کی چابیاں ہیں۔

ان تعبیرات سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جنت اور دوزخ کے متعدد دروازوں سے کیا مراد ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ امام باقر علیہ السّلام سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں[2] جبکہ مندرجہ بالا آیات کہتی ہیں کہ جہنم کے سات دروازے ہیں یہ فرق اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ بدبختی اور عذاب میں داخل ہونے کے بہت سے دروازے ہیں لیکن اس کے باوجود سعادت و خوش بختی تک پہنچنے کے دروازے اس سے زیادہ ہیں (سورہ رعد کی آیہ ۲۳ کے ذیل میں بھی ہم اس سلسلے میں گفتگو کر چکے ہیں)۔

۴۔ "سیاہ کیچڑ" اور "خدا کی روح": یہ بات جاذب نظر ہے کہ ان آیات سے اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان دو مختلف چیزوں سے پیدا ہوا ہے ان سے ایک عظمت کی انتہائی بلندیوں پر ہے اور دوسری قدر و قیمت کے لحاظ سے ظاہراً بہت پست ہے۔

انسان کا مادی پہلو بدبودار سیاہ رنگ کے کیچڑ سے تشکیل پاتا ہے اور اس کا معنوی پہلو وہ چیز ہے کہ جسے "روح خدا" سے یاد کیا گیا ہے البتہ اللہ تعالیٰ جسم رکھتا ہے نہ روح۔ روح کی خدا کی طرف نسبت اصطلاح کے مطابق اضافت و نسبتِ تشریفی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی کالب میں ایک بہت ہی پُر عظمت روح کو ڈالا گیا ہے۔

یہ ایسے ہی ہے جیسے خانہ کعبہ کو اس کی عظمت کی بناء پر "بیت اللہ" اور ماہ مبارک رمضان کو اس کی برکت کی وجہ سے "شہر اللہ" (اللہ کا مہینہ) کہا جاتا ہے۔

اسی بناء پر انسان کی قوسِ صعودی اس قدر بلند ہے کہ وہ اس مقام پر پہنچتا ہے کہ اسے سوائے خدا کے کچھ نظر نہیں آتا اور اس کی قوسِ نزولی اس قدر پست ہے کہ چوپایوں سے بھی پست ہے (بل هم اضل)۔

---

[1] نہج البلاغۃ، خطبہ ۲۷۔

[2] خصال صدوق ابواب الثمانیۃ۔

Marfat.com

قوس صعودی و نزولی میں اتنا زیادہ فاصلہ خود اس مخلوق کی انتہائی اہمیت کی دلیل ہے اور یہ مخصوص ترکیب اس امر کی بھی دلیل ہے کہ انسانی مقام کی عظمت اس کے مادی پہلو کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ اس کے مادی پہلو کی طرف نظر کریں تو وہ سیاہ کیچڑ سے زیادہ کچھ نہیں یہ روحِ الٰہی ہے کہ جس میں بہت زیادہ صلاحیتیں پنہاں ہیں اور وہ انوار الٰہی کا مقام تجلّی ہو سکتی ہے اسے یہ سب عظمتیں بخشی گئی ہیں اور اس کے کمال و ارتقاء کا صرف یہی راستہ ہے کہ اسے تقویت دی جائے اور مادی پہلو کہ جو اسی مقصد کے لیے ذریعہ ہے۔ اسے صرف اسی کی پیش رفت کے لیے استعمال کیا جائے (کیونکہ ممکن ہے اس عظیم ہدف تک پہنچنے کے لیے موثر مدد دے)۔

سورۂ بقرہ کی ابتداء میں حضرت آدم کی خلقت کے متعلق جو آیات آئی ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا آدم کے سامنے سجدہ کرنا ان کے مخصوص الٰہی علم کی وجہ سے تھا۔

لیکن یہ سوال کہ غیر خدا کو سجدہ کس طرح ممکن ہے اور کیا واقعتہً فرشتوں نے اس عجیب و غریب خلقت کی وجہ سے خدا کو سجدہ کیا تھا یا انھوں نے آدم کو سجدہ کیا تھا۔

اس کا جواب سورۂ بقرہ کی انھی آیات کے ذیل میں دیا جا چکا ہے جو خلقتِ آدم سے متعلق ہیں [۱]

۵۔ "جن" کیا ہے ؟ لفظ "جن" دراصل ایسی چیز کے معنی میں ہے جو حسِ انسانی سے پوشیدہ ہو مثلاً ہم کہتے ہیں "جنة اللیل" یا "فلما جن علیه اللیل" یعنی جس وقت سیاہ رات کے پردے نے اسے چھپا لیا۔ اسی بناء پر "مجنون" اس شخص کو کہتے ہیں جس کی عقل پوشیدہ ہو۔ "جنین" اس بچے کو کہتے ہیں جو رحمِ مادر میں مخفی ہو۔ "جنت" اس باغ کو کہتے ہیں جس کے درختوں نے اس کی زمین کو چھپا رکھا ہو۔ "جنان" اس دل کو کہتے ہیں جو سینے کے اندر چھپا ہو اور "جنة" اس ڈھال کو کہتے ہیں جو انسان کو دشمن کی ضربوں سے چھپائے۔

البتہ آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ "جن" ایک موجودِ عاقل ہے کہ جو حسِ انسانی سے پوشیدہ ہے اس کی خلقت دراصل آگ سے یا آگ کے صاف شعلوں سے ہوئی ہے ابلیس بھی اسی گروہ میں سے ہے۔

بعض علماء انھیں "ارواحِ عاقلہ" کی ایک نوع سے تعبیر کرتے ہیں کہ جو مادہ سے مجرد ہیں (البتہ واضح ہے کہ تجردِ کامل نہیں رکھتے کیونکہ جو چیز کسی مادہ سے پیدا ہوتی ہے وہ مادی ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ تجرد ہے کیونکہ ہمارے حواس اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ دوسرے لفظوں میں ایک قسم کا جسمِ لطیف ہے)۔

نیز آیاتِ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مومن بھی ہیں اور کافر بھی۔ مطیع بھی ہیں اور سرکش بھی۔ اور وہ بھی مکلف اور مسئول ہیں۔

البتہ ان مسائل کی تشریح اور دورِ حاضر کے علم سے ان کی ہم آہنگی کے بارے میں مزید بحث کی ضرورت ہے۔ اس کے بارے میں ہم مناسب حد تک انشاء اللہ سورۂ جن کی تفسیر میں بحث کریں گے کہ جو قرآن کے پارہ انتیس میں ہے۔

---

[۱] تفسیر نمونہ جلد اوّل ص (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

جس نکتے کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں لفظ "جان" آیا ہے جو اسی مادہ "جن" سے ہے۔

کیا یہ دونوں الفاظ ("جن" اور "جان") ایک معنی رکھتے ہیں یا جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ "جان" "جن" کی ایک خاص قسم ہے۔

قرآن کی وہ آیات جو اس سلسلے میں آئی ہیں اگر انھیں ایک دوسرے کے سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ دونوں ایک ہی معنی میں ہیں۔ کیونکہ قرآن میں بھی "جن" انسان کے ساتھ آیا ہے۔ اور کبھی "جان"۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۸۸ میں ہے:

قل لئن اجتمعت الانس و الجن

سورۂ ذاریات کی آیہ ۵۶ میں آیا ہے:

و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون

حالانکہ سورۂ رحمان کی آیۂ ۱۵ میں ہے:

خلق الانسان من صلصال کالفخار وخلق الجانّ من مارج من نار۔

اسی سورۂ کی آیت ۳۹ میں ہے:

فیومئذ لا یسئل عن ذنبه انس ولاجانّ

مندرجہ بالا آیات اور قرآن کی دیگر آیات کے مجموعی مطالعے سے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ "جان" اور "جن" دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا آیات میں کبھی "جن" انسان کے ساتھ آیا ہے اور کبھی "جان"۔

البتہ قرآن حکیم میں "جان" ایک اور معنی میں بھی آیا ہے۔ کہ جو سانپ کی ایک قسم ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے واقعہ میں ہے:

کأنها جانّ (قصص: ۳۱)

لیکن یہ ہماری بحث سے خارج ہے۔

۶۔ قرآن اور خلقت انسان: جیسا کہ ہم نے زیر بحث آیات میں دیکھا ہے کہ قرآن میں انسان کے بارے میں بڑی جچی تلی بحث ہے اور اس موضوع سے قرآن تقریباً سربستہ اور اجمالی طور پر گذر گیا ہے کیونکہ اصلی مقصد تربیتی مسائل تھے۔ قرآن کے چند اور مواقع پر بھی اس بحث کی نظیر موجود ہے مثلاً سورۂ سجدہ، مومنون اور حِجر میں۔ البتہ ہم جانتے ہیں کہ قرآن کوئی علوم طبیعی کی کتاب نہیں ہے بلکہ انسان سازی کی کتاب ہے لہٰذا ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ اس میں ان علوم کی جزئیات مثلاً تکامل سے مربوط مسائل، تشریح، جنین شناسی، نباتات شناسی وغیرہ بیان ہوں۔ لیکن یہ بات اس سے مانع نہیں کہ تربیتی مباحث کی مناسبت سے ان علوم کی بعض جزئیات کی طرف قرآن میں مختصر سا اشارہ ہو جائے۔ بہرحال اس مختصر سی تمہید کے بعد یہاں دو امور پر بحث کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

Marfat.com

۱۔ تکاملِ انواع سائنسی لحاظ سے۔
۲۔ تکاملِ انواع قرآن کی نظر سے۔

پہلے ہم اس موضوع پر آیات و روایات سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف علوم طبیعی کے خصوصی معیاروں کو سامنے رکھ کر بحث کرتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ علوم طبیعی کے علماء کے درمیان زندہ موجودات چاہے نباتات ہوں یا حیوانات، ان کے بارے میں دو مفروضے موجود ہیں۔

الف): تکامل انواع کا مفروضہ یا Transformism اس مفروضے کے مطابق زندہ موجودات کی انواع ابتداء میں موجودہ شکل میں نہ تھیں بلکہ موجودات کا آغاز ایک ایک سلول سے ہوا۔ یہ سلول Cellule سمندروں کے پانی اور دریاؤں کی تہہ کے چکنے سیاہ کیچڑ کے درمیان حرکت سے پیدا ہوئے یعنی بے جان موجودات تھے کہ جو خاص حالات میں تھے ان سے پہلے پہل زندہ سلول CELLULE پیدا ہوئے۔

ان انتہائی چھوٹے زندہ موجودات نے تدریجاً تکامل وارتقاء شروع کیا اور ایک نوع سے دوسری نوع میں بدلتے ہوئے دریاؤں سے صحراؤں کی طرف اور وہاں سے ہوا اور فضا کی طرف منتقل ہوئے۔ اس طرح انواع و اقسام کی نباتات اور آبی و زمینی جانور اور پرندے وجود میں آئے۔

اس تکامل وارتقاء کی کامل ترین صورت یہی آج کا انسان ہے جو بندر سے مشابہ موجود سے اور بھی انسان نما بندر سے ظاہر ہوا

(ب): ثبوت انواع کا مفروضہ یا Fixism اس مفروضے کے مطابق جانداروں کی ہر نوع ابتداء ہی سے اسی موجودہ شکل میں ظاہر ہوئی اور کوئی نوع دوسری نوع میں تبدیل نہیں ہوئی اور فطرتاً انسان بھی مستقل خلقت کا حامل تھا کہ جو ابتداء سے اسی شکل وصورت میں پیدا ہوا۔

دونوں گروہوں کے سائنسدانوں نے اپنا نظریہ ثابت کرنے کے لیے بہت سے مطالب لکھے ہیں اور علمی محافل میں اس مسئلے پر بہت سے نزاع اور جھگڑے ہوئے ہیں ان جھگڑوں میں شدت اس وقت پیدا ہوئی جب لامارک (مشہور جانور شناس فرانسیسی سائنس دان جو اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہوا) اور اس کے بعد ڈارون (جانور شناس انگریز سائنسدان جو انیسویں صدی میں ہوا) نے تکامل انواع کے سلسلے میں اپنے نظریات نئے دلائل کے ساتھ پیش کیے۔

البتہ آج کی علوم طبیعی کی محافل میں شک نہیں کہ اکثریت تکاملِ انواع کے مفروضے کے حامی سائنس دانوں کی ہے۔

تکاملِ انواع کے حامیوں کے دلائل:

ان دلائل کو آسانی سے تین حصّوں میں خلاصہ کر کے بیان کیا جا سکتا ہے۔

(۱) پہلے وہ دلائل ہیں جو قدیم نباتات وحیوانات کے آثار کے علم PALEONTOLOGIE یعنی گذشتہ زندہ موجودات کے پتھرائے ہوئے ڈھانچوں کے مطالعہ کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں ان کا نظریہ ہے کہ زمین کے مختلف طبقوں کا مطالعہ

Marfat.com

نشاندہی کرتا ہے کہ زندہ موجودات نے سادہ تر شکلوں سے کامل تر اور زیادہ پیچیدہ شکلوں کی طرف تغیر کیا ہے۔
ان قدیم حیوانات و نباتات کے آثار میں پیش آنے والے فرق کی تفسیر فقط مفروضۂ تکامل کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔
۲۔ دوسری دلیل وہ قرائن ہیں جو علم تشریح Comparative Anotomy سے اخذ کیے گئے ہیں اس سلسلے میں وہ لمبی چوڑی بحثیں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس وقت مختلف جانوروں کی ہڈیوں کو جوڑنے کی تشریح کر کے ان کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا گیا تو ان کے درمیان بہت زیادہ مشابہت دکھائی دی۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ ان سب کی اصل اور بنیاد ایک ہی ہے۔
۳۔ ان کی تیسری دلیل وہ قرائن ہیں کہ جو جنین (Foetus) سے ہاتھ لگے ہیں ان کا نظریہ ہے کہ اگر جانوروں کا حالتِ جنین میں تقابلی جائزہ کیا جائے جبکہ انھوں نے ابھی ضروری تکامل حاصل نہ کیا ہو تو ہم دیکھیں گے کہ تکامل سے قبل جانور شکمِ مادر میں یا حالتِ نطفہ میں ایک دوسرے سے کس قدر مشابہت رکھتے ہیں یہ امر بھی نشاندہی کرتا ہے کہ سب کے سب ابتداء میں ایک ہی اصل سے لیے گئے ہیں۔

ثبوتِ انواع کے حامیوں کے جوابات

مفروضۂ ثبوتِ انواع (Fixism) کے حامی ان تمام دلائل کا ایک کلی جواب دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ان قرائن میں سے کوئی بھی اطمینان بخش نہیں ہے البتہ اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا ان تین طرح کے قرائن میں سے ہر ایک احتمالِ تکامل کو ایک "ظنی احتمال" کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن یقین ہرگز پیدا نہیں کرتا۔
واضح لفظوں میں مفروضۂ تکامل کو عقلی دلیل کے ذریعے ایک علمی اور قطعی قانون ثابت کرنا چاہیے یا محسوسات اور تجربے کے ذریعے اور ان دو کے علاوہ کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے۔
لیکن ایک طرف تو ہم جانتے ہیں کہ عقلی اور فلسفیانہ دلائل سے ان مسائل کو ثابت نہیں کیا جاسکتا اور دوسری طرف یہ مسائل کہ جن کی جڑیں لاکھوں برس قبل کے معاملات میں چھپی ہوئی ہیں ان تک تجربے کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا تجربے اور مشاہدے سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے وہ سطحی تغیرات ہیں جو زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ نباتات و حیوانات میں کسی اچانک تبدیلی جہش تاسیون کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں مثلاً عام بھیڑوں میں سے اچانک کوئی ایسی بھیڑ پیدا ہوتی ہے جس کی کھال عام بھیڑوں کی کھال سے مختلف ہوتی ہے۔ یعنی بہت نرم اور ملائم ہوتی ہے اور پھر اس کی کھال کی ان خصوصیات کی وجہ سے بھیڑوں کی ایک نسل گوسفند مرینوس کے نام سے پیدا ہوتی ہے۔
یا بعض جانوروں میں کسی تغیر کی وجہ سے آنکھ، ناخن، بدن یا کھال کے رنگ میں یا اس قسم کی کوئی اور تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے لیکن آج تک کوئی ایسی اچانک تبدیلی نہیں دیکھی گئی جو کسی حیوان کے بدن کے اصلی اعضاء میں کوئی اہم تغیر پیدا کر دے یا ایک نوع کو دوسری نوع میں تبدیل کر دے۔
اس بناء پر صرف ایک قیاس اور گمان ہی کیا جاسکتا ہے کہ پے در پے جست و خیز اور یکے بعد دیگرے تبدیلیوں کے ذریعے ہوسکتا ہے کبھی روز کسی حیوان کی نوع تبدیل ہو جائے مثلاً پیٹ کے بل زمین پر رینگنے والا جانور پرندے میں تبدیل ہو جائے

Marfat.com

لیکن یہ قیاس وتخمین ہرگز یقینی نہیں ہے بلکہ صرف ایک ظنی مسئلہ ہے کیونکہ ہم نے آج تک ایسے ناگہانی تغیرات کا تجربہ نہیں کیا جو اصلی اعضاء کو تبدیل کردیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ تبدیلِ نوع Transformism[1] کے حامیوں کی تین دلیلیں اس نظریے کو ایک مفروضے سے اوپر نہیں لے جاسکتیں اسی بناء پر اس نظریے پر دقتِ نظر سے بحث کرنے والے لوگ ہمیشہ اس پر تکاملِ انواع کے مفروضے کے طور پر گفتگو کرتے ہیں نہ کہ ایک قانون کے طور پر۔

مفروضۂ تکامل اور مسئلہ خداشناسی:

بہت سے لوگ اس مفروضے اور مسئلہ خداشناسی کے درمیان ایک قسم کا تضاد پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاید ایک لحاظ سے وہ حق بجانب بھی ہیں کیونکہ ڈارون کے نظریے نے اربابِ کلیسا اور اس مفروضے کے حامیوں کے درمیان ایک شدید جنگ چھیڑ دی ہے۔

اسی مسئلے کی بنیاد پر اس زمانے میں سیاسی اور اجتماعی وجوہات کی بنیاد پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے بہت پراپیگنڈا کیا گیا کہ ڈارونیسم خداشناسی سے مطابقت نہیں رکھتا۔

لیکن آج یہ مسئلہ ہمارے لیے واضح ہے کہ یہ دونوں امور آپس میں کوئی تضاد نہیں رکھتے یعنی چاہے مفروضۂ تکامل کو قبول کریں چاہے فقدانِ دلیل کے باعث اسے رد کریں دونوں صورتوں میں ہم خداشناس ہوسکتے ہیں۔

فرض کریں کہ مفروضۂ تکامل ثابت بھی ہوجائے تو وہ ایک ایسے قانونِ علمی کی شکل اختیار کرلے گا جو طبیعی علت ومعلول سے پردہ اٹھادے اور جانداروں اور دیگر موجودات کے درمیان اس علت ومعلول کے رابطے سے کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

کیا بارشوں کے نزول، سمندروں کے مدوجزر اور زلزلوں وغیرہ کے طبیعی علل معلوم ہونے سے خداشناسی کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی ہے؟ مسلماً نہیں۔ لہٰذا انواعِ موجودات کے درمیان ایک تکاملی وارتقائی رابطے کا انکشاف خداشناسی کے راستے میں مانع کیسے ہوسکتا ہے ایسی باتیں تو صرف وہ لوگ کرسکتے ہیں جن کا خیال ہے کہ عللِ طبیعی کا انکشاف وجودِ خدا قبول کرنے کے منافی ہے لیکن ہم آج اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان علل واسباب کا انکشاف نہ صرف یہ کہ عقیدہ توحید کو ضرر نہیں پہنچاتا بلکہ وہ تو وجودِ خدا کے اثبات کے نظامِ خلقت سے ہمارے لیے مزید دلائل مہیا کرتا ہے۔

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ خود ڈارون پر جب الحاد اور بے دینی کا الزام لگایا گیا تو اس نے اس کی تردید کی اور اصلِ انواع کے بارے میں اپنی کتاب میں تصریح کی کہ میں تکاملِ انواع کو قبول کرنے کے باوجود خداپرست ہوں۔ اصولی طور پر وجودِ خدا کو قبول کیے بغیر تکامل کی توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔

اس عبارت پر غور کریں۔

> وہ جانوروں کی مختلف انواع کے ظہور کے لیے عللِ طبیعی کو قبول کرنے کے باوجود ہمیشہ خدائے یگانہ پر ایمان رکھتا ہے اور تدریجاً جب اس کا سن آگے بڑھتا ہے تو اس میں مافوقِ بشر قدرت کو

Marfat.com

سمجھنے کا ایک خاص اندرونی احساس شدید تر ہوجاتا ہے اس حد تک کہ وہ انسان کے لیے معمائے آفرینش کو لاینحل سمجھتا ہے [1]

اصولی طور پر اس کا عقیدہ تھا کہ تکامل کے اس عجیب وغریب پیچ وخم میں انواع کی ہدایت اور ایک عام زندہ موجود کا ان مختلف انواع اور متنوع جانوروں میں تبدیل ہونا کسی عقلِ کل کی طرف سے حساب شدہ اور دقیق منصوبہ بندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور واقعاً ہے بھی ایسا ہی۔ کیا تنہا مادہ جو عام اور پست ہے ایسی تعجب خیز اور عجیب وغریب مشتقات کو ایک بے پایاں علم وقدرت کے سہارے کے بغیر کیسے وجود بخش سکتا ہے جبکہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی مفصل تشکیلات ہیں۔

نتیجہ یہ کہ یہ شور وغوغا بالکل بے بنیاد ہے کہ تکاملِ انواع کا نظریہ خداشناسی کے مسئلہ سے تضاد رکھتا ہے (چاہے ہم مفروضہ تکامل کو قبول کریں یا نہ کریں)۔

یہاں صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن نے پیدائشِ آدم کی جو مختصر تاریخ بیان کی ہے کیا تکاملِ انواع کا مفروضہ اس سے تضاد رکھتا ہے یا نہیں۔ اس کے بارے میں ہم ذیل میں بحث کریں گے۔

قرآن اور مسئلہ تکاملِ انواع

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ مسلمانوں میں تکاملِ انواع کے حامیوں اور مخالفوں دونوں نے اپنے مقصد کے اثبات کے لیے آیاتِ قرآن سے تمسک کیا ہے لیکن شاید دونوں نے بعض اوقات اپنے عقیدے اور نظریے کے زیرِ اثر ہو کر ایسی آیات سے استدلال کیا ہے کہ جو ان کے مقصود سے بہت کم ربط رکھتی ہیں۔ لہٰذا وہ دونوں طرف سے زیرِ بحث آنے والی آیات کا انتخاب پیش کرتے ہیں۔

اہم ترین آیت کہ جس کا تکامل کے طرف داروں نے سہارا لیا ہے سورہ آلِ عمران کی آیہ ۳۳ ہے۔

ان اللّٰہ اصطفٰی اٰدم و نوحًا و اٰل ابراھیم و اٰل عمران علی العٰلمین

اللہ نے آدم، نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران کو تمام جہانوں پر منتخب کیا۔

وہ کہتے ہیں کہ نوح، آلِ ابراہیم اور آلِ عمران ایک گروہ کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے اور ان میں سے چنے گئے۔ آدم کو بھی اسی طرح ہونا چاہیے یعنی ان کے زمانے میں بھی وہ انسان کہ جن پر "عالمین" کا اطلاق ہوتا ہے یقیناً موجود تھے اور آدم انہی میں سے چُنے گئے تھے یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ آدم روئے زمین کے پہلے انسان نہ تھے بلکہ قبل ازیں بھی دوسرے انسان موجود تھے اور حضرت آدمؑ کا امتیاز وہی ان کا فکری اور روحانی ارتقاء وتکامل ہے کہ جس کے سبب وہ اپنے جیسے افراد میں سے چنے گئے۔

اس نظریے کے حامیوں نے کچھ اور آیات بھی ذکر کی ہیں کہ جن میں سے بعض مسئلہ تکامل سے بالکل کوئی ربط نہیں رکھتیں اور ان کی تفسیر تکامل کے مفہوم میں کرنا زیادہ تر تفسیر بالرائے بن جاتی ہے۔

---

[1] دارون بسیم۔ تالیف محمود بہزاد صفحہ ۷۵، صفحہ ۷۶

Marfat.com

ان میں سے بعض آیات ایسی بھی ہیں کہ جو تکامل انواع کے مفہوم سے بھی مطابقت رکھتی ہیں، ثبوتِ انواع سے بھی اور آدم کی مستقل خلقت سے بھی۔ اسی بناء پر ہم نے بہتر سمجھا ہے کہ ان کے ذکر سے صرفِ نظر کیا جائے۔

باقی رہا وہ اعتراض جو اس استدلال پر کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ "عالمین" اگر معاصر لوگوں کے معنی میں ہو اور "اصطفیٰ" (چننا) یقیناً ایسے ہی اشخاص میں سے ہو تو پھر یہ استدلال قابلِ قبول ہو سکے گا لیکن اگر کوئی کہے کہ "عالمین" معاصرین اور غیر معاصرین سب کے لیے ہے تو اس صورت میں مندرجہ بالا آیت اس امر پر دلالت نہیں کرے گی جیسا کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث میں خاتونِ اسلام حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی فضیلت میں منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

اما ابنتی فاطمة فهی سیدة نساء العٰلمین من الاولین و الاٰخرین

باقی رہی میری بیٹی فاطمہ تو وہ اوّلین و آخرین کے سب جہانوں کی عورتوں کی سردار ہے۔

یہ بالکل اس طرح ہے کہ کوئی کہے کہ کچھ لوگوں کو خدا نے تمام ادوار کے انسانوں میں سے چن لیا ہے اور ان میں سے ایک آدم ہیں اس صورت میں ضروری نہیں کہ حضرت آدم کے زمانے میں دوسرے انسان بھی موجود ہوں کہ جن پر "عالمین" کا اطلاق ہو یا آدم ان میں سے چنے جائیں۔ خصوصاً جبکہ گفتگو خدا کے چننے کے بارے میں ہے کہ جو آئندہ آنے والی اور بعد کے زمانوں میں آنے والی نسلوں سے اچھی طرح آگاہ ہے[1]

لیکن اہم ترین دلیل جو ثبوتِ انواع کے حامیوں نے آیاتِ قرآن میں سے منتخب کی ہے وہ زیرِ بحث اور اس جیسی آیات ہیں کہ جو کہتی ہیں کہ خدا نے انسان کو خشک مٹی سے پیدا کیا کہ جو سیاہ رنگ بدبودار کیچڑ سے لی گئی تھی۔

یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ "انسان" کی خلقت کے موقع پر بھی یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے:

ولقد خلقنا الانسان من صلصال من حمإٍ مسنون (حجر: ۲۶)

نیز بشر کے بارے میں بھی یہ تعبیر آئی ہے:

واذ قال ربك للملٰٓئكة انی خالق بشرًا من صلصال من حمإٍ مسنون (حجر ۲۸)

نیز یہ بھی ہے کہ فرشتوں نے خود ذاتِ آدم کو سجدہ کیا اس سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے (سورۂ حجر کی آیات ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ جو سطور بالا میں ہم بیان کر آئے ہیں ان میں غور و فکر کیجیے)۔

پہلی نظر میں ان آیات کا ظاہری مفہوم یہی نکلتا ہے کہ آدم پہلے سیاہ رنگ کے کیچڑ سے پیدا ہوئے۔ اعضاء و جوارح کی تکمیل کے بعد ان میں خدائی روح پھونکی گئی اور اس کے ساتھ ہی ابلیس کے سوا تمام فرشتے ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

ان آیات کا طرزِ بیان نشاندہی کرتا ہے کہ آدم کی مٹی سے خلقت اور موجودہ شکل و صورت پیدا ہونے کے درمیان دیگر انواع موجود نہ تھیں۔

---

[1] یہ احتمال بھی ہے کہ ایک مختصر مدت میں اولادِ آدم پر مشتمل ایک معاشرہ تشکیل پا گیا ہو اور ان میں سے آدم برگزیدہ اور چنے ہوئے ہوں۔

Marfat.com

بعض مندرجہ بالا آیات میں " ثم " کی تعبیر آئی ہے یہ لفظ لغت عرب میں بافاصلہ ترتیب کے لیے استعمال ہوتا ہے یہ لفظ ہرگز لاکھوں سال گذرنے اور ہزاروں انواع کے موجود ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ کوئی مانع نہیں کہ یہ ایسے فاصلوں کی طرف اشارہ ہو جو آدم کی مٹی سے خلقت اور پھر خشک مٹی اور پھر روحِ الٰہی پھونکے جانے کے مراحل میں موجود تھے اسی لیے لفظ "ثم" عالمِ جنین میں انسان کی خلقت اور ان مراحل کے بارے میں آیا ہے جو جنین یکے بعد دیگرے طے کرتا ہے، مثلاً۔

یا ایها الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقنکم من تراب ثم من نطفة ثم من علقة ثم من مضغة...... ثم نخرجکم طفلاً ثم لتبلغوا اشدکم

اے لوگو! اگر تمھیں بعث وقیامت کے بارے میں شک ہے (تو انسانوں کی خلقت کے بارے میں قدرتِ خدا پر غور و فکر کرو کہ) ہم نے تمھیں خاک سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر مضغہ (گوشت کے چبائے ہوئے ٹکڑے) سے .... پھر ہم تمھیں بچے کی شکل میں باہر نکالتے ہیں پھر تم مرحلۂ بلوغ تک پہنچتے ہو۔ (حجر ـــ ۵)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ضروری نہیں کہ "ثم" ایک طولانی فاصلے کے لیے آئے بلکہ جیسے یہ طولانی فاصلوں کے لیے استعمال ہوتا ہے ویسے ہی مختصر فاصلوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے اس سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ آیاتِ قرآن نے براہِ راست مسئلہ تکامل یا ثبوتِ انواع کو بیان نہیں کیا۔ لیکن (بالخصوص انسان کے بارے میں) آیات کا ظاہری مفہوم مستقل خلقت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اگرچہ اس کے بارے میں کامل صراحت نہیں ہے لیکن خلقتِ آدم سے متعلقہ آیات کا ظاہر زیادہ مستقل خلقت کے مفہوم کے گرد گردش کرتا ہے البتہ دیگر جانوروں کے بارے میں قرآن خاموش ہے۔

Marfat.com

۴۵۔ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ○
۴۶۔ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ ○
۴۷۔ وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ ○
۴۸۔ لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ ○
۴۹۔ نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ○
۵۰۔ وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ ○

ترجمہ :

۴۵۔ پرہیزگار (بہشت کے سرسبز) باغوں اور اس کے سرچشموں کے کنارے ہوں گے۔
۴۶۔ (خدا کے فرشتے ان سے کہیں گے) امن و سلامتی کے ساتھ ان باغوں میں داخل ہو جاؤ۔
۴۷۔ ہم ان کے سینوں سے ہر قسم کا غل (حسد، کینہ، عداوت اور خیانت) اتار لیں گے (اور ان کی روح پاک کر دیں گے) اس حالت میں کہ سب بھائی بھائی بن کر تختوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوں گے۔
۴۸۔ انھیں ہرگز کوئی خستگی اور تکان نہ ہوگی اور انھیں اس سے کبھی بھی نہیں نکالا جائے گا۔
۴۹۔ میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ میں غفور و رحیم ہوں۔
۵۰۔ نیز (انھیں بتا دو کہ) میرا عذاب اور سزا دردناک ہے۔

تفسیر

بہشت کی آٹھ نعمتیں

گذشتہ آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ خدا نے کس طرح تفصیل سے شیطان اور اس کے ساتھیوں، ہمجولیوں اور پیروکاروں کا نتیجہ کاریاں کیا ہے اور ان کے سامنے جہنم کے سات دروازے کھولے ہیں۔

Marfat.com

قرآن کی روش ہے کہ وہ موازنہ پیش کر کے تعلیم و تربیت کے لیے استفادہ کرتا ہے اسی روش کے مطابق ان آیات میں بہشت، اہل بہشت، مادی اور معنوی نعمات اور جسمانی و روحانی عنایات کے بارے میں گفتگو ہے۔ درحقیقت ان آیات میں آٹھ عظیم مادی و معنوی نعمات کا تذکرہ بہشت کے دروازوں کی تعداد کے مطابق آیا ہے۔

۱۔ پہلے ایک عظیم مادی نعمت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: پرہیزگار بہشت کے سرسبز باغوں میں ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشموں کے کنارے ہوں گے (ان المتقین فی جنٰت وعیون)۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ یہاں تمام صفات میں سے صرف "تقویٰ" کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہی تقویٰ، پرہیزگاری تعہد اور مسئولیت کہ جس میں تمام عمدہ انسانی صفات جمع ہیں۔

"جنٰت وعیون" کا صیغہ جمع کے ساتھ ذکر ہوا ہے یہ طرح طرح کے باغات، فراواں چشموں اور گوناگوں بہشتوں کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں سے ہر ایک کا ایک نیا لطف ہے اور خاص خصوصیت ہے۔

۲، ۳ اس کے بعد دو اہم معنوی نعمات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہیں "سلامتی" اور "امن"۔ ہر قسم کے رنج، ناراضی اور تکلیف سے سلامتی اور ہر قسم کے خطرے سے امن و امان۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ کے فرشتے انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان باغوں میں کامل سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ (ادخلوھا بسلٰمٍ اٰمنین)۔

بعد والی آیت میں تین اور معنوی نعمات کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔

۴۔ ہم ان کے سینوں سے ہر قسم کا حسد، کینہ، عداوت اور خیانت دھو دیں گے اور ایسی آلائشیں ان سے دور کر دیں گے (ونزعنا ما فی صدورھم من غلٍ[1])۔

۵۔ اور وہ یوں ہوں گے جیسے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان کے درمیان محبت کا انتہائی قریبی تعلق کارفرما ہے (اخوانًا)۔

۶۔ اس حالت میں کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے تختوں پر بیٹھے ہوں گے (علی سررٍ متقٰبلین[2])۔

ان کی اجتماعی نشستیں اس دنیا کے تکلیف دہ تکلفات کی طرح نہیں ہیں۔ ان مجلس میں کوئی اوپر اور کوئی نیچے ہے۔ اس دنیا کی المناک طبقاتی زندگی کا کوئی اصول وہاں نہیں ہے وہاں سب آپس میں بھائی ہیں سب ایک دوسرے کے آمنے سامنے

---

[1] "غل"، دراصل کسی چیز کے مخفیانہ نفوذ کے معنی میں ہے اسی لیے حسد، کینہ اور دشمنی کو جو چپکے سے انسانی روح میں نفوذ کر جاتے ہیں انھیں "غل" کہا جاتا ہے۔ لہٰذا "غل" ایک وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ جس میں بہت سی بری اور خلافِ اخلاق صفات شامل ہیں (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد سوم صفحہ ۱۱۸ اردو ترجمہ کے حاشیے کی طرف رجوع کریں)۔

[2] "سرر"، "سریر" کی جمع ہے جو دراصل تخت، کرسی یا اس قسم کی کسی چیز کے معنی میں ہے کہ جس پر بیٹھتے ہیں اور خوشی کی محفلیں برپا کرتے ہیں (توجہ رہے کہ "سرر" اور "سرور" ایک ہی مادہ سے ہیں)۔

Marfat.com

اور ایک ہی صف میں ہیں ایسا نہیں کہ کوئی تو مجلس میں بالا نشین ہے اور دوسرا جوتے اتارنے کی جگہ پر بیٹھا ہے۔
البتہ یہ امر معنوی درجات مختلف ہونے کے منافی نہیں ہے یہ تو ان کی اجتماعی نشستوں سے مربوط ہے ورنہ ہر ایک کا اپنے تقویٰ و ایمان کے لحاظ سے اپنا مقام ہے۔

۷۔ اس کے بعد ساتویں مادی اور معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے انھیں ہرگز کوئی خستگی اور تکان لاحق نہ ہوگی (لا یمسھم فیھا نصب)۔

جبکہ اس دنیا میں آرام کے ایک دن سے پہلے اور بعد کتنی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے کہ جن کا تصور انسان کے راحت و آرام کو درہم برہم کر دیتا ہے ایسا وہاں نہیں ہے۔

۸۔ اسی طرح انھیں فنا اور نعمت کے ختم ہو جانے کا خیال بھی نہیں ستاتا کیونکہ "وہ ہرگز ان پرمسرت نعمتوں سے بھرے ہوئے باغوں سے باہر نہیں نکلیں گے" (وما ھم منھا بمخرجین)۔

اب جبکہ بہشت کی فراواں اور دل انگیز نعمتوں کا مؤثر طریقے سے بیان ہو چکا اور یہ بتایا جا چکا کہ وہ کاملاً متقین کے سپرد ہوں گی تو اس بات کے پیش نظر کہیں گنہ گار افراد اس غم واندوہ میں ڈوب کر نہ رہ جائیں کہ اے کاش! ہم بھی ان نعمتوں تک پہنچ سکتے ——— اس مقام پر رحمان ورحیم خدا ان کے لیے بھی جنت کے دروازے کھولتا ہے مگر مشروط طور پر۔

بہت محبت بھرے لہجے میں اور نوازشات کے نہایت اعلیٰ انداز میں اپنے پیغمبر کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے کہتا ہے : اے نبی! میرے بندوں کو آگاہ کر دو کہ میں غفور ورحیم ہوں۔ گناہ بخشنے والا اور محبت سے معمور ہوں (نبئ عبادی انی انا الغفور الرحیم)۔

"عبادی" (میرے بندے) یہ ایک لطیف تعبیر ہے کہ جو ہر انسان کو اشتیاق دلاتی ہے اور اس کے بعد خدا کی یہ توصیف کہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس اشتیاق کو اوج کمال تک پہنچا دیتی ہے۔

لیکن قرآن چونکہ ہمیشہ رحمتِ الٰہی کے مظاہر سے سوءِ استفادہ کو روکتا ہے لہٰذا اس کے ہلا دینے والے جملوں کے ذریعے اس کے خشم وغضب کا ذکر ہے یہ اس لیے ہے تاکہ خوف ورجا کے درمیان اعتدال برقرار رہے کیونکہ یہ تکامل وارتقاء اور تربیت کا راز ہے۔ لہٰذا بغیر کسی فاصلے کے فرمایا گیا ہے : میرے بندوں سے یہ بھی کہہ دو کہ میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے (وان عذابی ھو العذاب الالیم)۔

چند اہم نکات :

۱۔ **بہشت کے باغ اور چشمے :** ہمارے لیے کہ جو اس محدود دنیا میں ہیں نعمات بہشت کو سمجھنا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ کیونکہ اس جہان کی نعمتیں ان نعمتوں کے مقابلے میں ایسے ہی ہیں جیسے تقریباً صفر کے مقابلے میں ایک بہت بڑا عدد۔ لیکن یہ امر اس میں رکاوٹ نہیں کہ اپنی فکر اور روح کے ذریعے انھیں محسوس کریں یہ بات مسلّم ہے کہ بہشت کی نعمتیں

Marfat.com

بہت ہی متنوع ہیں۔ لفظ "جنّت" (باغات) جو مندرجہ بالا اور دیگر بہت سی آیات میں آیا ہے۔ اسی طرح لفظ "عیون" (چشمے) اس حقیقت کے گواہ ہیں۔

البتہ قرآن میں (سورۂ دہر، الرحمٰن، دخان اور محمد وغیرہ میں) ان چشموں کی مختلف انواع کی طرف اشارہ ہوا ہے اور مختصر اشارات کے ذریعے ان کی تنوع کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جو شاید اس جہان کے طرح طرح کے نیک کاموں کی مجسم ہونے کی طرف اشارہ ہو۔ انشاء اللہ ان سورتوں کی تفسیر میں ہم ان کا تفصیلی ذکر کریں گے۔

۲۔ **مادی اور روحانی نعمتیں:** برخلاف اس کے کہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں قرآن نے ہر جگہ لوگوں کو مادی نعمتوں کی بشارت نہیں دی بلکہ بارہا گفتگو میں روحانی نعمتوں کا ذکر بھی آیا ہے مندرجہ بالا آیات اس کا واضح نمونہ ہیں اس طرح سے فرشتے اہلِ بہشت کو اس عظیم مرکزِ نعمت میں خوش آمدید کہتے ہوئے جو پہلی بشارت دیں گے وہ سلامتی اور امن کی بشارت ہے۔

کینوں کا سینوں سے دھل جانا اور بری صفات مثلاً حسد، خیانت وغیرہ کہ جو روحِ اخوت کو ختم کر دیتی ہیں کا خاتمہ اور اسی طرح غلط قسم کے تکلفاتی امتیازات کہ جو فکر و روح کا سکون برباد کر دیتے ہیں کا حذف ہو جانا یہ سب ان معنوی و روحانی نعمتوں میں سے ہے کہ جن کی طرف مندرجہ بالا آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ امن و سلامتی کہ جس کا ذکر نعماتِ بہشت کے آغاز میں ہوا ہے ہر دوسری نعمت کی بنیاد ہے کیونکہ ان دو کے بغیر کوئی نعمت قابلِ استفادہ نہیں ہے یہاں تک کہ اس دنیا میں بھی تمام نعمتوں کا نقطۂ آغاز امن و سلامتی کی نعمت ہے۔

۳۔ **کینہ اور حسد اخوت کے دشمن ہیں:** یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ امن و سلامتی کے ذکر کے بعد زیرِ نظر آیات میں نعمت اخوت کے ذکر سے پہلے تمام مزاحم صفات مثلاً کینہ، حسد، غرور اور خیانت کی ریشہ کشی کا ذکر ہوا ہے لفظ "غل" بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے اس کے ذریعے ان سب کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

درحقیقت اگر انسان کا دل اس "غل" سے پاک نہ ہو امن و سلامتی کی نعمت بھی حاصل نہ ہوگی اور نہ ہی اخوت و برادری کی نعمت بلکہ ہمیشہ جنگ و جدال اور کشمکش جاری رہے گی اور رشتۂ اخوت منقطع ہوگا اور امن و سلامتی چھن جائے گی۔

۴۔ **جزائے کامل:** بعض مفسرین کے بقول جزا تب مکمل ہوتی ہے جب اس میں یہ چار شرطیں موجود ہوں:

۱۔ فائدہ دکھائی دینے والا ہو　۲۔ احترام کے ساتھ ہو　۳۔ ہر قسم کی پریشانی سے خالی ہو　۴۔ دائمی ہو

مندرجہ بالا آیات میں نعماتِ بہشت کے لیے ان چاروں پہلوؤں کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

"ان المتقین فی جنّت وعیون" پہلی قسم کے لیے ہے۔

"ادخلوھا بسلٰم اٰمنین" احترام و تعظیم کی دلیل ہے۔

"ونزعنا ما فی صدورھم من غل اخوانا علیٰ سرر متقٰبلین" ہر قسم کی پریشانی، ناراضی اور روحانی تکلیف کی نفی کی طرف اشارہ ہے۔

"لا یمسھم فیھا نصب" جسمانی نقصان اور ضرر کی نفی کے متعلق ہے۔

Marfat.com

"وما هم منها بمخرجین" آخری شرط پوری کرتا ہے یعنی ان نعمتوں کے لیے مدام ہے لہذا یہ جزا ہر لحاظ سے مکمل ہوگی۔[1]

۵۔ **آئیے اس دنیا میں تعمیر جنت کریں:** مندرجہ بالا آیات میں جنت کی جن مادی اور معنوی صفات کی تصویر کشی کی گئی ہے اس جہان کی نعمتوں کے اہم اصول بھی یہی ہیں گویا قرآن ہمیں یہ نکتہ سمجھانا چاہتا ہے کہ دنیاوی زندگی میں یہ نعمتیں فراہم کر کے تم بھی اس عظیم جنت کی ایک چھوٹی سی نظیر قائم کر سکتے ہو۔

— اگر سینوں کو کینوں اور عداوتوں سے پاک کر لو۔

— اگر اخوت و برادری کے اصول کو تقویت دو۔

— اگر غیر ضروری طبقاتی تکلفات و تشریفات کو اپنی زندگی سے خصوصاً اجتماعی زندگی سے دور کر لو۔

— اگر امن و سلامتی اپنے معاشرے کو لوٹا دو۔

— اگر تمام لوگوں کو یہ اطمینان دلا دیا جائے کہ کوئی شخص ان کی عزت و آبرو، مقام و حیثیت اور جائز مفادات سے مزاحم نہیں ہوگا اور انہیں اپنی نعمات کے بقاء کا اطمینان ہو تو ——— یہ دن ایک ایسا دن ہوگا جب جنت کی نظیر تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوگی۔

---

[1] تفسیر کبیر، فخر الدین رازی جلد ۱۹ صفحہ ۱۹۳

Marfat.com

۵۱۔ وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ۝
۵۲۔ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ط قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ۝
۵۳۔ قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ۝
۵۴۔ قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ
تُبَشِّرُونَ ۝
۵۵۔ قَالُوا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ ۝
۵۶۔ قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ۝
۵۷۔ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ۝
۵۸۔ قَالُوا إِنَّا أُرْسِلْنَا إِلَىٰ قَوْمٍ مُجْرِمِينَ ۝
۵۹۔ إِلَّا آلَ لُوطٍ ط إِنَّا لَمُنَجُّوهُمْ أَجْمَعِينَ ۝
۶۰۔ إِلَّا امْرَأَتَهُ قَدَّرْنَا إِنَّهَا لَمِنَ الْغَابِرِينَ ۝

ترجمہ

۵۱۔ اور انھیں (میرے بندوں کو) ابراہیم کے مہمانوں کی خبر دے۔
۵۲۔ جس وقت وہ اس کے پاس پہنچے اور سلام کیا (تو ابراہیم نے) کہا: ہم تم سے خوفزدہ ہیں۔
۵۳۔ انھوں نے کہا: ڈرو نہیں، ہم تجھے ایک دانا اور عالم بیٹے کی بشارت دیتے ہیں۔
۵۴۔ اس نے کہا: کیا مجھے بشارت دیتے ہو حالانکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں (تو پھر) کس چیز کی بشارت دیتے ہو۔
۵۵۔ انھوں نے کہا: ہم سچی بشارت دیتے ہیں، مایوس لوگوں میں سے نہ ہو۔
۵۶۔ اس نے کہا: اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہوں کے علاوہ کون مایوس ہوتا ہے۔

Marfat.com

۵۷۔ (پھر اس نے) کہا: اے فرستادگانِ الٰہی! تم کس کام کے لیے مامور کیے گئے ہو۔

۵۸۔ وہ کہنے لگے: ہماری ذمہ داری گنہ گار قوم سے متعلق ہے کہ انھیں ہلاک کریں۔

۵۹۔ سوائے خاندانِ لوط کے کہ ان سب کو بچا لیں گے۔

۶۰۔ البتہ اس کی بیوی کہ ہم نے طے کیا ہے کہ وہ (شہر میں) پیچھے رہ جانے والوں (اور ہلاک ہونے والوں) میں سے ہو۔

تفسیر

انجانے مہمان

ان آیات میں اور ان سے بعد والی کچھ آیات میں عظیم انبیاء اور ان کی سرکش امتوں کی تاریخ کا ایک تربیتی حصہ ہے اس میں خدا کے مخلص بندوں اور شیطان کے پیروکاروں کی زندگی کے واضح نمونے ہیں۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کے واقعہ سے شروع کی گئی ہے (وہی فرشتے کہ جو آپ کے پاس انسانی لباس میں آئے تھے پہلے انھوں نے آپ کو ایک ذی وقار بیٹے کی پیدائش کی بشارت دی اور پھر قوم لوط کے دردناک انجام کی خبر دی)۔

قبل کی دو آیتوں میں پیغمبرِ اسلامؐ کو حکم دیا کہ بندوں کو مقامِ رحمت خدا کے بارے میں بھی بتائیں اور اس کے دردناک عذاب کے متعلق بھی۔ اب حضرت ابراہیم کے مہمانوں کے واقعے میں ان مذکورہ دو صفحات کے دو زندہ نمونے دکھائی دیتے ہیں اس طرح گذشتہ آیات اور ان آیات کے درمیان ربط واضح ہو جاتا ہے۔

پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے: میرے بندوں کو ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں خبر دو (و نبئهم عن ضيف ابراهيم)۔

اگرچہ "ضیف" یہاں مفرد کی صورت میں آیا ہے لیکن جیسا کہ بعض عظیم مفسرین نے کہا ہے "ضیف" مفرد اور جمع دونوں کے معنی رکھتا ہے (ایک مہمان اور کئی مہمان)۔

یہ بن بلائے مہمان وہی فرشتے تھے جنھوں نے "ابراہیم کے پاس پہنچ کر پہلے انجانے طور پر اسے سلام کیا" (اذ دخلوا عليه فقالوا سلامًا)۔

جیسا کہ ایک بزرگوار میزبان کا فریضہ ہے، ابراہیم نے ان کی پذیرائی کا اہتمام کیا فوراً ان کے لیے مناسب غذا فراہم کی لیکن جب دسترخوان بچھایا گیا تو انجانے مہمانوں نے غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ تو حضرت ابراہیم کو اس پر وحشت ہوئی۔ انھوں نے اپنی پریشانی چھپائی نہیں۔ صراحت سے ان سے کہا، ہم تم سے خوفزدہ ہیں" (قال انا منكم وجلون)[۱]۔

---

[۱] اگرچہ مندرجہ بالا آیات میں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے پذیرائی کی اور مہمانوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

یہ خوف اس رواج کی بناء پر تھا کہ اس زمانے میں اور بعد میں بھی بلکہ ہمارے زمانے تک بعض قوموں کا معمول ہے کہ جب کوئی شخص کسی کا نان و نمک کھا لیتا ہے تو اسے ضرر نہیں پہنچاتا اور اپنے آپ کو اس کا ممنونِ احسان سمجھتا ہے لہٰذا کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے کو بُرا سمجھتا ہے اور اسے کینہ و عداوت کی دلیل شمار کیا جاتا ہے۔

لیکن زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پریشانی سے نکال دیا اور "اس سے کہا: ڈرو نہیں ہم تجھے ایک عالم و دانا بیٹے کی بشارت دیتے ہیں"۔ (قالوا لا توجل انا نبشرك بغلام عليم)۔

یہ غلام علیم (صاحب علم لڑکے) سے کون مراد ہے، قرآن کی دیگر آیات کو سامنے رکھتے ہوئے واضح ہو جاتا ہے کہ اس سے مراد اسحاق ہیں کیونکہ فرشتوں نے جب حضرت ابراہیمؑ کو یہ بشارت دی تو ان کی بیوی سارہ جو بظاہر ایک بانجھ عورت تھی وہ بھی موجود تھی انھوں نے اسے بھی یہ بشارت دی جیسا کہ سورۂ ہود کی آیہ ۱۷ میں ہے۔

وامرأته قائمة فضحكت فبشرناها باسحاق

اس کی بیوی کھڑی تھی، وہ ہنسی اور ہم نے اسے اسحاق کی بشارت دی۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ سارہ حضرت اسحاق کی والدہ تھیں۔ قبل ازیں حضرت ابراہیم حضرت ہاجرہ سے صاحب اولاد تھے حضرت اسماعیل ان کے فرزند تھے (حضرت ہاجرہ وہ کنیز تھیں جنھیں حضرت ابراہیم نے زوجیت کے لیے انتخاب کیا تھا) لیکن حضرت ابراہیم اچھی طرح جانتے تھے کہ طبیعی اصولوں کے لحاظ سے ان سے ایسے بیٹے کی پیدائش بہت بعید ہے اگرچہ خدا کی قدرت کاملہ کے لیے کوئی چیز محال نہیں ہے مگر انھوں نے معمول کے طبیعی قوانین کی طرف توجہ نے ان کے تعجب کو ابھارا لہٰذا انھوں نے کہا مجھے ایسی بشارت دیتے ہو حالانکہ میں بڑھاپے کی عمر کو پہنچ گیا ہوں۔ (قال ابشرتموني على ان مسني الكبر)۔

واقعاً مجھے کس چیز کی بشارت دے رہے ہو (فبم تبشرون)۔

کیا تمھاری یہ بشارت حکم الٰہی سے ہے یا خود تمھاری طرف سے ہے صراحت سے کہو تاکہ مجھے زیادہ اطمینان ہو۔

"مسني الكبر" (مجھے بڑھاپے نے مس کیا ہے) یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بڑھاپے کے آثار میرے سفید بالوں اور چہرے کی جھریوں سے نمایاں ہیں اور اس کے آثار میں اپنے سارے وجود میں محسوس کرتا ہوں۔

ممکن ہے کہا جائے کہ اس لحاظ سے ابراہیم ایک اچھے تجربے سے گذرے تھے کہ بڑھاپے میں ہی ان کے بیٹے اسماعیل پیدا ہوئے تھے لہٰذا نئے بیٹے یعنی حضرت اسحاق کی پیدائش کے بارے میں انھیں تعجب نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن معلوم ہونا چاہیے، کہ بعض مفسرین کے بقول حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق کی پیدائش میں دس سال سے زیادہ فاصلہ تھا لہٰذا بڑھاپے میں دس سال گذر جائیں تو بچے کی پیدائش کا احتمال بہت ہی کم ہوتا ہے۔

ثانیاً اگر کوئی واقعہ خلافِ معمول ہو اگرچہ استثنائی طور پر ہو۔ اس سے مشابہ مواقع پر تعجب کرنے سے مانع نہیں ہے

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) لیکن جیسا کہ سورۂ ہود کی آیہ ۶۹ اور ۷۰ میں ہم پڑھ چکے ہیں یہی تھا۔ (تفسیر نمونہ جلد ۹ میں مذکورہ آیات کی تفسیر ملاحظہ کیجیے)۔

Marfat.com

کیونکہ ایسے سن و سال میں بچے کی پیدائش بہرحال ایک امر عجیب ہے۔[1]

بہرحال فرشتوں نے حضرت ابراہیم کو تردد یا زیادہ تعجب کا موقع نہ دیا۔ اور ان سے صراحت و قاطعیت سے کہا ہم تجھے حق کے ساتھ بشارت دے رہے ہیں (قالوا بشرنك بالحق)۔ وہ بشارت کہ جو خدا کی طرف سے ہے اور اس کے حکم سے ہے۔ اسی بناء پر یہ حق ہے اور مسلم ہے۔

اس کے بعد اس لیے کہ مبادا ابراہیم مایوس و ناامید ہوں تاکید کے طور پر کہنے لگے: اب جبکہ ایسا ہے تو مایوس ہونے والوں میں سے نہ ہو (فلا تكن من القانطين)۔

لیکن ابراہیمؑ نے فوراً ان کے اس خیال کو دُور کر دیا کہ ان پر مایوسی اور رحمتِ خدا سے ناامیدی کا غلبہ نہیں ہے اور واضح کیا کہ یہ تو صرف طبعی معمولات کے حوالے سے تعجب ہے، لہٰذا صراحت سے کہا: گمراہوں کے سوا اپنے پروردگار کی رحمت سے کون مایوس ہوگا (قال ومن يقنط من رحمة ربه الا الضالون)۔

وہی گمراہ کہ جنھوں نے خدا کو اچھی طرح نہیں پہچانا اور اس کی بے پایاں قدرت پر ان کی نگاہ نہیں۔ وہ خدا کہ جو مشتِ خاک سے ایسا عجیب و غریب انسان پیدا کرتا ہے اور ناچیز نطفہ سے ایک مکمل بچہ وجود میں لاتا ہے خرمے کا خشک درخت جس کے حکم سے پھل سے لد جاتا ہے اور جلانے والی آگ جس کے حکم سے گلزار ہو جاتی ہے کون شخص ایسے پروردگار کی قدرت میں شک کرے یا اس کی رحمت سے مایوس ہو۔

بہرحال یہ بشارت سننے کے بعد ابراہیمؑ اس خیال میں پڑ گئے کہ ان خاص حالات میں یہ فرشتے انھیں صرف بیٹے کی بشارت دینے نہیں آئے۔ یقیناً یہ کسی نہایت اہم کام پر مامور ہیں اور یہ بشارت تو ان کی ماموریت کا ایک پہلو ہے لہٰذا ان سے پوچھنے لگے: اے فرستادگانِ الٰہی! بتاؤ کہ تم کس اہم ذمہ داری کے لیے بھیجے گئے ہو؟ (قال فما خطبكم ايها المرسلون)۔

انھوں نے کہا: ہم ایک گنہ گار قوم کے لیے بھیجے گئے ہیں (قالوا انا ارسلنا الى قوم مجرمين)۔

چونکہ وہ جانتے تھے کہ حضرت ابراہیم جستجو اور تحقیق کے بارے میں اپنی خو کی وجہ سے وہ بھی خصوصاً ایسے مسائل میں اتنے جواب پرس نہیں کریں گے۔ لہٰذا انھوں نے فوراً مزید فرمایا: یہ مجرم قوم لوط کے سوا کوئی اور نہیں ہے ہم مامور ہیں کہ اس بے شرم آلودہ گناہ قوم کو نیست و نابود کر دیں، سوائے خاندانِ لُوط کے کہ جسے ہم ہلاکت سے بچا لیں گے (الا ال لوط انا لمنجوهم اجمعين)۔

لیکن "اجمعین" کی تاکید کے ساتھ "آلِ لوط" کی تعبیر تمام گھر والوں کے بارے میں تھی یہاں تک کہ ان کی بیوی کہ جو مشرکین کی ہم کار تھی اور شاید ابراہیم بھی اس ماجرے سے آگاہ تھے لہٰذا انھوں نے بلا فاصلہ استثناء کرتے ہوئے کہا: سوائے اس کی بیوی کے کہ ہم نے طے کیا ہے کہ وہ شہر میں رہ جانے والوں کے ساتھ فنا سے دوچار ہو گی اور نجات حاصل نہ کر سکے گی۔

---

[1] بعض مفسرین نے کہا ہے کہ پہلے بیٹے اسماعیل کی پیدائش کے وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۹۹ سال تھی اور اسحاق کی ولادت کے وقت آپ ۱۱۲ سال کے تھے۔

Marfat.com

(الا امرأتہ قدرنا انھا لمن الغٰبرین)۔

"قدرنا" (ہم نے مقدر کیا ہے)، یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ ہم اس سلسلے میں خدا کی طرف سے ماموریت رکھتے ہیں۔

فرشتوں کا حضرت ابراہیم سے ملاقات کرنا، انھیں ولادتِ اسحاق کی خوشخبری دینا اور اس طرح ان سے قوم لوط کے بارے میں گفتگو کرنا ——— ان سب امور پر ہم سورہ ہود کی آیات ۶۹ تا ۷۶ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں [1]

---

[1] تفسیر نمونہ جلد نہم میں ملاحظہ فرمائیے۔

Marfat.com

۶۱۔ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ۙ○

۶۲۔ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ○

۶۳۔ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ○

۶۴۔ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○

۶۵۔ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ
اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ○

۶۶۔ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ
مُّصْبِحِيْنَ ○

۶۷۔ وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○

۶۸۔ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۙ○

۶۹۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ○

۷۰۔ قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○

۷۱۔ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ۭ○

۷۲۔ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○

۷۳۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ۙ○

۷۴۔ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ
سِجِّيْلٍ ۭ○

۷۵۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ○

Marfat.com

۷۶۔ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ○
۷۷۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۶۱۔ جس وقت (خدا کے) بھیجے ہوئے خاندانِ لُوط کے پاس آئے۔

۶۲۔ (لوط نے) کہا تم انجانے افراد ہو۔

۶۳۔ انھوں نے کہا: ہم تیرے پاس وہی چیز لائے ہیں کہ جس کے بارے میں وہ (کافر) شک و تردّد کرتے تھے (ہم عذاب پر مامور ہیں)۔

۶۴۔ ہم تیرے پاس حقیقتِ مسلّمہ لائے ہیں اور ہم سچ کہتے ہیں۔

۶۵۔ لہٰذا رات کے آخری پہر اپنے گھر والوں کو ساتھ لے اور یہاں سے نکل پڑ۔ تو ان کے پیچھے پیچھے چل تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور جہاں کے لیے تھیں کہا گیا ہے وہاں چلے جاؤ۔

۶۶۔ اور ہم نے لُوط کو وحی کی کہ صبح کے وقت ان سب کی جڑ اکھاڑ پھینکی جائے گی۔

۶۷۔ (دوسری طرف) اہلِ شہر ان کے آنے کا پتہ چل گیا اور وہ لُوط کے گھر کی طرف آئے جبکہ وہ ایک دوسرے کو خوشخبری دے رہے تھے۔

۶۸۔ (لُوط نے) کہا: یہ میرے مہمان ہیں میری آبرو نہ گنواؤ۔

۶۹۔ خدا سے ڈرو اور مجھے شرمندہ نہ کرو۔

۷۰۔ وہ کہنے لگے: کیا ہم نے تجھے دنیا والوں (کے اِدھر آنے) سے روکا نہ تھا۔

۷۱۔ اس نے کہا: اگر تم صحیح کام انجام دینا چاہتے ہو تو میری بیٹیاں حاضر ہیں (ان سے شادی کر لو اور گناہ کی قباحت سے بچو)۔

۷۲۔ تیری جان کی قسم! وہ اپنی مستی میں سرگرداں ہیں اور اپنی عقل و شعور گنوا بیٹھے ہیں۔

۷۳۔ آخر کار طلوعِ آفتاب کے وقت (صاعقہ یا زمین کے لرزنے کی صورت میں ایک ہولناک) چنگھاڑ نے اُنھیں گھیر لیا۔

Marfat.com

۷۴۔ اس کے بعد (ان کے شہر اور آبادی کو ہم نے زیر و زبر کر دیا) وہ تہہ و بالا ہو گئے اور ہم نے ان پر پتھروں کی بارش فرمائی۔

۷۵۔ اس (عبرت انگیز سرگذشت) میں سمجھ داروں کے لیے نشانیاں ہیں۔

۷۶۔ اور (قافلوں کے) راستوں میں ان کے ویرانے ہمیشہ کے لیے برقرار ہیں۔

۷۷۔ اس میں ایمان داروں کے واسطے نشانیاں ہیں۔

تفسیر

قوم لُوط کے گنہ گاروں کا انجام

گذشتہ آیات میں ہم نے ان فرشتوں کی حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات کا حال پڑھا جو قوم لُوط پر عذاب کے لیے مامور تھے زیر نظر آیات میں ہم ان کے حضرت ابراہیمؑ کے پاس سے چلے آنے اور حضرت لُوط پاس آنے کا حال پوچھیں گے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جس وقت فرستادگانِ الٰہی خاندانِ لُوط کے پاس آئے (فلما جاء ال لوطِ المرسلون)۔ تو لُوط نے ان سے فرمایا "تم اجنبی لوگ ہو" (قال انکم قوم منکرون)۔

مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت لوط علیہ السّلام نے ان سے یہ بات اس لیے کہی کہ وہ بہت خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں ان کے پاس آئے تھے اور ہو سکتا ہے کہ ان کا آنا آپ کے لیے ایک مشکل کا باعث بن جاتا۔ ایک طرف وہ مہمان تھے محترم تھے اور ان کا آنا مبارک تھا اور دوسری ماحول انتہائی شرمناک اور مشکلات سے پُر تھا اسی لیے سُورۂ ہود کی آیات میں یہی واقعہ جو کسی اور مناسبت سے آیا ہے وہاں "سیءَ بھم" کے الفاظ آئے ہیں یعنی یہ امر خدا طرف سے اس پیغمبر کے لیے سخت ناگوار تھا اور وہ ان کے آنے سے پریشان ہوئے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بہت سخت ہے۔

لیکن فرشتوں نے انھیں زیادہ دیر انتظار میں نہ رکھا اور صراحت کے ساتھ کہا کہ ہم تیرے پاس ایسی چیز لے کر آئے ہیں جس میں وہ شک رکھتے تھے۔ (قالوا بل جئنٰک بما کانوا فیہ یمترون) یعنی ہم اس دردناک عذاب کے لیے مامور ہیں جس کے بارے میں تو انھیں تنبیہ کر چکا ہے لیکن انھوں نے اسے کبھی بھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔

اس کے بعد انھوں نے بطور تاکید کہا: "ہم تیرے لیے مسلّم اور ناقابلِ تردید حقیقت لائے ہیں" یعنی ہم اس بے ایمان اور منحرف قوم کے لیے حتمی عذاب اور قطعی سزا لے کر آئے ہیں (واتینٰک بالحق)۔

پھر انھوں نے مزید تاکید کے لیے کہا: "ہم یقیناً سچ کہہ رہے ہیں" (وانا لصٰدقون)۔

یعنی یہ قوم اپنے لوٹنے کے تمام راستے تباہ کر چکی ہے اور ان کی شفاعت کا موقع اب باقی نہیں رہا یہ اس لیے کہا کہ کہیں لُوط ان کی سفارش کے لیے نہ سوچنے لگیں اور جان لیں کہ یہ لوگ اب ہرگز شفاعت کی اہلیت نہیں رکھتے۔

Marfat.com

نیز ضروری تھا کہ مومنین کا چھوٹا سا گروہ (کہ جو ان کی بیوی کے سوا باقی اہلِ خاندان پر مشتمل تھا) اس ہلاکت انگیزی سے بچ جائے لہٰذا انھوں نے حضرت لُوطؑ کو ضروری احکامات دیئے، کہنے لگے: رات کے وقت جب یہ گنہ گار لوگ سو جائیں یا شراب و شہوت میں مست ہو جائیں تم اپنے خاندان کو لے کر شہر سے باہر نکل جاؤ (فاسر باھلك بقطع من الليل)۔ لیکن "تم ان کے پیچھے پیچھے رہنا" تاکہ ان کی نگرانی کر سکو کہ ان میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے (واتبع ادبارھم)۔ "نیز تم میں سے کوئی بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے" (ولا يلتفت منكم احد)۔ "اور اسی مقام (شام یا کوئی دوسرا علاقہ جہاں کے لوگ اس آلودگی سے پاک ہیں) کی طرف چلے جاؤ" (وامضوا حيث تؤمرون)۔

اس کے بعد گفتگو کا لب و لہجہ بدل جاتا ہے اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے "ہم نے لُوطؑ کو اس امر کی وحی کی کہ دمِ صبح سب کی ریشہ کنی ہو جائے گی"، یہاں تک کہ ان میں سے ایک فرد بھی نہیں بچے گا۔ (وقضينا اليه ذلك الامر ان دابر هؤلاء مقطوع مصبحين)۔

غور کیجیے گا۔

قرآن اس واقعے کو یہیں چھوڑ کر ابتدا کی طرف لوٹتا ہے اور واقعے کا وہ حصہ جو ایک مناسبت کی وجہ سے وہاں رہ گیا تھا کہ جس کا ہم بعد میں ذکر کریں گے، اسے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: شہر والوں کو جب لوط کے پاس آنے والے نئے مہمانوں کا پتہ چلا تو وہ ان کے گھر کی طرف چل پڑے، راستے میں وہ ایک دوسرے کو خوشخبری دیتے تھے (وجاء اهل المدينة يستبشرون)، گمراہی کی شرمناک وادی میں بھٹکنے والے ان افراد کا خیال تھا کہ گویا تر مال ان کے ہاتھ آگیا ہے خوبصورت اور خوش رنگ نوجوان اور وہ بھی لوط کے گھر میں۔

"اهل المدينة"، کی تعبیر نشاندہی کرتی ہے کہ کم از کم شہر کے بہت سے لوگ ٹولیوں میں حضرت لوطؑ کے گھر کی طرف چل پڑے۔ اس سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک بے شرم، ذلیل اور جسور تھے، خصوصاً لفظ "يستبشرون" (ایک دوسرے کو بشارت دیتے تھے) ان کی آلودگی کی گہرائی کی حکایت کرتا ہے کیونکہ یہ ایک ایسا شرمناک عمل ہے کہ شاید کسی نے اس کی نظیر جانوروں میں بھی بہت ہی کم دیکھی ہوگی اور یہ عمل اگر کوئی انجام دیتا بھی ہے تو کم از کم چھپ چھپا کر اور احساسِ شرمندگی کے ساتھ ایسا کرتا ہے لیکن یہ بدکار کمینہ صفت قوم کھلم کھلا ایک دوسرے کو مبارکباد دیتی تھی۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب ان کا شور و غل سنا تو بہت گھبرائے اور مضطرب ہوئے انھیں اپنے مہمانوں کے بارے میں بہت خوف ہوا کیونکہ ابھی تک وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ مہمان مامورینِ عذاب ہیں اور قادر و قاہر خدا کے فرشتے ہیں لہٰذا وہ ان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: یہ میرے مہمان ہیں، میری آبرو نہ گنواؤ" (قال ان هؤلاء ضيفي فلا تفضحون)۔ یعنی اگر تم خدا، پیغمبر اور جزاء و سزا کے مسئلہ سے صرف نظر کر لو تو بھی کم از کم یہ انسانی مسئلہ ہے اور یہ بات تو سب انسانوں میں چاہے مومن ہوں یا کافر، موجود ہے کہ وہ مہمانوں کا احترام کرتے ہیں تم کیسے انسان ہو کہ اتنی سی بات بھی

Marfat.com

نہیں مانتے ہو۔ اگر تمھارا کوئی دین نہیں تو کم از کم آزاد انسان تو بنو۔

اس کے بعد آپ نے مزید کہا: آؤ خدا سے ڈرو اور مجھے میرے مہمانوں کے سامنے شرمسار نہ کرو (و اتقوا اللہ ولا تخزون)[1]

لیکن وہ، وہ بہت جسور اور منہ پھٹ تھے بجائے اس کے کہ وہ شرمندہ ہوتے کہ انھوں نے اللہ کے پیغمبر لوطؑ سے کیسا مطالبہ کیا ہے الٹا اس طرح سے پیش آئے جیسے لوط سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے انھوں نے زبانِ اعتراض درازکی اور کہنے لگے: کیا ہم نے تجھ سے نہ کہا تھا کہ دنیا والوں کو اپنے ہاں مہمان نہ ٹھہرانا اور کسی کو اپنے ہاں نہ آنے دینا (قالوا اولم ننھک عن العٰلمین)۔

تم نے اس کی خلاف ورزی کیوں کی اور ہمارے کہنے پر عمل کیوں نہ کیا۔

یہ اس بناء پر تھا کہ یہ قوم انتہائی کم ظرف اور کنجوس تھی یہ لوگ ہرگز کسی کو اپنے ہاں مہمان نہیں ٹھہراتے تھے اور اتفاق سے ان کے شہر قافلوں کے راستے میں پڑتے تھے کہتے ہیں کہ انھوں نے یہ کام بعض آنے والوں کے ساتھ اس لیے کیا کہ کوئی اُن کے ہاں ٹھہرے نہ۔ آہستہ آہستہ ان کی عادت بن گیا لہٰذا جب حضرت لوط کو شہر میں کسی مسافر کے آنے کی خبر ہوتی تو اسے اپنے گھر میں دعوت دیتے تاکہ وہ کہیں ان کے چنگل میں نہ پھنس جائے ان لوگوں کو جب اس کا پتہ چلا تو بہت سیخ پا ہوئے اور حضرت لوط سے کھل کر کہنے لگے کہ تھیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اب تم کسی مہمان کو اپنے گھر لے جاؤ۔

لہٰذا یوں لگتا ہے کہ زیرِ نظر آیت میں لفظ "عالمین" مسافروں اور ایسے افراد کی طرف اشارہ ہے جو اس شہر اور علاقے کے رہنے والے نہ تھے اور ان کا صرف وہاں سے گزر ہوتا تھا۔

بہر حال جب حضرت لوطؑ نے ان کی یہ جسارت اور کمینگی دیکھی تو انھوں نے ایک طریقہ اختیار کیا تاکہ انھیں خوابِ غفلت اور انحراف و بے حیائی کی مستی سے بیدار کر سکیں۔ آپ نے کہا: تم کیوں انحراف کے راستے پر چلتے ہو اگر تمھارا مقصد جنسی تقاضوں کو پورا کرنا ہے تو جائز اور صحیح طریقے سے شادی کر کے انھیں پورا کیوں نہیں کرتے، یہ میری بیٹیاں ہیں (میں تیار ہوں کہ انھیں تمھاری زوجیت میں دے دوں) اگر تم صحیح کام انجام دینا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے (قال ھٰؤلاء بنتی ان کنتم فٰعلین)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت لوط کی تو چند ایک بیٹیاں تھیں اور ان افراد کی تعداد زیادہ تھی لیکن مقصد یہ تھا کہ ان پر

---

[1] "فضیحت" اصل لغت میں کسی چیز کے منکشف ہو جانے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ عیب ظاہر ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ فارسی میں اس کا متبادل "رسوا کردن" (رسوا کرنا) ہے۔ گویا لوطؑ چاہتے ہیں کہ انھیں سمجھائیں کہ تمھارا یہ کام ان مہمانوں کے سامنے میری آبرو خاک میں ملا دیگا اور یہ سمجھیں گے کہ میرے شہر گناہوں میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں۔

لیکن "خزی" دراصل دور کرنے کے معنی میں ہے بعد ازاں شرمندگی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ گویا لوط چاہتے تھے کہ ان مہمانوں کے سامنے مجھے شرمندہ نہ کرو اور انھیں مجھ سے دور نہ کرو۔

Marfat.com

اتمامِ حجت کیا جائے اور کہا جائے کہ میں اپنے مہمانوں کے احترام اور حفاظت اور تمھیں برائی کی دلدل سے نکالنے کے لیے اس حد تک ایثار کے لیے تیار ہوں ۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ "هٰؤلاء بنٰتی" سے مراد شہر کی بیٹیاں ہیں اور روحانی باپ کے اعتبار سے انھوں نے سب کو اپنی بیٹیاں کہا ہے لیکن پہلی تفسیر آیت کے معنی کے زیادہ نزدیک ہے ۔

بغیر کہے واضح ہے کہ حضرت لوطؑ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنی بیٹیاں گمراہ مشرکین کی زوجیت میں دے دیں بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ آؤ! ایمان لے آؤ اور اس کے بعد میں اپنی بیٹیاں تمھارے عقد میں دے دوں گا ۔

لیکن افسوس ــــــــ شہوت، انحراف اور ہٹ دھرمی کے اس عالم میں ان میں ذرہ بھر بھی انسانی اخلاق اور جذبہ باقی ہوتا تو کم از کم اس امر کے لیے کافی تھا کہ وہ شرمندہ ہوتے اور پلٹ جاتے مگر نہ صرف یہ کہ وہ شرمندہ نہ ہوئے بلکہ اپنی جسارت میں اور بڑھ گئے اور چاہا کہ حضرت لوطؑ کے مہمانوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں ۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ روئے سخن رسولِ اسلامؐ کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: تیری جان اور زندگی کی قسم! وہ اپنی مستی میں سخت سرگرداں تھے (لعمرك انهم لفي سكرتهم يعمهون) ۔

سورہ ہود میں اسی قسم کی بحث کے بعد ہے کہ فرشتوں نے اپنی ماموریت سے پردہ اٹھایا اور حضرت لوطؑ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: ڈریئے نہیں یہ لوگ آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتے ۔

سورہ قمر آیہ ۳۷ میں ہے کہ جب ان کی جسارت اور بڑھ گئی اور انھوں نے مہمانوں پر تجاوز کا مصمم ارادہ کر لیا تو ان کی آنکھیں اندھی ہو گئیں ۔ قرآن کے الفاظ میں ۔

ولقد راودوه عن ضيفه فطمسنا اعينهم

(انھوں نے ان کے مہمانوں کے بارے میں ناجائز خواہش کی تو ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں)

بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک فرشتے نے مٹھی بھر مٹی ان کے چہروں پر پھینک دی تو وہ سب اندھے ہو گئے (اور چیختے چلاتے پلٹ گئے) ۔

اس مقام پر اس قوم کے بارے میں خدا تعالیٰ کی گفتگو انتہاء کو پہنچ جاتی ہے وہ دو چچی تلی اور مختصر آیات میں ان کا منحوس انجام بڑے قاطع تباہ کن اور عبرت انگیز صورت میں بیان کرتا ہے اور کہتا ہے: آخر کار طلوعِ آفتاب کے وقت وحشت ناک چنگھاڑ نے ان سب کو گھیر لیا (فاخذتهم الصيحة مشرقين) ۔

یہ "صیحہ" ہو سکتا ہے کہ ایک عظیم صاعقہ یا وحشت ناک زلزلہ کی آواز ہو ۔ بہرحال ایک بہت بڑی چنگھاڑ تھی ۔ اس کی وحشت سے سب کے سب بے ہوش ہو گئے یا مر گئے ۔

ہم جانتے ہیں کہ آواز کی لہریں جب ایک معین حد سے بڑھ جائیں تو تکلیف دہ اور وحشت ناک ہوتی ہیں اور اس سے بھی بڑھ جائیں تو انسان کو بے ہوش کر دیتی ہیں یا پھر موت کا سبب بن جاتی ہیں یہاں تک کہ ہو سکتا ہے کہ وہ عمارتوں کو تباہ کر دیں ۔

Marfat.com

لیکن ـــــــ ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان کے شہر کو ہم نے بالکل زیر و زبر کر دیا اور عمارتوں کے اوپر والے حصے نیچے اور نیچے والے اوپر کر دیئے (فجعلنا عالیھا سافلھا)۔

ان کے لیے یہ عذاب بھی کافی نہ تھا۔ اس پر ہم نے ان پر پتھریلے کنکروں کی بارش برسائی (وامطرنا علیھم حجارۃ من سجیل)۔

پتھروں کی یہ بارش ہو سکتا ہے ان لوگوں کے لیے ہو جو اس وقت وحشت ناک چنگھاڑ سے نابود نہیں ہوئے تھے یا جو اسی گرمی و عذاب میں مبتلا نہیں ہوئے تھے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ناپاک اجساد اور ناپاک آثار کو محو کرنے کے لیے ہو شہر کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ پتھروں کی اس بارش کے بعد کوئی شخص اس علاقے سے گزرتا تو آسانی سے باور نہیں کر سکتا تھا کہ کبھی اس علاقے میں ایک شہر آباد تھا۔

یہ تین عذاب (وحشت ناک چنگھاڑ، شہر کا تہہ و بالا ہونا اور پتھروں کی بارش) کیوں تھے جبکہ ان میں سے ہر ایک اس قوم کو ہلاک کرنے کے لیے کافی تھا۔

ایسا یا تو ان کے گناہ کی شدت اور بے حیائی میں ان کے جسور ہونے کی بناء پر تھا یا دوسروں کے لیے عبرت کی خاطر اللہ نے ان پر عذاب کو کئی گنا کر دیا۔

یہ وہ مقام ہے جہاں قرآن تربیتی اور اخلاقی نتیجہ حاصل کرتے ہوئے کہتا ہے: اس واقعے میں باہوش لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیٰت للمتوسمین) وہ جو اپنی خاص فراست و دانائی کی وجہ سے ہر علامت سے واقعہ ہر اشارے سے حقیقت اور ہر نکتے سے اہم تربیتی مطلب اخذ کر لیتے ہیں[1]

لیکن یہ تصور نہ کریں کہ ان کے آثار بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ نہیں "قافلوں اور راہ گیروں کے لیے ہمیشہ برقرار ہیں" (وانھا لبسبیل مقیم)۔

اگر تم باور نہیں کرتے تو اٹھ کھڑے ہو اور ان تباہ حال شہروں کے ویرانوں کو جا کر دیکھو کہ جو شام کے ایک راستے پر مدینہ جانے والے مسافروں کے لیے موجود ہیں، دیکھو اور ان میں غور کرو، عبرت حاصل کرو، خدا کی طرف پلٹ آؤ، راہِ توبہ اختیار کرو اور اپنے قلب و روح کو غلاظتوں سے پاک کر لو۔

تاکید مزید کے لیے اور اہلِ ایمان کو اس عبرت انگیز داستان میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرماتا ہے: اس واقعے میں اہلِ ایمان کے لیے نشانیاں ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیۃ للمؤمنین)۔

کیسے ممکن ہے کہ کوئی صاحبِ ایمان یہ ہلا دینے والا واقعہ پڑھے اور اس سے عبرت حاصل نہ کرے۔

---

[1] "متوسم" "وسم" (بروزن "رسم") کے مادہ سے اثر کرنے کے معنی میں ہے اور "متوسم" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو تھوڑے سے نشان سے حقیقت معلوم کر لیتا ہے فارسی میں اس کے ہم معنی الفاظ ہوشیار، صاحبِ فراست اور بازکاوت ہیں۔

Marfat.com

"سجیل" سے کیا مراد ہے، اس گناہ گار قوم پر پتھروں کی بارش کیوں برسی ؟ ان کے شہر تہ و بالا کیوں ہوئے۔ نزولِ عذاب صبح کے وقت کیوں ہوا ؟ خاندانِ لوط سے کیوں کہا گیا کہ پلٹ کر نہ دیکھیں اور قوم لوط کا اخلاق ——— ان سب امور کے لیے سورہ ہود کی تفسیر میں ہم کافی بحث کر چکے ہیں۔

(تفسیر نمونہ جلد ۹ ص تا ص اُردو ترجمہ ملاحظہ کیجیے)

چند اہم نکات

۱۔ "قطع من اللیل" سے کیا مُراد ہے ؟: "قطع"، "رات کی تاریکی" کے معنی میں ہے۔

مرحوم طبرسی مجمع البیان میں کہتے ہیں :

گویا "قطع"، "قطعة" کی جمع ہے لہٰذا مذکورہ بالا آیت میں اس سے مراد رات کا زیادہ حصّہ ہے۔

لیکن مفردات میں راغب کے بقول معلوم ہوتا ہے کہ "قطع" "قُطعة" کے معنی میں ہے اور مفرد ہے۔

البتہ بہت سے مفسرین کے بقول یہ لفظ رات کے آخری حصّے اور وقتِ سحر کے معنی میں ہے۔ شاید یہ تفسیر قرآن کی بعض دوسری آیات کی بناء پر ہے کہ جو صراحت سے آلِ لوط کے بارے میں کہتی ہیں

نجيناهم بسحر

ہم نے انھیں وقتِ سحر نجات دی (قمر ——— ۳۴)

یعنی اس وقت کہ جب شہوت پرست آلودہ دامن لوگ خوابِ غفلت میں ڈوبے ہوئے تھے، شراب، غرور اور شہتی کی مستی ان کے وجود پر چھائی ہوئی تھی اور آلِ لوط کے شہر سے نکلنے کے لئے فضا بالکل سازگار تھی پس وہ نکل کھڑے ہوئے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ انھیں تباہ کرنے والی سزا اور عذاب کی ابتداء بھی دمِ صبح طلوعِ آفتاب کے وقت ہوئی شاید یہ وقت اس لیے منتخب کیا گیا کہ جب حضرت لوط کے گھر پر یورش کرنے والے اندھے ہوگئے اور گھروں کو لوٹ گئے تو ممکن تھا کہ کچھ نہ کچھ سوچ میں پڑجائیں لہٰذا رات انھیں مہلت کے طور پر دی گئی کہ شاید وہ توبہ کرلیں اور تلافی کا راستہ اختیار کریں۔

بعض روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جب گھروں کو لوٹ گئے تو ان میں سے بعض نے قسم کھائی کہ ہم صبح خاندانِ لوطؑ کے کسی فرد کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام کرتے، عذابِ الٰہی نے انھیں کاٹ کر رکھ دیا۔[1]

۲۔ "و امضوا حيث تؤمرون" کی تفسیر : ہم بتا چکے ہیں کہ فرشتوں نے خاندانِ لُوط کو نصیحت کی کہ آخر شب اس علاقے کی طرف چلے جائیں جہاں کا تمھیں حکم دیا گیا ہے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۲ صفحہ ۳۸۵۔

Marfat.com

اس جگہ کے بارے میں آیاتِ قرآن میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اس بارے میں مفسرین نے بہت سی مختلف باتیں کی ہیں۔

بعض نے کہا ہے کہ ان سے کہا گیا کہ سرزمین شام کی طرف چلے جائیں کہ جہاں کا ماحول نسبتاً پاک تھا۔

بعض نے کہا ہے کہ فرشتوں نے ایک خاص بستی کا ذکر کیا اور انھیں نصیحت کی کہ وہاں چلے جائیں۔

تفسیر المیزان میں اس جملے سے یہ استفادہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے راستے کے لیے ایک طرح کی الٰہی ہدایت اور حتمی راہنمائی رکھتے تھے اور وہ اس کے مطابق چلے۔

۲۔ "متوسم" اور "مؤمن" کے درمیان واسطہ: مندرجہ بالا آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ کبھی فرمایا گیا ہے کہ قوم لوط کے عبرت انگیز انجام میں "متوسمین" کے لیے نشانیاں ہیں اور کبھی ارشاد ہوتا ہے "مؤمنین" کے لیے۔ ان دونوں تعبیروں کے درمیان ہم آہنگی دکھائی دیتی ہے وہ یہ کہ حقیقی "مومنین"، "متوسم" ہوتے ہیں یعنی صاحب فراست، فوراً بات کی تہہ تک پہنچ جانے والے اور بہت سمجھ دار ہوتے ہیں۔

ایک روایت میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ سے "ان فی ذٰلک لاٰیٰت للمتوسمین" کی تفسیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؑ نے فرمایا:

اس سے مراد اُمتِ اسلامی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا:

قال رسول اللّٰہ: اتقوا فراسة المؤمن، فانه ینظر بنور اللّٰہ عز وجل

رسول اللہؐ نے فرمایا: مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ نورِ الٰہی سے دیکھتا ہے[1]

امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

متوسمین آئمہ ہیں[2]

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

رسولِ اکرمؐ متوسم تھے، ان کے بعد میں ہوں اور میرے بعد میری اولاد اور ذرّیت میں سے امام ہیں[3]

۴۔ شہوت و غرور کی مستی: اگرچہ شراب کی مستی مشہور ہے لیکن شراب سے بالاتر مستیاں بھی پیدا ہوتی ہیں ان میں سے مقام و منصب، شہرت اور خواہش نفسانی کی مستی ہے۔ مذکورہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کی جان کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ لوگ اپنی مستی میں سرگرداں ہیں اور انتہائی واضح راہِ نجات بھی انھیں سجھائی نہیں دیتی۔ معاملہ یہاں تک جا پہنچتا ہے کہ حضرت لوطؑ جیسے عظیم پیغمبر اپنی بیٹیاں ان کے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں تاکہ وہ اپنی نفسانی خواہشات کو حلال و مشروع

---

[1]، [2]، [3] نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۲۳۔

Marfat.com

طریقے سے پورا کر سکیں اور آلودگیٔ گناہ اور شرمناک زندگی سے نجات پا سکیں لیکن وہ پھر بھی ان کی بات کو ٹھکرا دیتے ہیں۔

ضمنی طور پر یہ پیغمبر بزرگوار ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ مفاسد کو روکنے کے لیے صرف نفی پر بس نہ کی جائے بلکہ اثبات کا بھی سہارا لیا جائے یعنی انسان کے فطری تقاضے صحیح طور پر پورے ہونے چاہییں تا کہ وہ خرابی کی طرف مائل نہ ہوں اگرچہ قوم لوط کے فاسد افراد ایسے تھے جن پر یہ مثبت طریقہ اثر انداز نہ ہوا لیکن عام طور پر یہ طریقہ بہت زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

جب ہم غلط اور غیر صحیح سرگرمیوں کو روکنا چاہیں تو پہلے ہمیں لوگوں کے لیے صحیح اور درست سرگرمیاں فراہم کرنا چاہییں۔

یہ امر جاذب نظر ہے کہ بعض روایات میں ہے کہ حضرت لوط جیسے با استقامت پیغمبر تقریباً تیس سال اس پست اور کمینہ خصلت قوم میں تبلیغ کرتے رہے لیکن ان کے گھر والوں کے سوا کوئی ان پر ایمان نہ لایا (اور اس میں بھی ان کی بیوی مستثنیٰ ہے)[1]

یہ تمام استقامت کس قدر پُر شکوہ ہے وہ بھی ایسے کمینہ خصلت لوگوں میں جن میں انسان ایک گھنٹہ بھی زندگی گذارے تو عاجز آجائے اور کس قدر تکلیف دہ ہے ایسی بیوی کے ساتھ زندگی گذارنا۔

سورہ ذاریات کی آیہ ۳۵، ۳۶ میں ہے:

فاخرجنا من کان فیھا من المؤمنین فما وجدنا فیھا غیر بیت من المسلمین

ہم نزولِ بلا سے پہلے اس زمین سے ان تمام افراد کو نکال لے گئے جو ایمان لائے تھے لیکن وہاں ایک اہلِ ایمان خاندان کے علاوہ کوئی موجود نہ تھا۔

یہاں بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خدائی عذاب کبھی بھی خشک و تر دونوں کو نہیں جلاتا یہاں تک کہ اگر ایک سچا مومن اور احساسِ ذمہ داری رکھنے والا مومن ہو تو اسے بھی نجات بخشتا ہے۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۳۸۲۔

Marfat.com

۷۸۔ وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ۝
۷۹۔ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝
۸۰۔ وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝
۸۱۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ۝
۸۲۔ وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ۝
۸۳۔ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ۝
۸۴۔ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝

ترجمہ

۷۸۔ اصحاب ایکہ (سرسبز سرزمین والے شعیب کی قوم) یقیناً ستم گر قوم تھی۔
۷۹۔ ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان دونوں (قوم لوط اور اصحاب ایکہ) کے تباہ شدہ شہر سرراہ آشکار ہیں۔
۸۰۔ اصحاب الحجر (قوم ثمود) نے مرسلین کی تکذیب کی۔
۸۱۔ ہم نے ان کے لیے اپنی آیات بھیجیں لیکن انھوں نے اُن سے روگردانی کی۔
۸۲۔ وہ پہاڑوں کے اندر اپنے امن و امان والے گھر تراشتے تھے۔
۸۳۔ لیکن آخر کار (ہلاکت آفرین) چنگھاڑ نے صبح کے وقت انھیں آگھیرا۔
۸۴۔ اور جو کچھ وہ حاصل کر چکے تھے وہ عذاب الٰہی سے نجات کے لیے ان کے کام نہ آیا۔

تفسیر

دو ظالم قوموں کا انجام:

ان آیات میں قرآن دو گزشتہ اقوام کی سرگذشت کی طرف اشارہ کرتا ہے ایک کو "اصحاب الایکۃ" کہا گیا ہے اور دوسری کو "اصحاب الحجر"۔ ان میں گذشتہ آیات میں قوم لُوط کے بارے میں جو عبرت انگیز مباحث آئی ہیں انکی تکمیل کی گئی ہے

Marfat.com

پہلے ارشاد ہوتا ہے : یقیناً اصحاب الایکہ ظالم اور ستم گر لوگ تھے (وان کان اصحٰب الایکۃ لظٰلمین)[1]۔ اور ہم نے ان سے انتقام لیا اور ان کی ستم گریوں اور سرکشیوں پر انھیں عذاب دیا (فانتقمنا منھم)۔

ان لوگوں کا علاقہ اور قومِ لوط کہ جس کی داستان گزر چکی ہے، کی سرزمین تمھارے راستے میں واضح طور پر موجود ہے (وانھما لبامام مبین)۔

پس آنکھیں کھولو، ان کا انجام دیکھو اور اس سے عبرت حاصل کرو۔

اصحاب ایکہ کون ہیں ؟

بہت سے مفسرین اور اربابِ لغت کہتے ہیں کہ "ایکہ" کا معنی ہے باہم جڑے ہوئے درخت یا جنگل اور "اصحاب الایکہ" وہی قومِ شعیب ہے جو حجاز و شام کے درمیان سرسبز و شاداب زمین پر آباد تھی۔

ان کی زندگی بہت خوشحال تھی، ان کے پاس فراواں دولت تھی اسی لیے انھیں غفلت و غرور نے گھیر لیا۔ خاص طور پر وہ کم فروشی اور فتنہ و فساد میں مبتلا ہو گئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر نے انھیں متنبہ کیا اور توحید و راہِ حق کی دعوت دی لیکن جیسا کہ ہم نے سورۂ ہود کی آیات میں دیکھا ہے انھوں نے حق کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا اور آخرکار دردناک عذاب کے ذریعے نیست و نابود ہو گئے کئی روز تک وہ نہایت سخت گرمی کا شکار رہے۔ آخری روز بادلوں کے جھنڈ کے جھنڈ آسمان پر چھا گئے انھوں نے بادل کے سایے میں پناہ لی لیکن ایک زبردست بجلی زمین پر ٹوٹ پڑی اور ان ظالموں کو نیست و نابود کر گئی۔

شاید قرآن نے "اصحٰب الایکۃ" (درختوں سے بھری ہوئی زمین والے) اس لیے کہا ہے کہ وہ چاہتا ہے کہ یہ سب نعمتیں ہم نے انھیں بخشی تھیں۔ اس کے باوجود انھوں نے شکرانِ نعمت کی بجائے کفرانِ نعمت کیا اور ظلم و ستم کی بنیاد رکھی اور صاعقہ نے انھیں اور ان کے درختوں کو ختم کر دیا۔

ان کے حالات کی مزید تفصیل سورۂ شعراء کی آیہ ۱۷۶ تا ۱۹۰ کے ذیل میں حضرت شعیبؑ کے حوالے سے آئے گی۔

ضمناً توجہ رہے کہ ہو سکتا ہے "فانتقمنا منھم" (ہم نے انھیں سزا دی) ——— قوم لوط اور "اصحاب الایکہ" دونوں کی طرف اشارہ ہو کیونکہ اس جملے کے بعد فوراً یہ عبارت آئی ہے۔

وانھما لبامام مبین

ان دونوں کا علاقہ تمھارے سامنے آشکار ہے۔

"انھما لبامام مبین" کی یہی تفسیر مشہور ہے کہ یہ شہر لوط اور اصحاب الایکہ کے شہر کی طرف اشارہ ہے "امام" "راستہ" اور "جادہ" کے معنی میں ہے۔ (کیونکہ یہ مادہ "ام" سے لیا گیا ہے جو قصد کرنے کے معنی میں ہے اور کیونکہ انسان مقصد تک پہنچنے کے لیے راستوں سے گذرتا ہے)۔

---

[1] لفظ "ان" اس آیت میں شرطیہ نہیں ہے بلکہ "مثقلہ" سے "مخففہ" ہے اور تقدیر میں اس طرح۔

انہ کان اصحٰب الایکۃ لظٰلمین

Marfat.com

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ " امام مبین " سے مراد لوحِ محفوظ ہے اس کے لیے انھوں نے سورۂ یٰس کی آیہ ۱۲ کو قرینے کے طور پر پیش کیا ہے لیکن یہ احتمال بہت ہی بعید ہے کیونکہ قرآن چاہتا ہے کہ لوگوں کو درسِ عبرت دے اور یہ دونوں نام لوحِ محفوظ میں ہوں تو لوگ ان سے اثر نہیں لے سکتے۔

جبکہ یہ شہر قافلوں اور پاس سے گذرنے والے مسافروں کے راستے میں ہوں تو ان پر گہرا اثر مرتب کر سکتے ہیں وہ ایک لمحہ کے لیے وہاں رک جائیں، غور و فکر کریں۔ ان کا عبرت ہیں دل اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھے اور اس آفت زدہ زمین کو آئینہ عبرت سمجھے، کبھی قوم لوط کی سرزمین کے پاس اور کبھی اصحاب الایکہ کے علاقے کے نزدیک اور آخر کار ان کے انجام پر آنکھوں سے سیلابِ اشک بہائیں۔

رہے " اصحاب الحجر" ——— تو یہ وہی سرکش قوم کہ جو حجر نامی علاقے میں رہتی تھی، بہت خوش حال تھی۔ ان کے عظیم پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام ان کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے۔ ان کے بارے میں قرآن کہتا ہے: اصحابِ حجر نے خدا کے بھیجے ہوؤں کی تکذیب کی (ولقد کذب اصحاب الحجر المرسلین)۔

اس کے بارے میں کہ یہ شہر کہاں واقع ہے، بعض مفسرین اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ یہ شہر مدینہ اور شام کے درمیان قافلوں کی راہ میں " وادی القریٰ" میں "تیمہ " کے جنوب میں پڑتا تھا، اور آج تقریباً اس کا کوئی اثر و نشان باقی نہیں ہے کہتے ہیں کہ یہ شہر گذشتہ زمانے میں عربوں کے تجارتی شہروں میں سے تھا یہ شہر اتنا اہم تھا کہ بطلیموس نے تجارتی شہروں میں لکھا ہے اور روم کے معروف جغرافیہ دان پلین نے اس کا نام " حجری " لکھا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ ہجرت کے نویں سال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکرِ روم کے مقابلے کے لیے تبوک کی طرف لشکر کشی کی تو مجاہدینِ اسلام اس مقام پر ٹھہرنا چاہتے تھے۔ پیغمبر اکرمؐ نے منع کیا اور فرمایا:

یہ وہی قوم ثمود کا علاقہ ہے جس پر عذابِ الٰہی نازل ہوا تھا۔[1]

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن اصحاب الحجر کے بارے میں (اور اسی طرح قوم نوح، قوم شعیب اور قوم لوط کے بارے میں سورۂ شعراء کی آیات ۱۰۵، ۱۲۳ اور ۱۶۰ میں بالترتیب اور دیگر گزشتہ قوموں کے بارے میں) کہتا ہے کہ انھوں نے " پیغمبروں کی تکذیب کی " حالانکہ ظاہراً ان کے پاس ایک سے زیادہ پیغمبر نہیں آئے اور انھوں نے صرف اسی کی تکذیب کی تھی۔

یہ تعبیر شاید اس بناء پر ہو کہ انبیاء کا پروگرام اور ہدف اس طرح سے ایک دوسرے سے پیوستہ تھا کہ ان میں سے ایک کی تکذیب ان سب کی تکذیب تھی۔

بعض نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ان قوموں کے کئی پیغمبر تھے جن میں سے ایک زیادہ معروف تھا لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

---

[1] اعلام القرآن خزائلی ص ۲۹۲

Marfat.com

بہرحال قرآن اصحاب الحجر کے بارے میں اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے ان کے لیے اپنی آیات بھیجیں لیکن انھوں نے روگردانی کی (واٰتینٰھم اٰیٰتنا فکانوا عنھا معرضین)۔

لفظ "اعراض" (منہ پھیرنا) نشاندہی کرتا ہے کہ وہ ان آیات کو سننے یا ان پر نگاہ ڈالنے کے لیے بھی تیار نہیں تھے۔

جبکہ اس کے برعکس اپنی دنیاوی زندگی کے کاموں میں اس قدر سخت کوش تھے کہ "اپنے لیے پہاڑوں میں امن کے گھر تراشتے تھے" (وکانوا ینحتون من الجبال بیوتًا اٰمنین)۔

یہ بات نشاندہی کرتی ہے کہ ان کا علاقہ کوہستانی تھا نیز یہ کہ ان کا مادی تمدن ترقی یافتہ تھا جبھی تو وہ پہاڑوں میں اپنے لیے امن کے گھر تراشتے تھے کہ جو طوفانوں، سیلابوں بلکہ زلزلوں تک کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

عجیب بات یہ ہے کہ انسان دنیا کی چند روزہ زندگی کے لیے اتنے محکم کام کرتا ہے لیکن اپنی ابدی زندگی کے بارے میں اس قدر تساہل سے کام لیتا ہے کہ خدا کی بات سننے اور اس کی آیات پر ایک نظر ڈالنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا۔

تو اب ایسی قوم کے بارے میں کیا توقع کی جا سکتی ہے سوائے اس کے کہ ان کے لیے "انتخاب اصلح الٰہی" کا قانون حرکت میں آئے اور ایسی قوموں کو جو پوری طرح فاسد و مفسد ہو چکی ہیں انھیں جینے کا حق نہ دیا جائے اور تباہ کن عذاب کے ذریعے انھیں نابود کر دیا جائے۔

اسی لیے قرآن کہتا ہے: آخرکار آسمانی چیخ نے دمِ صبح انھیں آلیا (فاخذتھم الصیحۃ مصبحین)۔

یہ چیخ بجلی کی ہولناک آواز تھی جو ان کے گھروں پر آگری یہ اس قدر تباہ کن اور وحشت ناک تھی کہ اس نے ان کے بے جان جسموں کو زمین پر پھینک دیا اس بات کی شاہد سورہ حم سجدہ کی آیہ ۱۳ ہے۔

فان اعرضوا فقل انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و ثمود

یہ کفار منہ پھیریں تو کہہ دو کہ میں تمھیں ایسی بجلی گرنے سے ڈراتا ہوں جو بجلی قوم عاد و ثمود پر گری۔

ان کے فلک بوس پہاڑ، امن و امان کے گھر، اس سرکش قوم کے طاقتور جسم اور ان کی بہت زیادہ دولت و ثروت کوئی چیز بھی عذابِ الٰہی کے سامنے ٹھہر نہ سکی۔ لہٰذا ان کی داستان کے آخر میں فرمایا گیا ہے: جو کچھ ان کے ہاتھ میں تھا وہ انھیں عذابِ الٰہی سے بچا نہ سکا (فما اغنٰی عنھم ما کانوا یکسبون)۔

سورۂ شعراء میں آیہ ۱۴۱ تا ۱۵۸ میں ان کے حالات زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں جو انشاءاللہ ان آیات کی تفسیر میں آئیں گے۔

Marfat.com

۸۵۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّ
السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ○
۸۶۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ○
۸۷۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ○
۸۸۔ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○
۸۹۔ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ○ ج
۹۰۔ كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ○ لا
۹۱۔ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ○

ترجمہ

۸۵۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے ہم نے بغیر حق کے پیدا نہیں کیا اور وعدہ کی گھڑی (قیامت) یقیناً آکے رہے گی ان دشمنوں سے اچھی طرح صرفِ نظر کر (اور انھیں ان کی نادانیوں پر ملامت نہ کر)۔

۸۶۔ تیرا پروردگار پیدا کرنے والا آگاہ ہے۔

۸۷۔ ہم نے تجھے سورۂ حمد اور قرآنِ عظیم دیا ہے۔

۸۸۔ (لہٰذا) ان (کفار) میں سے کچھ گروہوں کو جو (مادّی) نعمتیں دی ہیں ان پر ہرگز نگاہ نہ ڈال اور جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر غمگین نہ ہو اور اپنے پر و بال مومنین کے لیے جھکا دے۔

۸۹۔ اور کہہ دے کہ میں واضح ڈرانے والا ہوں۔

Marfat.com

۹۰۔ (ہم ان پر عذاب نازل کریں گے) جیسے ہم نے (آیات الٰہی کو) تقسیم کرنے والوں پر نازل کیا ہے
۹۱۔ وہی لوگ کہ جنھوں نے قرآن کو تقسیم کر دیا ہے (کہ جو کچھ ان کے مفاد میں تھا قبول کر لیا ہے اور جو کچھ ان کی ہوا و ہوس کے خلاف تھا اسے ترک کر دیا ہے)۔

تفسیر

تقسیم اور نکتہ چینی کرنے والے:

انسان ہمیشہ سے ایک صحیح آئیڈیالوجی اور عقیدہ نہ ہونے کی مصیبت میں گرفتار رہا ہے دوسرے لفظوں میں وہ مبداء و معاد کے نظریے کا پابند نہیں رہا۔ قوم لوطؑ، قوم شعیب اور قوم صالح جیسی قومیں کہ جو اس ابتلاء میں گرفتار تھیں کے حالات تفصیل سے بیان کرنے کے بعد اب قرآن مسئلہ توحید اور معاد کی طرف لوٹتا ہے اور ایک ہی آیت میں ان دونوں امور کی طرف اشارہ کرتا ہے جو کچھ آسمان و زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے ہم نے بغیر حق کے پیدا نہیں کیا (وما خلقنا السمٰوٰت والارض ومابینھما الا بالحق)۔ ان پر جو نظام حاکم ہے وہ بھی حق ہے اور ان کا مقصد تخلیق بھی حق ہے لہٰذا یہ عجیب و غریب نظم و نسق اور دقیق و منظم آفرینش دانا و توانا خالق پر واضح دلیل ہے کہ وہ بھی حق ہے بلکہ حقیقتِ حق وہی ہے اور ہر حق اسی وقت تک حق ہے جب تک اس کے وجود بے پایاں کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور جو کچھ اس کے سوا ہے اور اس سے تعلق نہیں رکھتا وہ باطل اور فضول ہے۔

یہ تو توحید کے بارے میں تھا۔ اس کے بعد معاد و قیامت کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ وعدے کی گھڑی (قیامت) آخر کار آکے رہے گی (وان الساعۃ لاٰتیۃ)۔ اگرچہ دیر سے آئے آخر کار ضرور آئے گی۔

بعید نہیں کہ پہلا جملہ دوسرے جملے کی دلیل کے طور پر ہو کیونکہ یہ وسیع و عریض جہان تبھی حق ہوگا جب صرف یہ چند روزہ دکھ درد سے بھری ہوئی زندگی کے لیے نہ پیدا کیا گیا ہو بلکہ اس کے لیے کوئی ایسا نہایت اعلیٰ ہدف پیش نظر ہو جو اس عظیم آفرینش کی توجیہ کر سکے۔ لہٰذا آسمان و زمین اور عالم ہستی کا حق ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ آگے قیامت اور معاد موجود ہے ورنہ آفرینش و خلقت فضول تھی (غور کیجیے گا)۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کو حکم دیتا ہے کہ ان کی ہٹ دھرمیوں، نادانیوں، تعصب، کارشکنیوں اور سخت سے سخت مخالفتوں کے باوجود ملامت اور محبت کا مظاہرہ کرو" اور ان کے گناہوں سے صرف نظر کرو اور انھیں بخش دو، خوبصورتی کے ساتھ کہ جس بخشش میں ملامت تک نہ ہو (فاصفح الصفح الجمیل)۔ کیونکہ لوگوں کے دلوں میں مبداء و معاد کا عقیدہ راسخ کرنے کی دعوت کے لیے تمھارے پاس واضح دلیل موجود ہے لہٰذا انھیں سختی اور خشونت کی کوئی ضرورت نہیں منطق و عقل تمھارے پاس سب ہے علاوہ ازیں جاہلوں کے ساتھ سختی سے تعصب ہی میں اضافہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

"صفح" ہر چیز کے چہرے کو کہتے ہیں مثلاً صفحۂ صورت[1]۔ اسی لیے "فاصفح" منہ پھیرنے اور صرفِ نظر کرنے کے معنی میں آیا ہے اور کسی سے منہ پھیرنا چونکہ بعض اوقات بے اعتنائی، اظہار ناراضگی وغیرہ کے لیے ہوتا ہے اور بعض اوقات بزرگانہ عفو و درگذر کے لیے اس لیے زیر بحث آیت میں فوراً اسے لفظ "جمیل" کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے تاکہ دوسرا معنی دے سکے۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فرمایا:

العفو من غیر عتاب

اس سے مُراد مؤاخذہ اور سرزنش کے بغیر عفو و درگذر ہے[2]

ایسی ہی ایک حدیث امام زین العابدین علیہ السلام سے بھی نقل ہوئی ہے[3]

اگلی آیت، جیسا کہ بعض مفسرین نے کہا ہے درحقیقت درگذر اور "صفح جمیل" کے ضروری ہونے کی دلیل کے طور پر ہے ارشاد ہوتا ہے: تیرا پروردگار پیدا کرنے والا اور آگاہ ہے۔ (ان ربك هو الخلّٰق العليم)۔

وہ جانتا ہے کہ تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہیں وہ ان کے اندرونی اسرار، میلانات، سطح فکر اور مختلف قسم کے احساسات و جذبات سے باخبر ہے ان سب سے یہ توقع نہ رکھو کہ وہ ایک جیسے ہوں بلکہ ان سے عفو و درگذر کے جذبے سے پیش آؤ تاکہ تدریجاً ان کی تربیت ہو اور وہ راہِ حق کی طرف آئیں۔

البتہ اس گفتگو کا یہ مطلب نہیں کہ لوگ اپنے طرزِ عمل اور اعمال میں مجبور ہیں بلکہ یہ صرف ایک تربیتی قانون کی طرف اشارہ ہے اور یہ فکر و نظر اور صلاحیتوں میں اختلاف کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بعض کا یہ خیال ہے کہ حکم رسول اللہ کی مکّی زندگی سے مخصوص ہے اور آپ کی مدینہ ہجرت کے بعد جب مسلمان کچھ طاقت ور ہو گئے تو اس کی جگہ جہاد کے حکم نے لے لی لیکن اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ یہ حکم مدنی سورتوں میں بھی آیا ہے (مثلاً سورۂ بقرہ، سورۂ نور، سورۂ نور، سورہ تغابن اور سورۂ مائدہ کہ جن میں سے بعض میں رسول اللہ کو صفح و عفو کا حکم دیا گیا ہے اور بعض میں مومنین کو) واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ایک عمومی اور ابدی حکم ہے اور اتفاقاً یہ حکم جہاد کے حکم کے منافی نہیں کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا مقام ہے ایک مقام پر عفو و درگذر کے ذریعے آگے بڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں عفو و درگذر سے دوسرے کی جراءت و جسارت اور بڑھ جائے اور وہ اس سے سوءِ استفادہ کرے تو وہاں شدّتِ عمل کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس کے بعد رسول اللہؐ کی دلجوئی کی گئی ہے اور انھیں تسلّی دی گئی ہے کہ دشمنوں کی سختی، کثرت اور فراواں مادی وسائل سے

---

[1] قاموس میں فیروزآبادی نے لکھا ہے:

پہاڑ کا دامن، تلوار کی پہنائی اور چوڑائی اور صورت کو بھی "صفح" کہتے ہیں۔ نیز کسی چیز کے کنارے اور چہرے کو بھی "صفح" کہتے ہیں۔

[2]، [3] نور الثقلین، ج ۳ ص ۲۷۔

Marfat.com

ہرگز پریشان نہ ہوں، کیونکہ خدا نے خود پیغمبر پر وہ انعامات کیے ہیں جن کا کوئی چیز مقابلہ نہیں کر سکتی، فرمایا گیا ہے: ہم نے تجھے سورہ حمد اور قرآن عظیم دیا ہے (ولقد اٰتیناک سبعًا من المثانی والقراٰن العظیم)

ہم جانتے ہیں کہ "سبع" کا معنی لغت میں "سات" ہے اور "مثانی" "متعدد" "دو دو" کو کہتے ہیں۔ بہت سے مفسرین نے اور روایات میں "سبع من المثانی" کو سورہ حمد کے لیے کنایہ مراد لیا ہے کیونکہ مشہور قول کے مطابق سورہ حمد سات آیات پر مشتمل ہے اور اس لیے کہ اس کی اہمیت اور اس کے مضامین کی عظمت بہت زیادہ ہے یہ دو مرتبہ رسول اللہ پر نازل ہوئی یا یہ کہ یہ دو حصوں پر مشتمل ہے آدھا حصہ خدا کی حمد و ثنا اور آدھا حصہ بندوں کی طرف سے تقاضا و التجاء ہے یا یہ کہ یہ ہر نماز میں دو مرتبہ پڑھی جاتی ہے ان پہلوؤں کے پیشِ نظر اس پر لفظ "مثانی" یعنی کئی دو دو کا اطلاق ہوا ہے [1]

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "سبع" قرآن کی ابتدائی بڑی سات سورتوں کی طرف اشارہ ہے اور مثانی خود قرآن کی طرف اشارہ ہے کیونکہ قرآن رسول اللہ پر دو مرتبہ نازل ہوا ایک مرتبہ سارے کا سارا اکٹھا اور ایک مرتبہ تدریجاً ضرورت کے ماتحت مختلف اوقات میں۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا: پورے قرآن کی سات اہم سورتیں۔

ان مفسرین نے سورۂ زمر کی آیہ ۲۳ کو بھی اس مفہوم کے لیے شاہد قرار دیا ہے ارشادِ خداوندی ہے:۔

الله نزل احسن الحديث كتابًا متشا بها مثانی

خدا وہی ہے جس نے بہترین حدیث کو نازل فرمایا کہ جس کے مضامین و مفاہیم ہم آہنگ اور دوسرے سے مشابہ ہیں وہ کتاب کہ جو دو مرتبہ نازل ہوئی۔

لیکن ——— پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے خصوصاً ان بہت سی روایات کی بناء پر جو اہل بیتؑ سے نقل ہوئی ہیں جن میں اس کا مطلب سورۂ حمد بتایا گیا ہے۔

مفردات میں راغب نے لفظ "مثانی" کا قرآن پر اطلاق اس لحاظ سے صحیح جانا کہ اس کی آیات بار بار پڑھی جاتی ہیں اور یہی تجدید و تکرار قرآن کو حوادث سے محفوظ رکھتا ہے۔

علاوہ ازیں ہر زمانے میں حقیقتِ قرآن کا نیا تکرار اور نئی تجلی سامنے آتی ہے جس کا تقاضا ہے کہ اسے "مثانی" کہا جائے۔

بہرحال سورہ حمد کے بعد قرآن عظیم کا ذکر جب کہ سورۂ حمد بھی اس کا جزو ہے اس سورہ کی اہمیت و عظمت کی دلیل ہے کیونکہ اکثر ہوتا ہے کہ کسی چیز کے ایک حصے کا ذکر اس کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت کی وجہ سے کیا جاتا ہے ایسا عربی، فارسی

---

[1] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:۔

خدا فرماتا ہے: میں نے نماز (سورۂ حمد) کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک حصہ مجھ سے مربوط ہے دوسرا بندوں سے۔ (مجمع البیان، جلد ۱، صفحہ ۱۷)

Marfat.com

اور دیگر زبانوں میں بہت ہے۔

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ سے یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ تو ایسے عظیم سرمایے کا حامل ہے ——— قرآن جیسا سرمایہ جو تمام عالم ہستی کی عظمت رکھتا ہے وہ سرمایہ جو سراسر نور، برکت، درس اور لائحہ عمل ہے راہیں کھولنے والا ہے خصوصاً سورہ حمد کہ جس کا مفہوم اور مضمون اس قدر بلند ہے کہ لحظہ بھر میں انسان کا رشتہ خدا سے جوڑ دیتا ہے اور اس کی روح کو خدا کے آستانے پر تعظیم و تسلیم اور راز و نیاز کے لیے ایستادہ کر دیتا ہے۔

اس عظیم نعمت کا تذکرہ کرنے کے بعد پیغمبر اکرمؐ کو چار حکم دیئے گئے ہیں۔ پہلے فرمایا گیا ہے: یہ مادی نعمتیں جو ہم نے کافروں کو دی ہیں ان پر ہرگز نگاہ نہ ڈال (لاتمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منھم)[1]

یہ مادی نعمتیں پائیدار نہیں ہیں اور پھر دردِ سر بھی ہیں یہاں تک کہ اچھے حالات میں بھی انسان کے لیے ان کی حفاظت مشکل ہو جاتی ہے لہٰذا یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو تیری آنکھوں کو متوجہ کرے۔ ان کے مقابلے میں عظیم روحانی نعمت قرآن جو خدا نے تجھے دی ہے وہ بہت اہم ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہ جو مال و ثروت اور مادی نعمتیں ان کے ہاتھ میں ہیں اس پر ہرگز غمگین نہ ہو (ولا تحزن علیھم)۔

درحقیقت پہلا حکم مادی نعمتوں کی طرف آنکھ نہ اٹھانے کے لیے ہے اور دوسرا ان سے محرومی پر غم نہ کھانے کے لیے ہے۔

"ولاتحزن علیھم" کی تفسیر کے بارے میں یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اس کا مطلب ہے:

اگر وہ تجھ پر ایمان نہیں لاتے تو غم نہ کھاؤ کیونکہ ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

لیکن پہلی تفسیر قبل کے جملوں کے ساتھ زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

بہرحال سورہ طٰہٰ آیہ ۱۳۱ میں اس کی واضح نظیر موجود ہے۔

ولاتمدن عینیک الی ما متعنا بہ ازواجا منھم زھرۃ الحیٰوۃ الدنیا لنفتنھم فیہ ورزق ربک خیر وابقٰی

ان میں سے بعض کو نعمتیں دی ہیں ان پر نظر نہ ڈال یہ دنیاوی زندگی کے پھول ہیں (ناپائیدار پھول، جو بہت جلد مرجھا کر بکھر جائیں گے) لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ انھیں اس کے ذریعے آزمائیں خدا نے تجھے جو روزی دی ہے وہ تیرے لیے بہتر اور زیادہ پائیدار ہے۔

تیسرا حکم تواضع، فروتنی اور مومنین سے نرمی کرنے کے بارے میں ہے فرمایا گیا ہے: اپنے پر و بال مومنین کے لیے پھیلا دے اور نیچے جھکا لے (واخفض جناحک للمؤمنین)۔

یہ تعبیر تواضع اور محبت کے لیے خوبصورت کنایہ ہے جیسے پرندے اپنے بچوں سے اظہارِ محبت کرتے ہیں انھیں اپنے پر و بال کے

---

[1] "ازواجا" "متعنا" کا مفعول ہے اور "منھم" ایک عمومی مقدر فعل کے متعلق جار مجرور ہے اور اس سارے کا معنی ہوگا: "کفار کے مختلف گروہ ...."

Marfat.com

نیچے چھپا لیتے ہیں یہ انتہائی محبت کا منظر ہوتا ہے اس طرح وہ دشمنوں سے انھیں بچاتے ہیں اور بکھر جانے سے روکتے ہیں دراصل کنایہ کی صورت میں یہ جچی تلی مختصر تعبیر بہت سے مطالب کی حامل ہے۔

ضمناً مذکورہ احکام کے بعد یہ جملہ ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ بادا مادی نعمتوں کے حامل ہونے کی وجہ سے کافروں سے انکساری کرو یہ انکساری اور محبت مومنین کے لیے ہونا چاہیے اگرچہ مالِ دنیا سے ان کا ہاتھ خالی ہو۔

آخر میں پیغمبر اکرمؐ کو چوتھا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان بے ایمان دولت مندوں کے مقابلے میں مضبوطی سے کھڑے ہو جاؤ اور انھیں کھلے بندوں کہہ دو کہ میں واضح ڈرانے والا ہوں (وقل انی انا النذیر المبین)۔

کہہ دو کہ میں تمھیں متنبہ کرتا ہوں کہ خدا نے فرمایا ہے کہ میں تم پر عذاب نازل کروں گا جیسے کہ میں نے تقسیم کرنے والے پر نازل کیا ہے (کما انزلنا علی المقتسمین) وہی تقسیم کرنے والے کہ جنھوں نے آیاتِ الٰہی کو بانٹ دیا (الذین جعلوا القرآن عضین)[1] جو کچھ ان کے مفاد میں تھا وہ تو لے لیا اور جو کچھ ان کے نقصان میں تھا اسے ایک طرف رکھ دیا۔ درحقیقت ہوا یہ کہ بجائے اس کے کہ کتابِ خدا اور اس کے احکام ان کے رہبر و راہنما ہوتے اسے انھوں نے اپنے برُے مقاصد کے لیے وسیلہ بنا لیا۔ ایک لفظ اُن کے مفاد میں ہوتا اس سے چمٹ جاتے اور اگر ہزار الفاظ ان کے ضرر میں ہوتے تو انھیں ایک طرف رکھ دیتے۔

چند اہم نکات

۱۔ قرآن خدا کی عظیم نعمت ہے: زیرِ نظر آیات میں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر کے ذریعے دنیا بھر کے مسلمانوں کو خطرے سے خبردار کرنے کے بعد اعلان کرتا ہے کہ یہ عظیم آسمانی کتاب اور بہت بڑا سرمایہ ہے یہ ایک بے نظیر نعمت ہے جو مسلمانوں کو دی گئی ہے یہ ایک ایسا جاودانی پروگرام ہے کہ جس پر عمل کیا جائے تو دنیا آباد و آزاد ہو جائے۔ اور امن و امان اور معنویت سے معمور ہو جائے۔

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے دوسرے لوگ بھی معترف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمان اس کے معارف زندہ کرتے اور اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے تو اتنے طاقتور اور ترقی یافتہ ہوتے کہ کوئی ان پر اپنا تسلط نہ جما سکتا۔

یہ سورہ حمد ——— سبعاً من المثانی ——— کہ جو فاتحۃ الکتاب، آغازِ قرآن کرنے والی ہے اور فہرستِ قرآن کہلاتی ہے، ایک مکمل درسِ حیات ہے۔

اس عظیم مبداء کی طرف توجہ کہ جو تمام عالمین کی راہِ تکامل میں پرورش کرتا ہے جس کی خاص اور عام رحمت سب پر چھائی ہوئی ہے۔

اس عدالت کی طرف توجہ کہ جس پر ایمان انسان کے اعمال کو پوری طرح سے کنٹرول کر لیتا ہے۔

---

[1] "عضین" "عضۃ" کی جمع ہے جس کا معنی ہے "متفرق"۔ کسی چیز کے حصے کو بھی "عضۃ" کہتے ہیں لہٰذا "عضین" کا معنی ہوا "حصے" یا "ٹکڑے"۔

Marfat.com

غیر اللہ پر بھروسہ نہ کرنا اور اس کے غیر کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنا۔

مختصر یہ کہ

صراطِ مستقیم پر قدم رکھنا کہ جس میں انحراف نہیں، وہ راستہ جو نہ مشرق کی طرف خم کھاتا ہے نہ مغرب کی طرف، جس میں افراط و تفریط ہے نہ گمراہی اور نہ ہی غضب الٰہی۔

یہ سب جب کسی انسان کی روح میں رچ بس جائیں تو ایک اعلیٰ اور باکمال شخصیت بنانے کے لیے کافی ہے۔

لیکن افسوس کہ یہ عظیم سرمایہ ایسے لوگوں کے ہاتھ جا پڑا ہے کہ جنھیں اس کی گہرائی کا پتہ چلا ہے نہ اس کی اعلیٰ قدر و قیمت کا۔ یہاں تک کہ بعض ایسے ناآگاہ لوگ بھی ہیں کہ اس کی آیات کو چھوڑ کر ایسے انسانوں کے گھڑے ہوئے قوانین اور پروگرام کی طرف دستِ نیاز پھیلاتے ہیں جو خود اسیرِ شہوات ہیں۔ کم از کم یہ کہ جن کی فکر ناپختہ اور نارسا ہے یا وہ کہ جو اپنا علم بخس دولت اور حقیر قیمت پر فروخت کرتے ہیں یا دوسروں کے مادی تمدن کی تھوڑی سی ترقی ان کی توجہ کو اس طرح سے کھینچتی ہے کہ جو خود ان کے پاس ہے اس سے غافل ہو جاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مادی ترقی کو بالکل اہمیت نہ دیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ سبھی کچھ اسے نہ سمجھیں اور قرآن نہ صرف روحانی لحاظ سے ایک پُربار اور عظیم سرچشمہ ہے بلکہ مادی ترقی اور خوشحالی کا بھی مؤثر پروگرام ہے اس سلسلے میں ہم پہلے بھی متعلقہ آیات میں توضیح کر چکے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی کریں گے۔

۲۔ دوسروں کے وسائل پر نگاہ رکھنا انحطاط کا باعث ہے: بہت سے تنگ نظر افراد ایسے ہیں جو ہمیشہ اسی ٹوہ میں رہتے ہیں کہ اس کے پاس کیا ہے اور اس کے پاس کیا ہے؟ یہ لوگ مسلسل اپنی مادی حالت کا دوسروں سے تقابل کرتے رہتے ہیں اور جب اپنے آپ کو کم پاتے ہیں تو رنج و غم میں مبتلا ہو جاتے ہیں چاہے دوسروں نے یہ وسائل اپنی انسانی قدر و قیمت اور اپنا استقلال گنوا کر حاصل کیے ہوں۔

یہ طرزِ فکر رشد کی کمی، احساسِ کمتری اور کم ہمتی کی نشانی ہے۔ یہ زندگی میں پس ماندگی اور تنزل کا سبب ہے یہاں تک کہ مادی زندگی پر بھی اس کا بہت منفی اثر ہوتا ہے بجائے اس کے کہ انسان ایسے گھٹیا اور نقصان دہ تقابل میں پڑے اپنی فکری اور جسمانی صلاحیتوں کو اپنی رشد و ترقی کے لیے استعمال کرے اور اپنے آپ سے کہے کہ میں دوسروں سے کم تر نہیں ہوں اور کوئی وجہ نہیں کہ میں ان سے زیادہ ترقی نہ کر سکوں میں کیوں ان کے مال و مقام پر آنکھ رکھوں میں ان سے بہتر حاصل کر سکتا ہوں۔

مادی زندگی کا ہدف ہرگز نہیں۔ ایک صحیح انسان مادی وسائل یا تو اس قدر چاہتا ہے جو اس کی روحانیت کے لیے مددگار ہوں یا جس قدر اس کی آزادی اور استقلال کی حفاظت کر سکیں نہ کہ وہ حریصانہ ان کے پیچھے بھاگتا ہے اور نہ ہی ان کے بدلے سب کچھ قربان کر دیتا ہے کیونکہ ایسا سودا احرار اور بندگانِ خدا نہیں کرتے وہ ایسا کام بھی نہیں کرتے جس میں دوسروں کے محتاج ہوں۔

پیغمبر اکرمؐ سے مروی ایک حدیث میں ہے:۔

من رمی ببصرہ ما فی ید غیرہ کثر ھمہ ولم یشف غیضہ

Marfat.com

جو شخص اس پر نظریں جمائے رکھے کہ جو دوسروں کے پاس ہے وہ ہمیشہ غمگین رہے گا اور اس کے دل کی آتشِ غضب کبھی نہیں بجھے گی۔[1]

۲۔ رہبر کی انکساری: آیات قرآن میں بارہا پیغمبر اکرمؐ کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ مومنین سے تواضع، مہربانی، نرمی اور ملائمت سے پیش آئیں۔ یہ امر پیغمبر اسلامؐ کے لیے منحصر نہیں ہے۔ بلکہ جو شخص بھی وسیع یا محدود لوگوں میں رہبری کا فریضہ اپنے ذمے لے اسے چاہیے کہ اس پر کاربند رہے کیونکہ یہ حقیقی قیادت اور تنظیمی اصولوں میں سے ہے اس لیے کہ ایک رہبر کا بہت بڑا سرمایہ اس کے پیروکاروں کا اس سے محبت کرنا اور اس سے روحانی رشتہ ہے اور یہ تواضع، ملنساری اور خیر خواہی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ رہبروں کی سختی اور فسادات ہمیشہ لوگوں کے ان کے گرد و پیش سے متفرق اور منتشر ہونے کا ایک اہم عامل ہوتے ہیں۔

امیر المومنین حضرت علیؑ، محمد بن ابی بکر کو اپنے ایک خط میں اس طرح فرماتے ہیں:

فاخفض لھم جناحك والن لھم جانبك وابسط لھم وجھك وآس بینھم فی اللحظة والنظرة

اپنے پر و بال ان کے لیے جھکا دے، ان سے نرمی سے پیش آ، کشادہ رُو رہ اور ان کے درمیان نظر کرنے میں بھی مساوات اور برابری کو ملحوظ رکھ۔[2]

۴۔ "مقتسمین" کون لوگ ہیں؟ بلاشبہ خدائی احکام اور پروگرام سب لوگوں کے مفاد میں ہوتے ہیں لیکن ظاہراً اور ابتدائی نظر میں عام طور پر ان میں سے بعض ہماری رغبت اور خواہش کے مطابق ہیں اور بعض برخلاف ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں سچے مومن اور جھوٹے دعویدار پہچانے جاتے ہیں، سچے مومن تو ان سب کو کاملاً قبول کر لیتے ہیں یہاں تک کہ جو احکام ظاہراً ان کے فائدے میں نہیں انھیں بھی قبول کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

کل من عند ربنا

سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔

یہ احکام الٰہی میں کسی قسم کی تقسیم اور تبعیض کے قائل نہیں ہیں لیکن وہ لوگ کہ جن کے دل بیمار ہیں اور وہ یہ تک چاہتے ہیں کہ دین اور حکمِ خدا کو بھی اپنے مفادات کے لیے استعمال کریں وہ صرف وہی حصہ قبول کرتے ہیں جو ان کے فائدے میں ہو اور باقی پسِ پشت ڈال دیتے ہیں وہ آیاتِ قرآن کو بلکہ بعض اوقات ایک ہی آیت کو تقسیم کر دیتے ہیں اور ایک حصہ جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا ہے اسے قبول کر لیتے ہیں اور دوسرے حصے کو ایک طرف پھینک دیتے ہیں۔

یہ بات باعثِ فخر نہیں کہ ہم بعض گذشتہ قوموں کی طرح یہ راگ الاپیں:

---

[1] تفسیر صافی، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] نہج البلاغہ، مکتوب ۲۷

Marfat.com

نؤمن ببعض و نکفر ببعض

ہم بعض پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض پر نہیں۔

کیونکہ ——— تمام دنیا پرست یہی کچھ کرتے ہیں۔ پیروانِ حق اور پیروانِ باطل میں یہی فرق ہے کہ پیروانِ باطل احکام کے اسی حصے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں جو ان کی خواہشات، ہوا و ہوس اور ظاہری مفادات سے ہم آہنگ ہو۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کھرا اور کھوٹا اور مومن اور منافق پہچانا جاتا ہے۔

جو کچھ ہم نے سطورِ بالا میں کہا ہے اس کے علاوہ بھی "مقتسمین" کی کچھ تفاسیر علماء نے ذکر کی ہیں یہاں تک کہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں اس لفظ کی سات تفسیریں بیان کی ہیں ان میں سے زیادہ تر غیر مناسب نظر آتی ہیں لیکن بعض جو غیر مناسب نہیں ہیں ان میں سے ایک ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

مشرکین کے کچھ سردار ایامِ حج میں مکہ کی سڑکوں اور کوچوں کے کنارے کھڑے ہو جاتے تھے ان میں سے ہر ایک گذرنے والوں سے رسول اللہ اور قرآن کے بارے میں کوئی نہ کوئی بات کرتا تاکہ انھیں متنفر کر دیں۔

بعض کہتے : وہ دیوانہ ہے جو کچھ کہتا ہے غیر موزوں ہوتا ہے۔

بعض کہتے: وہ جادوگر ہے اور اس کا قرآن بھی اس کے جادو کا ایک حصہ ہے۔

بعض آپ کو شاعر کہتے: آیاتِ آسمانی کے جاں نواز آہنگ اور لہجے کو کذب اور جھوٹی شاعری قرار دیتے۔

بعض آپ کو کاہن کا نام دیتے اور قرآن کی غیب کی خبروں کو ایک طرح کی کہانت قرار دیتے۔

انھیں "مقتسمین" کہا گیا ہے کیونکہ انھوں نے مکہ کی سڑکوں اور گلیوں کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تقسیم کر رکھا تھا۔

کوئی مانع نہیں کہ یہ تفسیر اور جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے دونوں آیت کے مفہوم میں شامل ہوں۔

Marfat.com

۹۲۔ فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝
۹۳۔ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝
۹۴۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝
۹۵۔ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ۝
۹۶۔ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝
۹۷۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ۝
۹۸۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝
۹۹۔ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ۝

ترجمہ

۹۲۔ تیرے پروردگار کی قسم ہم ان سب سے سوال کریں گے۔
۹۳۔ جو کچھ وہ کرتے تھے۔
۹۴۔ جس چیز کے لیے مامور ہو اسے واضح طور پر بیان کرو اور مشرکین سے رُخ پھیر لو (اور ان کی پروا نہ کرو)
۹۵۔ ہم تمسخر اڑانے والوں کے شر کو تجھ سے دور رکھیں گے۔
۹۶۔ وہ کہ جنھوں نے خدا کے ساتھ اور معبود بنا رکھے ہیں لیکن وہ جلد ہی جان جائیں گے۔
۹۷۔ ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس پر تیرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے (اور تجھے سخت پریشان کرتے ہیں)۔
۹۸۔ (اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے) اپنے پروردگار کی تسبیح کر، حمد و ثنا کر اور سجدہ گزاروں میں سے ہو جا۔
۹۹۔ اور اپنے پروردگار کی عبادت کر یہاں تک کہ یقین (موت) آجائے۔

Marfat.com

تفسیر

اپنا مکتب واضح طور پر بیان کرو

یہ سورۂ حجر کی آخری آیات ہیں ان میں سب سے پہلے "مقتسمین" کا انجام بیان کیا گیا ہے۔ جزا کے بارے میں گذشتہ آیات میں گفتگو ہوئی تھی۔ فرمایا گیا ہے: تیرے پروردگار کی قسم! ہم یقینی طور پر ان سب سے سوال کریں گے (فوربك لنسئلنهم اجمعين)۔

ان تمام کاموں کے بارے میں جو وہ انجام دیتے تھے (عما كانوا يعملون)۔

واضح ہے کہ خدا کا سوال اس لیے نہیں کہ وہ پوشیدہ بات ظاہر ہو جائے کیونکہ وہ اندرونی اور بیرونی اسرار سے آگاہ ہے اور زمین و آسمان کا کوئی ذرہ اس کے علم بے پایاں سے مخفی نہیں ہے لہٰذا سوال خود مخاطب کو سمجھانے کے لیے ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کی قباحت کو سمجھ لے یا یہ ایک قسم کی نفسیاتی سزا ہے کیونکہ غلط کاموں کے بارے میں باز پرس اور وہ بھی سرزنش اور ملامت کیساتھ اور وہ بھی ایسے جہان میں جہاں انسان حقائق سے زیادہ قریب اور آگاہ ہے بہت تکلیف دہ ہے۔ لہٰذا یہ سوالات درحقیقت ان کی سزا کا ایک حصہ ہیں۔

ضمنی طور پر "عما كانوا يعملون" کی عمومیت نشاندہی کرتی ہے کہ انسان کے تمام اعمال کے بارے میں بلا استثناء سوال ہوگا اور خود تمام انسانوں کے لیے ایک درس ہے کہ وہ لحظہ بھر بھی اپنے اعمال سے غافل نہ رہیں۔

یہ جو بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ سوال توحید اور انبیاء پر ایمان لانے یا مشرکین کے معبودوں سے مربوط ہے ایک ایسی بات ہے جو بغیر دلیل کے ہے۔ آیت کا مفہوم پورے طور پر عمومیت کا حامل ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ اس آیت میں خدا تعالیٰ سوال کرنے کے بارے میں تاکید کر رہا ہے جبکہ سورۂ رحمٰن کی آیہ ۳۹ میں ہے:

فيومئذ لا يسئل عن ذنبه انس ولا جان

اس روز انسانوں اور جنوں میں سے کسی سے بھی کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔

اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت میں کئی مراحل ہیں بعض مراحل میں لوگوں سے سوال ہوگا اور بعض میں نہیں ہوگا جہاں مسائل خود بخود واضح ہوں گے یا یہ کہ زبانی سوال نہیں ہوگا کیونکہ سورہ یٰس کی آیہ ۶۵ کے مطابق لبوں پر مہر لگی ہوگی اور سوال صرف جسم کے اعضاء و جوارح سے کیا جائے گا یہاں تک کہ بدن کی کھال سے بھی پوچھا جائے گا[1]

اس کے بعد رسول اللہ کو ایک قطعی فرمان دیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: مشرکین کے شور و غل کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ

---

[1] مزید توضیح کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱ صفحہ ۸۰ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

ضعف وخوف اور سستی کو نہ آنے دو اور خاموش ہو کر نہ بیٹھ جاؤ بلکہ "جس کام کے لیے مامور کیے گئے ہو اسے واضح طور پر بیان کرو"۔
اور حقائق دین صراحت سے برملا کہہ دو" (فاصدع بما تؤمر)۔
اور مشرکین سے رُخ موڑلو اور ان سے بے اعتنائی کرو (واعرض عن المشرکین)۔
"فاصدع" "صدع" کے مادہ سے ہے اس کا لغوی معنی ہے شگاف کرنا یا مضبوط چیزوں میں شگاف کرنا اور چونکہ کسی چیز میں شگاف کرنے سے اس کا اندرونی حصہ آشکار ہو جاتا ہے اس لیے یہ لفظ اظہار، افشاء، آشکار اور واضح کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ شدید دردِ سر کو بھی "صداع" کہتے ہیں کیونکہ ایسے لگتا ہے جیسے وہ پھٹ رہا ہو اور شگافتہ ہو رہا ہو۔

بہرحال مشرکین سے اعراض کرنا یہاں یا تو بے اعتنائی کے معنی میں آیا ہے یا پھر ان سے جنگ ترک کرنے کے معنی میں آیا ہے کیونکہ اس زمانے میں ابھی مسلمان اس مرحلے میں نہیں پہنچے تھے کہ دشمن کی سختی کے جواب میں مسلح مقابلہ کر سکیں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ قلب پیغمبر کی تقویت کے لیے انھیں اطمینان دلاتا ہے کہ تمسخر اڑانے والوں کے مقابلے میں وہ اپنے نبی کی حمایت کرے گا۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے تمسخر اڑانے والوں کے شر کو تجھ سے دُور کیا (انا کفینٰک المستھزئین)۔

یہ جملہ فعل ماضی کے ساتھ آیا ہے حالانکہ اس کا تعلق آئندہ سے ہے ظاہراً یہ اس حمایت کے حتمی ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی ہم ان کے شر کو یقینی طور پر تجھ سے دور کریں گے اور یہ بات حتمی اور طے شدہ ہے۔

بعض مفسرین نے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ چھ طرح کے گروہ تھے جن میں ہر ایک رسول اللہ سے ایک خاص قسم کا تمسخر کرتا تھا اور جب آنحضرتؐ دعوت کے لیے کھڑے ہوتے تو وہ کوشش کرتے کہ اپنی باتوں سے لوگوں کو آپ کے پاس سے دُور کر دیں لیکن خدا تعالیٰ نے ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا کر دیا اس طرح انھیں اپنی اپنی پڑ گئی اور رسول اللہؐ کو بھول گئے (بعض تفاسیر میں ان کی ابتلاء کی تفصیل آئی ہے)۔

اس کے بعد "مستھزئین" کی توصیف، قرآن یوں کرتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے خدا کے ساتھ اور معبود بنا رکھے ہیں لیکن بہت جلد وہ اپنے اس کام کے منحوس نتیجے سے آگاہ ہو جائیں گے (الذین یجعلون مع اللہ الٰھا اٰخر فسوف یعلمون)۔ ہو سکتا ہے یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہو کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے افکار و اعمال خود مضحکہ خیز ہیں کیونکہ یہ اس قدر نادان ہیں جہانِ ہستی کے خالق خدا کے مقابلے میں انھوں نے پتھر اور لکڑی کے معبود تراش رکھے ہیں اس کے باوجود وہ تیرے ساتھ تمسخر کرنا چاہتے ہیں۔

دوبارہ روح پیغمبر کی دلجوئی اور تقویت کے لیے فرمایا گیا ہے: ہم جانتے ہیں کہ ان کی باتیں تیرے سینے کو تنگ کر دیتی ہیں اور تیری پریشانی کا باعث بنتی ہیں (و لقد نعلم انک یضیق صدرک بما یقولون)۔ تیری لطیف روح اور حساس دل یہ سب بدگوئی اور کفر و شرک آمیز باتیں برداشت نہیں کر سکتا اور اسی بناء پر تو پریشان ہو جاتا ہے۔ لیکن تو پریشان نہ ہو ان کی گھٹیا اور ناہنجار باتوں کے اثرات کم کرنے کے لیے "اپنے پروردگار کی تسبیح بیان کر اور اس کی ذاتِ پاک کے سامنے سجدہ ریز ہو جا (فسبح بحمد ربک وکن من السّٰجدین) کیونکہ اللہ کی تسبیح ان کی گفتگو کے بُرے اثرات کو مشتاقانِ خدا کے دلوں سے دُور

Marfat.com

کردیتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تجھے توانائی بخشتی ہے اور نور وصفا عطا کرتی ہے، دل کو جلا دیتی ہے، خدا سے تیرے رشتے کو محکم کردیتی ہے، تیرے ارادے کو قوی کردیتی ہے، زیادہ قوتِ برداشت عطا کرتی ہے، جہاد پر زیادہ آمادہ کرتی ہے اور زیادہ راسخ قدم بنادیتی ہے۔ روایات میں ابنِ عباس سے مروی ہے:

رسولؐ اللہ غمگین ہوجاتے تو نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے اور نماز کے ذریعے ان آثارِ حزن و ملال کو دل سے دور کرتے۔

اس سلسلے میں آخری حکم یہ دیا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کی عبادت سے زندگی بھر دستبردار نہ ہونا" ہمیشہ اس کی بندگی کرتا رہ یہاں تک کہ یقین (موت) آجائے (واعبد ربك حتّٰى يأتيك اليقين)۔

مفسرین میں مشہور ہے کہ " یقین " سے مراد یہاں موت ہے اور موت کو اس لیے یقین کہا گیا ہے کہ یہ ایک امرِ مسلّم ہے۔ انسان ہر چیز میں شک کرسکتا ہے لیکن موت میں شک نہیں کرسکتا۔ یا اس لیے اسے یقین کہا گیا ہے کہ موت کے وقت پردے ہٹ جاتے ہیں اور حقائق انسان کی آنکھوں کے سامنے آشکار ہوجاتے ہیں اور اس کے بارے میں یقین کی حالت پیدا ہوجاتی ہے۔

سورۂ مدثر کی آیہ ۴۶ اور ۴۷ میں دوزخیوں کا یہ قول بیان کیا گیا ہے:

وكنا نكذب بيوم الدين حتّٰى اتانا اليقين

ہم ہمیشہ روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ یقین (موت) نے ہمیں آلیا۔

یہاں سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہ جو بعض صوفیاء نے زیرِ بحث آیت کو ترکِ عبادت کے لیے دستاویز بنالیا ہے اور کہا ہے کہ آیت کہتی ہے کہ عبادت کرو یہاں تک کہ تمھیں یقین آجائے لہٰذا حصولِ یقین کے بعد عبادت کی ضرورت نہیں، یہ ایک بے بنیاد گفتگو ہے۔ کیونکہ:

اوّلاً۔ بعض قرآنی آیات گواہی دیتی ہیں، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے کہ یقین موت کے معنی میں ہے کہ جو مومنین کو بھی آئے گی اور دوزخیوں کو بھی۔

ثانیاً: اس گفتگو کے مخاطب پیغمبر اکرمؐ ہیں اور یقینِ پیغمبر کا مقام سب پر روشن ہے تو کیا کوئی دعویٰ کرسکتا ہے کہ آپ ایمان کے لحاظ سے مقامِ یقین کے حامل نہ تھے۔

ثالثاً: تواریخ متواتر گواہی دیتی ہیں کہ رسول اللہؐ نے اپنی عمر کی آخری گھڑیوں تک عبادت ترک نہیں کی اور حضرت علیؑ محرابِ عبادت میں شہید ہوئے اور اسی طرح باقی آئمہ۔

چند اہم نکات

۱۔ اعلانیہ دعوتِ اسلام کا آغاز: جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات:

فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشركين انا كفينٰك المستهزئين

مکہ میں نازل ہوئیں جبکہ پیغمبرِ اسلام تین برس تک مخفی طور پر دعوت دے چکے تھے اور آپ کے قریبیوں میں سے چند افراد

Marfat.com

آپ پر ایمان لا چکے تھے کہ جن میں عورتوں سے سب سے پہلے جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا تھیں اور مردوں میں حضرت علی علیہ السلام تھے
واضح ہے کہ اس زمانے میں اور اس ماحول میں توحید خالص کی دعوت اور نظام شرک و بت پرستی کو درہم برہم کرنا عجیب و غریب اور نہایت کٹھن کام تھا لہٰذا یہ بات تو شروع ہی سے نمایاں تھی کہ کچھ لوگ تمسخر اڑائیں گے لہٰذا خدا تعالیٰ اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل کو تقویت دیتا ہے، استہزاء کرنے والوں اور دشمنوں کی کثرت سے نہ ڈریں اور اپنی دعوت کھلے بندوں شروع کر دیں اور اس راہ میں ایک پیہم مسلسل اور منطقی جہاد کے لیے تیار ہو جائیں۔[1]

۲۔ **خدا کی طرف توجہ کا روحانی اثر:۔** انسانی زندگی میں ہمیشہ مشکلات آتی رہتی ہیں یہ دنیاوی زندگی کا مزاج ہے کہ انسان جس قدر بڑا ہوتا جاتا ہے مشکلات بھی بڑی ہوتی جاتی ہیں اس سے ان عظیم مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن کا سامنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی عظیم دعوت کے لیے کرنا پڑا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنے رسولؐ کو حکم دیتا ہے کہ زیادہ قوت کے حصول کے لیے اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ وسعتِ قلب کے لیے تسبیح الٰہی، دعا اور اس کے آستانے پر سجدہ ریزی کریں۔ یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ انسانی روح میں ایمان اور ارادے کی تقویت کے لیے عبادت گہرا اثر رکھتی ہے۔

مختلف روایات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب بزرگ پیشواؤں کو عظیم مشکلات اور بحرانوں کا سامنا ہوتا، تو وہ خانہ خدا کا رُخ کرتے اس کی عبادت کے زیر سایہ راحت و آرام اور طاقت و قوت حاصل کرتے۔

۳۔ **عبادت اور تکامل و ارتقاء:** ہم جانتے ہیں کہ انسان ایسا موجود ہے جو تکامل و ارتقاء کی اعلیٰ ترین استعداد رکھتا ہے اس کے سفر کا آغاز نقطۂ عدم سے ہوا ہے اور وہ لا متناہی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور اگر وہ راہ تکامل پر چلتا رہے تو کہیں بھی ٹھہراؤ نہیں آئے گا۔

ایک طرف ہم جانتے ہیں کہ عبادت تربیتِ انسان کا اعلیٰ ترین مکتب ہے عبادت انسانی سوچ کو بیدار کرتی ہے اور اس کی فکر کو لا متناہی منزل کی طرف متوجہ کرتی ہے اس کے قلب و روح سے گناہ اور غفلت کا گرد و غبار دور کرتی ہے اس کے وجود میں اعلیٰ انسانی صفات کی پرورش کا باعث بنتی ہے۔ روحِ ایمان کو تقویت دیتی ہے اور انسان کو آگاہی اور مسئولیت عطا کرتی ہے لہٰذا ممکن نہیں کہ انسان لمحہ بھر کے لیے بھی اس عظیم تربیتی مکتب سے بے نیاز ہو اور وہ لوگ جو یہ سوچتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ انسان ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے کہ جہاں اسے عبادت کرنے کی ضرورت نہ ہو انھوں نے انسان کے تکامل و ارتقاء کو محدود خیال کیا ہے یا وہ مفہوم عبادت نہیں سمجھ سکے۔

علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان میں اس سلسلے میں ایک بحث کی ہے ہم اسے اختصار کے ساتھ ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

> اس عالم کے تمام موجودات کمال کی طرف محوِ سفر ہیں اور انسانی تکامل معاشرے کے اندر ہوتا ہے لہٰذا انسان ذاتی طور پر سماجی فطرت کے ساتھ پیدا ہوا ہے ایک طرف انسانی معاشرہ اس صورت میں انسان کی تربیت اور تکامل کا ضامن بن سکتا ہے کہ وہ منظم قوانین و احکام کا حامل ہو اور افراد معاشرہ ان قوانین کے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۳۲۔

Marfat.com

احترام کے زیر سایہ اپنے امور بجالائیں، ٹکراؤ سے بچیں اور ذمہ داریوں کی حدود واضح کریں۔

دوسرے لفظوں میں اگر انسانی معاشرہ صالح ہو جائے تو لوگ اس میں رہ کر اپنے اصلی ہدف تک پہنچ سکتے ہیں اور اگر معاشرہ خراب ہو تو پھر لوگ اس تکامل وارتقاء سے رُک جاتے ہیں یہ احکام و قوانین اجتماعی ہوں یا عبادتی اس صورت میں مؤثر ہوں گے جب نبوت اور آسمانی وحی سے لیے گئے ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عبادتی احکام انفرادی ہوں یا اجتماعی تکامل کے ایک حصے پر مبنی ہوتے ہیں۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ جب تک انسانی معاشرہ موجود ہے اور اس دنیا میں اس کی زندگی جاری وساری ہے الٰہی ذمہ داریاں اور احکام بھی جاری ہیں اور انسان کی ذمہ داریوں اور قوانین کے خاتمے کا مطلب احکام وقوانین کی فراموشی ہے اور اس کا نتیجہ انسانی معاشرے کی خرابی اور فساد ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ نیک اعمال اور عبادات انسان کی اعلیٰ صلاحیتوں کے حصول کا سرچشمہ ہیں اور جب یہ اعمال کافی حد تک انجام پاجائیں اور انسان کے اندر یہ اعلیٰ صلاحیتیں اور ملکات بیدار ہو جائیں تو یہ ملکات بھی اپنی اپنی باری پر زیادہ نیک اعمال اور خدا کی زیادہ اطاعت وبندگی کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔

اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ جن کا گمان ہے کہ حکم کا مقصد انسانی تکمیل ہے لہٰذا جب انسان اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو پھر بقاء کا کوئی معنی نہیں ان کا خیال مغالطے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اگر انسان ذمہ داریوں اور احکام کی انجام دہی سے دستبردار ہو جائے تو معاشرہ فوراً ابتری کا رُخ کرے گا لہٰذا ایسے معاشرے میں ایک فردِ کامل کیسے زندگی بسر کرسکتا ہے اور اگر ملکاتِ فاضلہ رکھتے ہوئے خدا کی بندگی سے دستبردار ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا یہ ملکات اپنے حقیقی اثرات سے روگرداں ہو گئے ہیں ـــــــــــ (غور کیجیے گا)

سورۂ حجر کی تفسیر کا اختتام ہوگیا ہے۔

۱؎ تفسیر المیزان جلد ۱۲ صفحہ ۲۱۰

Marfat.com

سورۂ نحل

اس کی ۱۲۸ آیات ہیں

اِس کا کچُھ حِصّہ مکّی ہے اور کچُھ مدنی

Marfat.com

اس سورہ کے مضامین

اگرچہ بعض مفسرین اس سورہ کی تمام آیات کو مکی سمجھتے ہیں لیکن زیادہ تر مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ اس کی کچھ آیات مکہ میں نازل ہوئیں اور کچھ مدینہ میں۔ مکی اور مدنی سورتوں کے جیسے مضامین ہوتے ہیں انھیں پیش نظر رکھتے ہوئے یہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے خصوصاً اس کی بعض آیات میں صراحت سے ہجرت یا ہجرت اور جہاد کی بات کی گئی ہے۔ مثلاً آیہ ۴۱ :

والذین هاجروا فی الله ......

اسی طرح آیہ ۱۱۰ :

ثم ان ربك للذین هاجروا من بعد ما فتنوا ثم جاهدوا وصبروا ......

ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں موضوعات ہجرت پیغمبرؐ کے بعد سے مناسبت رکھتے ہیں اور اگر آیہ ۴۱ میں ذکر ہجرت کو جعفر بن ابی طالب کی سربراہی میں مسلمانوں کی پہلی ہجرت یعنی ہجرت حبشہ کی طرف اشارہ سمجھا جائے تو آیت ۱۱۰ میں تو ہجرت اور جہاد دونوں کا اکٹھا ذکر آیا ہے۔ بہت بعید ہے کہ یہ پہلی ہجرت کی طرف ہو۔ اس آیت کو رسول اللہ کی ہجرت مدینہ کے علاوہ کسی اور پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں آیہ ۱۲۶ :

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ......

کی تفسیر میں مشہور ہے کہ یہ جنگ اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور جنگ اُحد ہجرت کے بعد ہوئی ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سورہ کی ابتدائی چالیس آیات تو مکہ میں نازل ہوئی ہیں اور باقی آیات مدینہ میں جبکہ بعض دیگر حضرات اس کی تین آیات کے علاوہ باقی سب آیات کو مکی سمجھتے ہیں اور ان تین آیات کو وہ جنگ اُحد کے سلسلے میں سمجھتے ہیں۔

امر مسلم یہ ہے کہ اس سورہ کو مکی اور مدنی آیات کا مرکب سمجھا جائے اگرچہ چند ایک آیات کے سوا ہر ہر آیت کے بارے حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مکی ہے یا مدنی۔

بہرحال اس سورہ کی آیات میں مکی سورتوں کی سی مخصوص بحث بھی نظر آتی ہے مثلاً توحید اور معاد کے بارے میں بحث قاطع اور شرک و بت پرستی سے سخت مقابلہ نیز مدنی سورتوں کی سی مخصوص بحث بھی موجود ہے مثلاً اجتماعی و معاشرتی احکام اور جہاد و ہجرت سے مربوط مسائل۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس سورہ کے مضامین دلکش اور مناسب انداز میں آپس میں ملے جلے ہوئے ہیں۔ مضامین کے مشتملات کچھ اس طرح سے ہیں :

۱۔ اس سورہ میں سب سے زیادہ نعمات الٰہی کے بارے میں بحث کی گئی ہے اس سلسلے میں ایسی تفصیلات بیان کی گئی ہیں

Marfat.com

کہ ہر آزاد انسان کے اندر احساس شکر گذاری بیدار ہوجاتا ہے اور اس طرح انسان ان سب نعمات وعنایات کے خالق کے زیادہ نزدیک ہوجاتا ہے۔

یہ نعمات ہیں، بارش، نور آفتاب، طرح طرح کے پودے، پھل پھول، میوے اور دیگر غذائی مواد۔ اسی طرح جانور کہ جو انسان کے خدمت گذار ہیں، منافع اور برکات کہ جو حیوانات سے انسان کو پہنچتے ہیں اور مختلف قسم کے وسائل واسباب زندگی۔ یہاں تک کہ اولاد اور بیوی کی نعمت۔ مختصر یہ کہ طرح طرح کے "طیبات"۔

اسی وجہ سے بعض اس سورہ کو "سورۂ نعم[1]" کہتے ہیں لیکن اس کا مشہور نام وہی "سورۂ نحل" ہے۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی گوناگوں نعمتوں کو شمار کرتے ہوئے اس میں شہد کی مکھی کی طرف بھی ایک معنی خیز اور عجیب وغریب اشارہ کیا گیا ہے۔ خصوصاً اس سے انسان کو حاصل ہونے والی اہم غذا کے حوالہ سے نیز اس حشرہ کی زندگی میں جو توحید کی نشانیاں موجود ہیں ان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۲۔ اس سورہ کا دوسرا موضوع کلام توحید، خلقتِ خدا کی عظمت، معاد اور مشرکین ومجرمین کو تہدید ہے۔

۳۔ اس سورہ کا ایک اور حصہ اسلام کے مختلف احکام مثلاً عدل واحسان، ہجرت وجہاد، فحشاء، منکر کی نہی اور ظلم وپیمان شکنی کی ممانعت پر مشتمل ہے۔ اسی طرح نعماتِ الٰہی کی شکر گذاری کی دعوت دی گئی ہے نیز اسی سلسلے میں توحید کے ہیرو حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ایک شکر گذار بندے کی حیثیت سے کیا گیا ہے۔

۴۔ گفتگو کا ایک اور پہلو مشرکین کی بدعات کے بارے میں ہے اور اس سلسلے میں کئی ایک جاذب نظر حسی مثالیں ذکر کی گئی ہیں۔

۵۔ نیز اس سورہ میں انسانوں کو شیطانی وسوسوں سے ڈرایا گیا ہے۔

اس سورہ کی فضیلت:۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

من قرأها لم يحاسبه الله تعالى بالنعم التي انعمها عليه في دار الدنيا

جو شخص اس سورہ کو پڑھے گا خدا تعالیٰ اس جہان میں اسے بخشی گئی نعمتوں کا حساب نہیں لے گا[2]۔

واضح ہے کہ ان آیات کی تلاوت کہ جن میں نعماتِ الٰہی کا اہم حصہ بیان ہوا ہے اگر فکر ونظر کے ساتھ ہو تو یہ عزم، عمل اور شکر گذاری کا سبب بن جاتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں انسان ہر نعمت کو ٹھیک اسی مقصد کے لیے صرف کرے گا جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے لہٰذا اس کے بعد اس سے کیسے یہ حساب لیا جائے کہ اس نے نعمت کو بجا صرف نہیں کیا۔

---

[1] "نعمت" کی جمع۔

[2] مجمع البیان جلد ۶ ص ۳۴۷۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَ تَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ○

۲۔ یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ
اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ○

ترجمہ

بخشنے والے مہربان خدا کے نام سے۔

۱۔ (مشرکوں اور مجرموں کی سزا کے بارے میں) حکم خدا پہنچ گیا ہے اس کے لیے جلدی نہ کرو۔ خدا اس سے منزہ و برتر ہے کہ اس کے لیے شریک قرار دیے جائیں۔

۲۔ روح الٰہی کے ساتھ ملائکہ کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے نازل کرتا ہے اور انھیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو ڈراؤ اور (ان سے کہو کہ) میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے لہٰذا (میرے حکم کی) مخالفت سے پرہیز کرو۔

تفسیر

حکمِ عذاب قریب ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس سورہ کی ابتدائی آیات کا اہم حصہ مکہ میں نازل ہوا ہے یہ وہ دن تھے جب پیغمبر اسلام کو مشرکوں اور بت پرستوں کی طرف سے شدید الجھاؤ اور سختی کا سامنا تھا۔ ہر روز وہ آپ کی حیات آفریں اور آزادی بخش دعوت کے خلاف کوئی نیا بہانہ تراشتے۔ ان میں سے ایک یہ تھا کہ جس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انھیں عذاب الٰہی کی تہدید کرتے تو بعض ہٹ دھرم کہتے کہ اگر یہ عذاب اور سزا کہ جس کی تم دھمکی دیتے ہو سچ ہے تو پھر وہ ہم پر نازل کیوں نہیں ہوتا اور شاید کبھی مزید کہتے کہ اگر فرض کیا عذاب آیا بھی تو ہم بتوں کا دامن تھام لیں گے۔ تاکہ وہ بارگاہِ الٰہی میں سفارش کریں کہ وہ ہم سے عذاب اٹھا لے کیا وہ اس کی بارگاہ کے شفیع نہیں ہیں۔

اس سورہ کی پہلی آیت ان اوہام پر خط بطلان کھینچتے ہوئے کہتی ہے: جلدی نہ کرو۔ مشرکوں اور مجرموں کی سزا کے بارے میں حکمِ الٰہی یقیناً پہنچ چکا ہے (اتی امر اللہ فلا تستعجلوہ) اور اگر تمھارا خیال ہے کہ بت اس کی بارگاہ کے سفارشی ہیں

Marfat.com

توتم سخت غلطی اوراشتباہ میں ہو۔ خدا اس سے منزہ اور برتر ہے کہ جسے تم اس کا شریک بناتے ہو (سبحانه و تعالی عما یشرکون)۔

لہٰذا اس آیت میں "امر الله" مشرکین کے لیے عذاب کے بارے میں حکم خدا کی طرف اشارہ ہے اور لفظ "اتی" اگرچہ فعل ماضی ہے اور گزشتہ زمانے میں اس حکم کے تحقق کی نشاندہی کرتا ہے لیکن اس کا مفہوم مضارع ہے اور یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ حکم یقیناً اور قطعاً تحقق پذیر ہوگا۔ ایسا قرآن میں کثرت سے ہے کہ قطعی الوقوع مضارع صیغہ ماضی کے ساتھ ذکر ہوا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "امر الله" خود عذاب کی طرف اشارہ ہے نہ کہ حکم عذاب کی طرف۔

بعض نے اس سے "روز قیامت" مراد لیا ہے۔

لیکن جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

نیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عذاب اور سزا کافی و وافی بیان اور عادلانہ اتمام حجت کے بغیر نہیں ہے لہٰذا بعد والی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: خدا ملائکہ کو خدائی روح کے ساتھ حکم الٰہی کے ہمراہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے (ینزل الملائکة بالروح من امره علی من یشاء من عباده[1])۔ اور انھیں حکم دیتا ہے کہ لوگوں کو ڈراؤ، شرک و بت پرستی پر متنبہ کرو اور کہو کہ میرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے (ان انذروا انه لا اله الا انا)۔ لہٰذا صرف میری نافرمانی سے ڈرو اور میرے سامنے احساس ذمہ داری کرو (فاتقون)۔

اس آیت میں روح سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین میں بہت اختلاف ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد وحی، قرآن اور نبوت ہے کہ جو انسانوں کی زندگی کا باعث ہے اگرچہ بعض مفسرین نے یہاں وحی کو قرآن سے اور ان دونوں کو نبوت سے جدا کیا ہے اور انھیں تین تفاسیر کی شکل میں بیان کیا ہے لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی حقیقت کی طرف لوٹتے ہیں۔

بہرحال "روح" یہاں معنوی اور روحانی پہلو سے ہے اور ہر اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو دلوں کی زندگی کا سبب ہیں اور نفوس کی تربیت اور عقلوں کی ہدایت کا باعث ہے جیسا کہ سورہ انفال کی آیہ ۲۴ میں ہے۔

یاایها الذین امنوا استجیبوا لله وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم

اے ایمان والو! خدا اور اس کے رسول کی دعوت قبول کرو۔ جبکہ وہ تمھیں ایسی چیز کی طرف پکارتے ہیں جو تمھاری زندگی کا باعث ہے۔

سورۂ مومن کی آیت ۱۵ میں ہے:

یلقی الروح من امره علی من یشاء من عباده

وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اپنے حکم سے روح القاء کرتا ہے۔

---

[1] "من امره" میں "من" ب کے معنی میں ہے اور یہاں بہیت کے معنی دیتا ہے۔

Marfat.com

نیز سورہ شوریٰ کی آیہ ۵۲ میں ہے۔

وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتاب ولا الایمان

اس طرح ہم نے اپنے حکم سے تجھ پر روح کو وحی کیا اس سے پہلے تو کتاب وایمان سے آگاہ نہ تھا۔

واضح ہے کہ ان آیات میں "روح" قرآن، مضامین وحی اور فرمانِ نبوت کے معنی میں ہے اگرچہ روح قرآن کی دیگر آیات میں اور معانی میں بھی آیا ہے لیکن ان مذکورہ قرائن کی طرف توجہ کرتے ہوئے زیر بحث آیت میں روح کا مفہوم قرآن اور مضمون وحی ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "علی من یشاء من عبادہ" (اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے) کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وحی و نبی کی نبوت بغیر کسی حساب کتاب کے ہے کیونکہ مشیت الٰہی کبھی اس کی حکمت سے جدا نہیں ہوتی اور حکیم ہونے کے تقاضا سے وہ یہ انعام اسے عطا کرتا ہے جو اس کا اہل ہو۔

ارشادِ الٰہی ہے۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ

خدا بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں قرار دے (انعام ——— ۱۲۴)

یہ نکتہ بھی نظر سے اوجھل نہ رہے کہ اگر انبیاء کے لیے پہلا فرمانِ الٰہی "ان انذروا" (ڈراؤ) ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک گمراہ اور آلودۂ شرک وفساد قوم کو بیدار کرنے کے لیے انذار سے بڑھ کر مؤثر کوئی چیز نہیں ——— انذار ——— بیدار کرنے والا۔ آگاہ کرنے والا اور حرکت آفرین۔

یہ ٹھیک ہے کہ انسان نفع کا طالب ہے اور نقصان پسند نہیں کرتا لیکن تجربہ نشاندہی کرتا ہے کہ تشویق کا اثر آمادہ افراد پر زیادہ ہوتا ہے جبکہ آلودہ افراد پر تہدید کا اثر بہت ہوتا ہے اور ابتدائے نبوت میں انذار اور ڈرانے والے امور ہونا چاہییں۔

Marfat.com

۳۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○

۴۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ○

۵۔ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○

۶۔ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ○

۷۔ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○

۸۔ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ؕ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۳۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے اور وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کے لیے شریک بناتے ہیں۔

۴۔ اس نے انسان کو ایک بے حیثیت نطفے سے پیدا کیا اور آخر کار وہ ایک موجود فصیح اور اپنا واضح مدافع قرار پایا۔

۵۔ اور اس نے چوپایوں کو پیدا کیا جبکہ ان سے تمھیں لباس اور دیگر منافع حاصل ہوتے ہیں اور تم ان کے گوشت میں سے کھاتے ہو۔

۶۔ اور تمھارے لیے ان میں زینت و شکوہ ہے جس وقت انھیں ان کی آرام گاہ کی طرف لوٹاتے ہو اور جب (صبح کے وقت) انھیں صحرا کی جانب بھیجتے ہو۔

۷۔ وہ تمھارے بھاری بوجھ ایسے مقام تک اٹھائے جاتے ہیں جہاں تک تم بہت مشقت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے کیونکہ تمھارا پروردگار رؤف و رحیم ہے۔

Marfat.com

۸۔ اور (اسی طرح) اس نے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان پر سوار ہو سکو اور وہ تمھاری زینت کا سبب بھی ہوں اور وہ (نقل و حمل کے) دیگر ذرائع پیدا کرے گا کہ جنھیں تم نہیں جانتے۔

تفسیر

جانوروں کے گوناگوں فائدے:

گزشتہ آیات میں شرک کی نفی کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ زیر بحث آیات میں شرک کی بیخ کنی کے لیے اور خدا کے یکتا کی طرف توجہ کے لیے دو حوالے سے بات کی گئی ہے۔ پہلے عقلی دلائل کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور عجیب و غریب نظامِ خلقت اور عظمتِ خلقت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور انسان کے لیے خدا کی طرح طرح کی نعمتوں کی جانب اشارہ کیا گیا ہے تاکہ اس میں شکرگزاری کا جذبہ بیدار ہو اور آخر کار اسے خدا کے قریب کر دے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے (خلق السمٰوٰت و الارض بالحق) آسمان و زمین کی حقانیت اس کے عجیب نظام سے بھی واضح ہے اور منظم و حساب شدہ آفرینش سے بھی، اس کے ہدف سے بھی اور اس میں موجود فوائد سے بھی۔

اس کے بعد مزید فرمایا: خدا اس سے برتر و بلند ہے کہ وہ اس کے لیے شریک بناتے ہیں (تعالٰی عما یشرکون)۔ بت کہ جنھیں وہ اس کا شریک قرار دیتے ہیں ایسی تخلیق کی صلاحیت ہرگز نہیں رکھتے یہاں تک کہ وہ تو معمولی سا مچھر یا غبار کا ذرہ بھی پیدا نہیں کر سکتے اس کے باوجود تم انھیں کس طرح خدا کا شریک قرار دیتے ہو۔

یہ بات لائقِ توجہ ہے کہ مشرکین خود اس عجیب نظام اور بدیع خلقت کو جو خالق کے علم و قدرت کی مظہر ہے کو صرف اللہ کی طرف سے جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ عبادت کے وقت بتوں کے سامنے خاک پر گر پڑتے ہیں۔

آسمان و زمین اور ان میں بے پایاں اسرار کی جانب اشارہ کرنے کے بعد خود انسان کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے وہ انسان کہ جو ہر کسی سے بڑھ کر اپنے آپ سے قریب ہے۔ فرمایا گیا ہے: انسان بے وقعت اور بے قیمت نطفے سے پیدا کیا گیا لیکن اس طرح پیدا ہو کر وہ فصیح و بلیغ متفکر، اپنا دفاع کرنے والا اور واضح کلام کرنے والا بن گیا۔ (خلق الانسان من نطفة فاذا هو خصيم مبين)۔

"نطفہ" کا اصلی معنی ہے تھوڑا یا صاف پانی۔ بعد میں ان قطرات کو نطفہ کہا جانے لگا جو تلقیح کے ذریعے انسانی پیدائش کا سبب بنتے ہیں۔

اس تعبیر سے درحقیقت قرآن خدا تعالیٰ کی عظیم قدرت کو مجسم صورت میں بیان کرنا چاہتا ہے کہ اس نے پانی کے بے حیثیت قطرے سے کیسی عجیب مخلوق پیدا کی ہے کہ جس کی قوسِ نزول اور قوسِ صعود کے درمیان بہت زیادہ فاصلہ ہے۔

یہ مفہوم اس صورت میں ہے جب "خصیم" کو مدافع اور اپنی باطنی حالت بیان کرنے والے کے معنی میں لیا جائے جیسا کہ

Marfat.com

سورۂ نساء کی آیہ ۱۰۵ میں ہے :

ولا تکن للخائنین خصیما

اے رسولؐ! خیانت کرنے والوں کے حامی اور مدافع نہ ہو۔

یہ تفسیر مفسرین کے ایک گروہ کے نزدیک قابلِ قبول ہے لیکن بعض مفسرین نے ایک اور تفسیر بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ :۔

خدا نے انسان کو اپنی قدرتِ کاملہ کے ذریعے ایک بے وقعت نطفے سے پیدا کیا لیکن یہ ناشکرا انسان خدا کے مقابلے میں کھلم کھلا مجادلہ اور مخاصمہ پر اٹھ کھڑا ہوا۔

یہ مفسرین سورہ یٰسٓ کی آیہ ۷۷ کو اس تفسیر پر شاہد کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

لیکن پہلا معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ زیر نظر آیات عظمتِ خلقتِ الٰہی کے بارے میں ہیں اور عظمت اس وقت آشکار ہوگی جب ظاہراً معمولی موجود سے وہ ایک قیمتی چیز پیدا کردے۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں بھی ہے کہ :

خلقه من قطرة من ماء منتن فيكون خصيمًا متكلمًا بليغًا

خدا نے انسان کو پانی کے بدبودار قطرے سے پیدا کیا ہے اور پھر وہ فصیح و بلیغ کلام کرنے والا ہو گیا۔[1]

خلقتِ انسان کے ذکر کے بعد ایک اور اہم نعمت کا بیان ہے اور وہ ہے چوپایوں کی خلقت اور ان سے حاصل ہونے والے فائدے۔ ارشاد ہوتا ہے : خدا نے چوپایوں کو پیدا کیا اور وہ تمھارے لباس اور پوشش کا ذریعہ ہیں۔ جب کہ ان سے تمھیں اور فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں اور تم ان کا گوشت کھاتے ہو۔ (و الانعام خلقها لكم فيها دفء و منافع و منها تأكلون)۔

اس آیت میں پہلے تو چوپایوں کی خلقت کا ذکر ہے اور یہ خدا کے علم و قدرت کی دلیل ہے اس کے بعد ان کے ذریعے جو مختلف نعمتیں حاصل ہوتی ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے سب سے پہلے "دفء" کا ذکر ہے یہ ہر قسم کے لباس اور پہناوے کو کہتے ہیں یہ اشارہ ہے جانوروں کی اُون اور چمڑے سے بنائی جانے والی چیزوں مثلاً لباس، سوئیٹر، کمبل، جوتا ٹوپی اور خیمہ وغیرہ کی طرف۔ دوسرے نمبر پر "منافع" کا لفظ آیا ہے یہ دودھ اور اس سے بنائی جانے والی چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا گیا ہے "ومنها تأكلون" یہ ان کے گوشت سے استفادہ کرنے کی جانب اشارہ ہے۔

یہ امر جاذبِ نظر ہے کہ ان فوائد میں سے سب سے پہلے لباس و پوشش اور مسکن و مکان کے مسئلے کو پیش نظر رکھا گیا ہے کیونکہ بہت سے لوگ (خصوصاً بادیہ نشین) ایسے ہیں کہ ان کا لباس بھی اون یا چمڑے سے تیار ہوتا ہے اور ان کے خیمے بھی جو انھیں سردی اور گرمی سے بچاتے ہیں بہرحال دوسری ہر چیز سے لباس و مکان کی زیادہ اہمیت کی دلیل ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین ج ۳ ص ۳۹

Marfat.com

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انھیں "منافع" سے پہلے ذکر کیا گیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ لباس ضرر کو روکنے کے لیے ہے اور ضرر کو روکنا حصولِ منافع پر مقدم ہے۔

ہو سکتا ہے وہ لوگ جو گوشت کھانے کے مخالف ہیں اس آیت سے یہ بھی مطلب نکالیں کہ خدا نے جانوروں کا گوشت کھانے کا مسئلہ ان کے "منافع" میں شمار نہیں کیا۔ لہٰذا "منافع" کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے: "و منها تأكلون" (اور تم ان حیوانات کا گوشت کھاتے ہو) اس تعبیر سے کم از کم یہ استفادہ تو کیا جا سکتا ہے کہ لبنیات کی اہمیت کہیں زیادہ ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن نے ان مفید جانوروں کے عام معمول کے فوائد بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان سے حاصل ہونے والے نفسیاتی فوائد کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یہ جانور تمھارے لیے زینت کا باعث ہوتے ہیں جب کہ انھیں آرام کی جگہ واپس لے کر جاتے ہو اور جب صبح کے وقت انھیں صحرا کی طرف بھیجتے ہو (ولكم فيها جمال حين تريحون وحين تسرحون)۔

"تریحون" "اراحه" کے مادہ سے غروب کے وقت جانوروں کو ان کے باڑوں اور آرام کی جگہوں کی طرف واپس لانے کے معنی میں ہے اسی لیے ان کے آرام کی جگہ کو "مراح" کہتے ہیں۔

"تسرحون" "سروح" کے مادہ سے چوپایوں کو صبح کے وقت چراگاہ کی طرف باہر لے جانے کے معنی میں ہے۔

بھیڑ بکریوں اور دوسرے چوپایوں کے بیابان اور چراگاہ کی طرف اکٹھے جانے اور پھر شام ڈھلے باڑوں اور آرام کی جگہ لوٹ آنے کے جاذب نظر منظر کو قرآن "جمال" سے تعبیر کرتا ہے یہ صرف ایک ظاہری، تکلفاتی اور رسمی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس میں ایک حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جس کا تعلق معاشرے کی گہرائیوں سے ہے یہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ خود کفیل ہوتا ہے فقیر و پس ماندہ نہیں ہے اور اس سے یا اس سے وابستہ نہیں ہوتا وہ خود وسائل مہیا کرتا ہے اور جو کچھ خود اس کے پاس ہوتا ہے اسے صرف کرتا ہے یہ دراصل معاشرے کا جمالِ استغناء اور خود کفالت ہے یہ درحقیقت جمالِ تولید اور ایک ملت کی ضروریات کی تکمیل ہے۔ واضح تر الفاظ میں یہ استقلال، آزادی کے جمال اور ہر قسم کی وابستگی سے نجات ہے۔

اس حقیقت کو دیہات میں رہنے والے اور دیہات میں پیدا ہونے والے شہروں میں رہنے والوں سے بہتر سمجھ سکتے ہیں، کہ جب یہ مفید چوپائے آتے جاتے ہیں تو انھیں دیکھ کر انھیں کیسا روحانی اور دلی سکون ہوتا ہے ایسا سکون جو بے نیازی کے احساس سے اٹھتا ہے ایسا سکون جو ایک مؤثر اجتماعی ذمہ داری کی انجام دہی پر ہوتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ نظر آیت میں پہلے ان کے صحرا سے لوٹنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کیونکہ جب یہ ڈھور ڈنگر صحرا سے لوٹتے ہیں تو ان کے پستان دودھ سے بھرے ہوتے ہیں، شکم سیر ہوتے ہیں اور ان کے چہرے سے خوشی اور طمانیت جھلک رہی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس وقت ان میں وہ حرص اور جلد بازی نظر نہیں آتی جو صبح دم صحرا کی طرف جاتے ہوئے ہوتی ہے۔ اطمینان سے کشاں کشاں قدم اٹھاتے ہیں اور اپنے آرام کی جگہ پر جا پہنچتے ہیں۔ ان کے دودھ بھرے پستانوں کو دیکھنے والا ہر کوئی ایک بے نیازی کا احساس کرتا ہے۔

Marfat.com

اگلی آیت میں ان جانوروں کے ایک اور اہم فائدے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے وہ تمھارے بھاری بوجھ اپنی پشت پر اٹھا کرلے جاتے ہیں اور ایسے دیار کی طرف لے جاتے ہیں جہاں تک تم شدید مشقت کے بغیر نہ پہنچ پاتے (و تحمل اثقالکم الیٰ بلد لم تکونوا بالغیه الا بشق الانفس) ۔ یہ خدا کی رحمت و کرم کی نشانی ہے کہ اس نے ان چوپایوں کو اتنی طاقت بخشی اور انھیں تمھارے قابو میں کر دیا کیونکہ "تمھارا پروردگار رؤف و رحیم ہے" (ان ربکم لرءوف رحیم) ۔

"شِق" "مشقت" کے مادہ سے ہے لیکن بعض مفسرین نے احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ شگاف کرنے اور آدھا آدھا کرنے کے معنی میں ہے یعنی تم خود اس وزن کو اپنے کندھے پر لاد کر جاؤ تو تمھاری آدھی قوت ختم ہو جائے ۔ اصطلاح کے مطابق نیم جاں ہو جاؤ لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔

اس طرح یہ چوپائے پہلے تو انسان کے لیے لباس اور گرمی سردی سے بچنے کا ذریعہ مہیا کرتے ہیں دوسرے درجے پر ان کے لبنیات سے تیار شدہ چیزوں سے استفادہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کا گوشت استعمال کیا جاتا ہے اس کے بعد ان کے وہ نفسیاتی آثار ہیں جو احساسات پر مرتب ہوتے ہیں اور آخر میں ان کی باربرداری کا ذکر ہے ۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس دور میں جو کہ مشین کا زمانہ ہے اس میں بھی بہت سے مواقع پر صرف چوپایوں سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور جہاں کوئی اور طریقہ کارآمد بھی نہیں ہے

اس کے بعد ایسے جانوروں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو انسان کی سواری کے کام آتے ہیں ۔ ارشاد ہوتا ہے : خدا نے گھوڑے خچر اور گدھے پیدا کیے ہیں تا کہ تم ان پر سواری کر سکو اور وہ تمھاری زینت کا سبب بھی بنیں (و الخیل و البغال و الحمیر لترکبوها و زینة) ۔

واضح ہے کہ یہاں لفظ "زینت" کوئی تکلفاتی اور رسمی طور پر نہیں آیا جو شخص تعلیمات قرآن سے آشنا ہے اس کے لیے اس کا مفہوم واضح ہے ۔ وہ وہ زینت ہے جس کا اثر اجتماعی زندگی میں ظاہر ہوتا ہے اس حقیقت کی تہ تک پہنچنے کے لیے آپ اس شخص کی حالت کا تصور کریں کہ جس نے ایک طویل بیابانی راستے کو پاپیادہ طے کیا ہو اور تھکا ماندہ اپنی منزل تک پہنچا ہے ۔ ایک عرصے تک کام کرنے کے قابل نہ رہا ہو اس کا موازنہ ایسے شخص سے کریں کہ سواری جس کے پاس ہو اور وہ بہت جلد اپنی منزل پر پہنچ گیا ہو ۔ اس کی قوت و توانائی اسی طرح باقی ہو، خوش و خرم ہو اور اپنے آئندہ امور کی انجام دہی کے لیے تیار ہو ——— تو کیا یہ زینت نہیں ہے ؟

آیت کے آخر میں ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور انسانی افکار کو آئندہ زمانے میں نقل و حمل کے نئے پیدا ہونے والے ذرائع کی طرف متوجہ کیا گیا ہے یعنی آئندہ زمانے میں انسان کے پاس ان جانوروں کی نسبت نقل و حمل کے بہتر اور خوب تر ذرائع ہوں گے ۔ ارشاد ہوتا ہے خدا تعالیٰ (نقل و حمل کے لیے) کئی ایک چیزیں پیدا کرے گا کہ جنھیں تم نہیں جانتے (و یخلق ما لا تعلمون) ۔

بعض گذشتہ مفسرین نے اگرچہ اس جملے کو ایسے جانوروں کی طرف اشارہ سمجھا ہے جو آئندہ پیدا ہوں گے اور نوع بشر کے مطیع ہوں گے لیکن جیسا کہ تفسیر مراغی اور تفسیر فی ظلال میں ہے ہمارے لیے اس جملے کا مفہوم سمجھنا آسان ہے کیونکہ ہم مشینی اور تیز رفتار

Marfat.com

سواریوں کے زمانے میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

یہ جو لفظ "یخلق" (پیدا کرے گا) استعمال کیا گیا اس کی دلیل واضح ہے کیونکہ انسان درحقیقت چیزوں کو جوڑ کر اور ملا کر ایجادات کرتا ہے اور کچھ نہیں جبکہ ان چیزوں کا اصلی مواد صرف خدا کی تخلیق ہے علاوہ ازیں انسانی ایجادات میں موجود استعداد خدا ہی کی عطا کردہ ہے۔

جانور پالنے اور کھیتی باڑی کی اہمیت

آج کے زمانے میں پیداواری کارخانے اور مشینیں اتنی زیادہ ہیں کہ تمام دوسری چیزیں ماند پڑ گئی ہیں لیکن آج بھی انسانی زندگی کی پیداوار کا ایک اہم حصہ جانور پالنے اور کھیتی باڑی سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ غذائی مواد کی حقیقی بنیاد یہی دو امور ہیں اسی بناء پر جانوروں اور کھیتی باڑی کی ضروریات میں خود کفالت نہ صرف اقتصادی استقلال کی ضامن ہے بلکہ سیاسی استقلال بھی بہت حد تک اس سے مربوط ہے لہٰذا کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ساری دنیا کی قومیں جانوروں کی نشو و نما کو وسعت دینے اور اس کی وسعت کے لیے ماڈرن ذرائع استعمال کرنے میں کوشاں ہیں۔

یہ دونوں چیزیں اتنی اہم اور بنیادی ہیں کہ بعض اوقات ان ممالک میں سے جنھیں سوپر پاور کہا جاتا ہے مجبور ہو جاتے ہیں کہ اپنے سیاسی مقام کو نظر انداز کر کے ان ممالک کے سامنے ہاتھ پھیلائیں جو عین ان کے مخالف ہیں۔ اس کے لیے روس کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

اسی بناء پر اسلام اور اس کی حیات بخش تعلیمات میں جانوروں کی پرورش اور زراعت کے مسئلے کو انتہائی زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور ان امور کے لیے مسلمانوں کو ترغیب دینے کے لیے ہر موقع سے استفادہ کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن جانوروں کے مسئلے پر کس تشویق آمیز لہجے میں بات کرتا ہے ان سے حاصل ہونے والے منافع کا ذکر کرتا ہے چاہے وہ غذائی اعتبار سے ہوں یا لباس کے لحاظ سے۔ یہاں تک کہ صحرا میں ان کے آنے جانے کا ذکر بڑے حسین پیرائے میں کرتا ہے۔

زراعت، کھیتی باڑی اور مختلف قسم کے پھلوں کی اہمیت کے بارے میں اسی طرح آئندہ آیات میں عمومی اعتبار سے گفتگو ہو گی۔

اسلامی روایات میں جانور پالنے کے بارے میں نہایت جاذبِ توجہ تعبیرات نظر آتی ہیں اسی طرح کھیتی باڑی کے بارے میں بہت سی روایات ہیں ہم نمونے کے طور پر اسلامی مصادر سے چند ایک روایات پیش کرتے ہیں۔

۱۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایک عزیز سے فرمایا:

تم اپنے گھر میں "برکت" کیوں نہیں لاتے ہو؟

اس نے عرض کیا: "برکت" سے آپ کی کیا مراد ہے؟

فرمایا: "شاۃ تحلب"

Marfat.com

(دودھ دینے والی بکری)

مزید فرمایا:۔

انه من كانت فى داره شاة تحلب او نعجة او بقرة فبركاة كلهن

جس کے گھر میں دودھ دینے والی بکری، بھیڑ یا گائے ہو تو یہ سب برکتیں ہیں [1]

۲۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے کہ آپ نے بکری کی اہمیت کے بارے میں فرمایا:۔

نعم المال الشاة

بکری بہت اچھا سرمایہ ہے [2]

۳۔ تفسیر نور الثقلین میں زیر بحث آیات کے ذیل میں امام امیر المومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے:

افضل ما يتخذه الرجل فى منزله لعياله الشاة فمن كان فى منزله شاة قدست عليه الملائكة مرتين فى كل يوم

اپنے اہل خانہ کے لیے انسان گھر میں جو بہترین چیز مہیا کرتا ہے وہ بکری ہے جس شخص کے گھر میں بکری ہو خدا کے فرشتے ہر روز دو مرتبہ اس کی تقدیس کرتے ہیں۔

یہاں غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے، ممکن ہے بہت سے لوگوں کے گھر میں بکری پالنے کے لیے حالات سازگار نہ ہوں لیکن اصلی مقصد یہ ہے کہ جتنے گھر ہوں اتنی بھیڑ بکریاں ہمیشہ پالتے رہنا چاہیے (غور کیجیے گا)۔

۴۔ زراعت کی اہمیت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: من وجد ماءً وترابا ثم افتقر فابعده الله۔ جس کے پاس پانی اور مٹی ہو اس کے باوجود وہ فقیر ہو، خدا اسے اپنی رحمت سے دور رکھے [3]

واضح ہے کہ یہ عظیم بات جیسے ایک شخص پر صادق آتی ہے اسی طرح ایک قوم پر بھی صادق آتی ہے جن کے پاس مٹی اور پانی کافی مقدار میں موجود ہے پھر بھی وہ دوسروں کے دست نگر ہوں تو یقیناً وہ رحمت خدا سے دور ہیں۔

۵۔ پیغمبر اکرمؐ سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

عليكم بالغنم والحرث فانهما يروحان بخير ويغدوان بخير

تمھاری ذمہ داری ہے کہ بھیڑ بکریاں پالو اور کھیتی باڑی کرو ان کا لین دین خیر و برکت کا باعث ہے [4]۔

---

[1] بحار الانوار ج ۱۴ ص ۶۸۶ طبع قدیم۔ مذکورہ حدیث میں بکری اور گائے کے علاوہ "نعجة" کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ لغت میں اس لفظ کے بہت سے معانی درج ہیں مثلاً وحشی گائے، پہاڑی بکری اور بھیڑ۔

[2] بحار الانوار جلد ۱۴ ص ۶۸۶ طبع قدیم۔

[3] بحار الانوار جلد ۲۳ ص ۱۹۔

[4] بحار الانوار جلد ۱۴ ص ۲۰۲۔

Marfat.com

۶۔ امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپؑ نے فرمایا:

ما فی الاعمال شیء احب الی الله من الزراعة

خدا کے ہاں زراعت سے زیادہ کوئی عمل محبوب نہیں۔[1]

۷۔ امام صادق علیہ السلام ہی سے ایک اور حدیث منقول ہے، فرماتے ہیں:

الزارعون کنوز الانام تزرعون طیبًا اخرجه الله عزوجل وهم یوم القیمة احسن الناس مقامًا واقربهم منزلة یدعون المبارکین

کسان لوگوں کے خزانے ہیں وہ خدا کا عطا کردہ پاکیزہ اناج بوتے ہیں قیامت کے دن وہ بلند ترین مقام کے حامل ہوں گے وہ خدا کے زیادہ قریب ہیں اس روز انھیں "مبارکین" کے نام سے پکارا جائے گا۔[2]

---

[1] بحار الانوار جلد ۲۳ صفحہ ۲۰۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۳ صفحہ ۱۹۴۔

Marfat.com

۹۔ وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ
أَجْمَعِينَ ۝
۱۰۔ هُوَ الَّذِىٓ أَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۖ لَّكُم مِّنْهُ شَرَابٌ وَمِنْهُ
شَجَرٌ فِيهِ تُسِيمُونَ ۝
۱۱۔ يُنۢبِتُ لَكُم بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُونَ وَالنَّخِيلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِن
كُلِّ الثَّمَرَٰتِ ۗ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ۝
۱۲۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ وَالنُّجُومُ
مُسَخَّرَٰتٌۢ بِأَمْرِهِۦٓ ۗ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝
۱۳۔ وَمَا ذَرَأَ لَكُمْ فِى الْأَرْضِ مُخْتَلِفًا أَلْوَٰنُهُۥٓ ۗ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَةً
لِّقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ ۝

ترجمہ

۹۔ خدا کے ذمہ ہے کہ وہ بندوں کو راہِ راست کی نشاندہی کرے البتہ بعض راستے گمراہی کے ہیں اور اگر خدا چاہے تو تم سب کو (جبری طور) ہدایت کرے (لیکن مجبور کرنے کا کوئی فائدہ نہیں)۔

۱۰۔ وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی بھیجا کہ جسے تم پیتے ہو نیز یہ پودے اور درخت بھی اسی سے اُگتے ہیں کہ جنھیں چرنے کے لیے تم اپنے جانور لے کر جاتے ہو۔

۱۱۔ اس (بارش کے پانی ہی) سے خدا تمھاری کھیتیاں اگاتا ہے اسی سے وہ تمھارے لیے زیتون، کھجور انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں واضح نشانی موجود ہے۔

۱۲۔ اس نے رات دن اور سورج چاند کو تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے نیز ستارے بھی اس کے حکم سے تمھارے لیے مسخر ہیں اس میں ان لوگوں کے لیے (عظمتِ خدا کی) نشانیاں ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔

Marfat.com

۱۳۔ (ان کے علاوہ) جو رنگارنگ مخلوق اس زمین میں پیدا کی گئی ہے اسے بھی (تمھارے حکم کے سامنے) مسخر کر دیا گیا ہے اس میں ان لوگوں کے لیے واضح نشانی ہے جو متذکر ہوتے ہیں۔

تفسیر

سب چیزیں انسان کے دستِ تسخیر میں ہیں:

گذشتہ آیات میں خدا کی مختلف نعمتوں کا ذکر تھا زیرِ نظر آیات میں بھی خدا کی بعض نہایت اہم نعمتوں کا ذکر ہے۔

ایک بہت اہم معنوی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا کے ذمے ہے کہ لوگوں کو اس صراطِ مستقیم کی ہدایت کرے جس میں کوئی انحراف اور کجی نہیں ہے۔ (وعلی اللہ قصد السبیل)۔

"قصد" راستہ صاف ہونے کے معنی میں ہے لہذا "قصد السبیل" کا معنی "سیدھا راستہ" ہوگا یعنی وہ راستہ جس میں انحراف اور گمراہی نہ ہو۔[۱]

اس بارے میں کہ یہ "سیدھا راستہ" تکوینی پہلو سے ہے یا تشریعی پہلو سے، اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں لیکن کوئی مانع نہیں کہ اس میں دونوں پہلو شامل ہوں۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ خدا نے انسان کو مختلف توانائیاں عطا کی ہیں اور اسے طرح طرح کی استعدادیں دی ہیں تاکہ تکامل و ارتقاء کی راہ میں اس کی مدد کی جائے کیونکہ تکامل و ارتقاء اس کا مقصدِ خلقت ہے اسی طرح نباتات اور دیگر مختلف جانداروں کو بھی اس ہدف تک پہنچنے کے لیے ضروری توانائیاں عطا کی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انسان اپنے ارادے کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ جبکہ نباتات اور جانور بے اختیار اپنے ہدف کی طرف جاتے ہیں۔ نیز تکاملِ انسان کی قوسِ صعودی کا بھی دیگر جانداروں سے کوئی موازنہ نہیں ہے۔

اس طرح خدا تعالیٰ نے خلقت اور تکوین کے اعتبار سے عقل و استعداد اور دیگر لازمی توانائیاں عطا کر کے اسے اس صراطِ مستقیم پر چلنے کے لیے تیار کیا ہے۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو وحیِ آسمانی، درکار تعلیمات اور انسانی ضرورت کے قوانین کے ساتھ بھیجا تاکہ تشریعی لحاظ سے صحیح اور غلط راستے کو جدا جدا کر کے دکھا دیں اور اس راستے پر چلنے کے لیے انسان کے شوق کو ابھاریں اور اسے انحرافی راستوں سے باز رکھیں یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں خدا تعالیٰ نے اس امر کو اپنا ایک فریضہ شمار کیا ہے۔ اور "علی اللہ" (خدا پر لازم ہے) کے الفاظ استعمال کیے ہیں قرآن کی دیگر آیات میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً

(ان علینا للھدٰی

---

[۱] بعض بزرگ مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی نے "المیزان" میں "قصد" کو "قاصد" کے معنی میں لیا ہے کہ جو "جائر" (حق سے منحرف) کا الٹ ہے۔

Marfat.com

ہم پر لازم ہے کہ ہم انسان کی ہدایت کریں۔ (دلیل — ۱۲)

اگر ہم "علی اللہ قصد السبیل" کے مفہوم کی وسعت پر غور کریں اور تمام مادی و روحانی توانائیاں جو خلقت انسان اور اس کی تعلیم و پرورش میں استعمال ہوئی ہیں کے بارے میں سوچیں تو ہمیں "قصد السبیل" کی عظمت کا اندازہ ہوگا کہ جو تمام نعمتوں سے برتر ہے۔

انحرافی راستے چونکہ بہت زیادہ ہیں اس لیے قرآن اگلے مرحلے پر انسان کو بیدار کرتے ہوئے کہتا ہے: ان راستوں میں سے بعض انحرافی ہیں (و منھا جائر)[1]

انسان کے کمال وارتقاء کے لیے چونکہ اختیار وارادے کی آزادی اہم ترین عامل ہے لہٰذا قرآن ایک مختصر سے جملے کے ذریعے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے "اگر خدا چاہتا تو تم سب کو زبردستی راہ راست کی ہدایت کرتا" یہاں تک کہ تم ایک قدم بھی آگے اس سے نہ رکھ سکتے (ولو شاء لھدٰکم اجمعین) لیکن اس نے یہ کام نہیں کیا کیونکہ جبری ہدایت نہ باعث افتخار ہے اور نہ تکامل وارتقاء کا ذریعہ ——— اس نے تمھیں آزادی دی ہے تاکہ تم یہ راستہ اپنے قدموں سے طے کرو اور اوج کمال تک جا پہنچو۔

قرآن کا جملہ ضمنی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ اگر انسانوں کا ایک حصہ منحرف راستے کی طرف چل پڑتا ہے تو اس سے یہ وہم پیدا نہ ہو کہ ان کے مقابلے میں خدا مغلوب ہوگیا ہے بلکہ اس کی خواہش اور تقاضائے حکمت ہے کہ انسان آزاد ہیں۔

اگلی آیت میں پھر مادی نعمت کا ذکر ہے تاکہ انسانوں کے احساس شکر کو ابھارا جائے اور ان کے دلوں میں عشق الٰہی کے نور سے اجالا کیا جائے اور انھیں ان نعمتوں کے عطا کرنے والے کی زیادہ سے زیادہ معرفت کی دعوت دی جائے۔ قرآن کہتا ہے: وہ وہی ہے جس نے آسمان سے پانی نازل کیا (ھو الذی انزل من السمآء ماءً) حیات بخش، میٹھا، صاف وشفاف اور ہر قسم کی آلودگی سے پاک پانی ——— جسے تم پیتے ہو (لکم منه شراب)۔

اور اسی سے پودے اور درخت نکلتے ہیں کہ جنھیں چرنے کے لیے تم اپنے جانور بھیجتے ہو (و منه شجر فیه تسیمون)۔

"تسیمون" "اسامه" کے مادہ سے جانوروں کو چرانے کے معنی میں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ جانور زمین کے پودوں سے بھی استفادہ کرتے ہیں اور درختوں کے پتوں سے بھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ عربی لغت میں "شجر" کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ یہ لفظ درخت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور پودے کے لیے بھی۔

اس میں شک نہیں کہ بارش کا فائدہ یہی نہیں کہ اس کا پانی انسانوں کے پینے اور پودوں کے اگنے کے کام آتا ہے بلکہ اس سے

---

[1] "منھا" کی ضمیر "سبیل" کی طرف لوٹتی ہے اور سبیل مؤنث مجازی ہے۔

Marfat.com

ہوا صاف ہو جاتی ہے انسانی جسم کو درکار رطوبت اور نمی حاصل ہوتی ہے انسانی تنفس میں سہولت کا باعث ہے اور اسی طرح اس بارش کے اور بے شمار فائدے ہیں لیکن چونکہ مذکورہ دو باتیں زیادہ اہم تھیں اس لیے فقط انھی کا ذکر کیا گیا ہے۔

قرآن بات جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے: بارش کے پانی ہی سے تمھاری کھیتیاں اگاتا ہے (ینبت لکم بہ الزرع والزیتون والنخیل والاعناب) مختصر یہ کہ تمام پھل اسی سے اُگتے ہیں (ومن کل الثمرات)۔

یقیناً یہ رنگا رنگ پھل اور طرح طرح کی کھیتیاں خدا کی طرف سے ان لوگوں کے لیے واضح نشانیاں ہیں جو صاحب فکر ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیۃ لقوم یتفکرون)۔

"زرع" کے مفہوم میں ہر طرح کی زراعت شامل ہے" زیتون " ایک خاص درخت کا نام ہے اور اس درخت کے پھل کو بھی "زیتون" کہتے ہیں (لیکن بعض مفسرین کے نزدیک "زیتون" صرف درخت کا نام ہے اور "زیتونہ" اس کے پھل کا نام ہے جبکہ سورۂ نور کی آیہ ۳۵ میں لفظ "زیتونہ" خود درخت کے لیے استعمال ہوا ہے)۔

"نخیل" کا معنی ہے "کھجور کا درخت" یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

"اعناب" جمع ہے "عنب" کی جس کا معنی ہے انگور۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے تمام پھلوں میں سے صرف ان تین پھلوں زیتون، کھجور اور انگور کا ذکر کیوں کیا ہے اس کی دلیل انشاء اللہ آپ اسی آیت میں پڑھیں گے۔

اس کے بعد اس نعمت کی طرف اشارہ ہے کہ اس جہان کے مختلف موجودات انسان کے لیے مسخر کر دیئے گئے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے اللہ نے تمھارے لیے رات اور دن کو مسخر کر دیا ہے اور اسی طرح سورج اور چاند کو بھی (وسخر لکم اللیل والنھار والشمس والقمر) اسی طرح ستارے بھی حکم انسان کے سامنے مسخر ہیں (والنجوم مسخرات بامرہ)۔

ان امور میں یقیناً خدا اور اس کی خلقت کی عظمت کی نشانیاں ہیں ان کے لیے جو عقل و فکر رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یعقلون)۔

سورۂ رعد اور سورۂ ابراہیم کے ذیل میں ہم کہہ چکے ہیں کہ انسان کے لیے موجودات کے مسخر ہونے کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ موجودات انسانی فائدے کے لیے مصروفِ خدمت ہوں اور انسان کو اس بات کا امکان فراہم کریں کہ وہ ان سے استفادہ کر سکے۔ اسی بناء پر رات، دن، سورج، چاند اور ستاروں میں سے ہر کوئی انسان کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں اور انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اس لحاظ سے یہ موجودات انسان کے لیے مسخر ہیں۔

یہ جاذبِ نظر تعبیر کہ موجودات حکم خدا سے انسان کے لیے مسخر ہیں۔ اسلام اور قرآن کی نگاہ میں انسان کے مقام اور حقیقی عظمت کو واضح کرتی ہے اور اس کے خلیفۃ اللہ ہونے کی اہلیت کا اظہار کرتی ہے اس تعبیر کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خدا کی گوناگوں نعمتوں کا ذکر کر کے انسان کے جذبۂ تشکر کو ابھارا جائے اور وہ اس عمدہ و بدیع نظام کی اپنے لیے تسخیر کو دیکھتے ہوں خدا کے نزدیک ہو جائے۔

اسی لیے آیت کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے: اس تسخیر کے لیے ان میں نشانیاں ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اسرار تسخیر سے زیادہ

Marfat.com

آگاہی کے لیے سورۂ ابراہیم کی آیات ۳۲ اور ۳۳ کی تفسیر دیکھیے ۔
ان کے علاوہ "زمین میں پیدا کی گئی مخلوقات کو بھی تمھارے لیے مسخر کردیا گیا ہے" (وما ذرألکم فی الارض)۔ رنگا رنگ کی مخلوقات (مختلفًا الوانہ) طرح طرح کے لباس، مختلف قسم کی غذائیں، پاکیزہ بیویاں، آرام و آسائش کے وسائل، قسم قسم کی معدنیات، زیرِ زمین اور بالائے زمین مفید چیزیں اور دوسری نعمتیں ——— "ان میں بھی واضح نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھ جاتے ہیں" (ان فی ذٰلک لاٰیۃ لقوم یذکرون)۔

چند اہم نکات

۱۔ مادّی اور روحانی نعمتیں: یہ بات جاذب توجہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں مادی و روحانی نعمتیں اس طرح آپس میں ملی جلی ہوئی ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اس کے باوجود آیات کے اس سلسلے میں مادی اور روحانی نعمتوں کے بارے میں لب و لہجے میں ایک فرق ضرور ہے ۔

کسی موقع پر یہ نہیں کہا گیا کہ خدا پر لازم ہے کہ تمھارے لیے فلاں روزی پیدا کرے لیکن راہِ راست کی ہدایت کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ خدا پر لازم ہے کہ وہ تمھیں سیدھے راستے کی ہدایت کرے اور اس راستے کو طے کرنے کے لیے درکار قوت و توانائی بھی تمھیں عطا کرے، تکوینی لحاظ سے بھی اور تشریعی لحاظ سے بھی ۔ اصولی طور پر قرآن کی یہ روش ہی نہیں کہ وہ کسی بحث کے صرف ایک ہی پہلو پر نظر رکھے ۔ یہاں تک کہ درختوں اور پھلوں کی خلقت اور چاند سورج کے تسخیر ہونے کی بات کرتے ہوئے بھی معنوی و روحانی ہدف کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے یہ مادی نعمتیں بھی خلقت و خالق کی عظمت کی نشانی ہیں ۔

۲۔ زیتون، کھجور اور انگور ہی کا ذکر کیوں؟ ہوسکتا ہے یہ سمجھا جائے کہ قرآن نے مندرجہ بالا آیت میں طرح طرح کے پھلوں میں سے زیتون، کھجور اور انگور کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ نزولِ قرآن کے علاقے میں موجود تھے لیکن قرآن کے عالمی اور جاودانی ہونے اور اس کی تعبیرات کی گواہی کی طرف توجہ کرتے ہوئے واضح ہوجاتا ہے کہ مطلب اس سے کہیں اونچا ہے ۔

غذا شناس اور وہ عظیم سائنس دان جنھوں نے اپنی عمر کے سالہا سال مختلف پھلوں کے خواص کے مطالعے میں صرف کیے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بہت کم پھل ایسے ہیں جو غذائیت کے اعتبار سے انسانی جسم کے لیے ان تین پھلوں جتنے مفید اور مؤثر ہوں وہ کہتے ہیں کہ زیتون کا تیل بدن کے جلے ہوئے حصے کے پھر سے بننے کے لیے بہت اہم کردار ادا کرسکتا ہے اس میں حرارت بہت زیادہ ہوتی ہے اسی بناء پر یہ ایک قوت بخش شے ہے ۔ جو لوگ اپنی صحت و سلامتی کی حفاظت چاہتے ہیں انھیں اس اکسیر سے استفادہ کرنا چاہیے ۔

زیتون کا تیل انسان کے جگر کا مخلص دوست ہے گردوں اور صفرا کے عوارض اور گردے اور جگر کے درد رفع کرنے کے لیے اور خشکی کو دور کرنے کے لیے بہت ہی مؤثر ہے اسی بناء پر اسلامی روایات میں بھی اس کی بہت مدح و ثنا اور توصیف کی گئی ہے ۔ ایک حدیث میں امام علی بن موسیٰ الرضاؑ سے زیتون کے بارے میں مروی ہے:

بڑی اچھی غذا ہے، منہ کو خوشبودار بنادیتی ہے بلغم کو دور کرتی ہے چہرے کو صفائی اور تازگی بخشتی ہے ۔

Marfat.com

اعصاب کو تقویت دیتی ہے۔ بیماری اور درد کو ختم کر دیتی ہے اور غصّے کی آگ کو بجھا دیتی ہے[۱]

اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ خود قرآن میں زیتون کے درخت کو "شجرہ مبارکہ" (بابرکت درخت) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

اسی طرح میڈیکل سائنس اور علم غذاشناسی کی ترقی نے دوائی حیثیت سے کھجور کی اہمیت کو بھی درجۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔

کھجور میں موجود کیلشیم ہڈیوں کی مضبوطی اور پختگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں نیز اس میں فاسفر Phosphore بھی موجود ہے جس سے دماغ کے اصلی عناصر کی تشکیل ہوتی ہے۔ یہ اعصاب کو کمزوری اور خستگی سے بھی بچاتا ہے اور قوتِ بینائی کو زیادہ کرتی ہے۔

اس میں پوٹاشیم بھی موجود ہے جبکہ پوٹاشیم کی بدن میں کمی ہی زخم معدہ کی حقیقی وجہ سمجھی جاتی ہے نیز اس کا وجود پٹھوں اور بدن کے تانے بانے کے لیے بہت ہی قیمتی ہے دورِ حاضر کے غذاشناسوں میں یہ بات مشہور ہے کہ کھجور سرطان کو روکتی ہے کیونکہ اس سلسلے میں جو اعداد و شمار مہیا ہوئے ہیں وہ نشاندہی کرتے ہیں کہ جن علاقوں میں کھجوریں زیادہ کھائی جاتی ہیں وہ سرطان کی بیماری میں کم مبتلا ہوتے ہیں۔ عرب کے بدو اور صحرانشین جن کی زندگی فقر و فاقے میں گزرتی ہے کھجور کھانے کی وجہ سے کبھی سرطان میں مبتلا نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ کھجور میں میگنیشم (Magnesium) موجود ہے۔

خرمے میں شکر بہت ہے اور یہ شکر کی زیادہ صحیح اور بہتر قسم ہے یہاں تک کہ بعض مواقع پر شوگر کی بیماری میں مبتلا شخص بھی آرام کے ساتھ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

سائنس دانوں نے کھجور میں تیرہ قسم کے حیاتی مادے اور پانچ طرح کے وٹامن معلوم کیے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نہایت قیمتی اور بھرپور غذا ہے[۲]۔ اسی بنا پر اسلامی روایات میں بھی اس کے بارے میں بہت زیادہ تاکید نظر آتی ہے، حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے آپؑ نے فرمایا:

کل التمر فان فیہ شفاء من الادواء

کھجور کھاؤ کہ اس میں بہت سی بیماریوں کا علاج ہے۔

نیز یہ بھی روایت ہے کہ حضرت علیؑ کی غذا اکثر اوقات روٹی اور کھجور پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایک اور روایت میں ہے:

جس گھر میں کھجور کا درخت نہیں اس کے رہنے والے درحقیقت بھوکے ہیں[۳]

---

[۱] اسلام پزشک بی دارو، ص ۱۰۶

[۲] کتاب "اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر"، جلد ۷، ص ۶۵۔ یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اس کتاب کی ساتویں جلد میں غذاؤں ہی کے خواص بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں علاج کے طور پر کھجور اور خرما کے بارے میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کا مطالعہ ان دونوں غذاؤں کی اہمیت سے آشنا کرتا ہے۔

[۳] سفینۃ البحار، جلد ۱، ص ۱۲۵

Marfat.com

سورۂ مریم کی آیات میں بھی آئے گا کہ حضرت مریم جس بیابان میں تھیں وہاں کچھ بھی نہ تھا جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں تازہ کھجوریں عطا کیں یہ اس طرف اشارہ ہے کہ زچہ کے لیے تازہ کھجور بہترین غذاؤں میں سے ہے۔ یہاں تک کہ اس آیت کے ذیل میں آنے والی روایات کے مطابق اس حالت میں عورتوں کے لیے بہترین دوا کھجور ہی ہے۔[1]

باقی رہا انگور ——— تو غذا شناس ماہرین کے بقول یہ اس قدر مؤثر عوامل رکھتا ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک طبیعی میڈیکل سٹور ہے۔ علاوہ ازیں انگور خواص کے لحاظ سے ماں کے دودھ کے قریب قریب ہے یعنی ایک مکمل غذا ہے انگور جسم میں گوشت سے دگنی حرارت پیدا کرتا ہے اس کے علاوہ یہ زہر کی ضد اور کاٹ ہے خون کی صفائی، جوڑوں کے درد کے علاج، ورم کے آرام اور خون بڑھانے کے لیے یہ ایک مؤثر دوا ہے۔ انگور معدہ اور آنتوں کو غیر مشکوک کر دیتا ہے یہ نشاط آفریں ہے، اور رنج و غم کو برطرف کر دینے والا ہے اعصاب کو تقویت پہنچاتا ہے اس میں موجود مختلف وٹامن انسان کو قوت بخشتے ہیں انگور ایک نہایت قیمتی غذا ہونے کے علاوہ جراثیم کشی کی بہت صلاحیت رکھتا ہے یہاں تک کہ سرطان کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی یہ ایک مؤثر عامل ہے۔[2]

اسی بناء پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ایک حدیث کے مطابق:

خير طعامكم الخبز وخير فاكهتكم العنب

تمھاری بہترین غذا روٹی اور بہترین پھل انگور ہے۔[3]

ان پھلوں کے بارے میں غذا شناسوں نے جو کچھ کہا ہے اور فراواں روایات جو اُن کے بارے میں اسلامی مصادر میں آئی ہیں ہم وہ سب کچھ بیان کرنے لگیں تو یقیناً روشِ تفسیر سے ہٹ جائیں گے۔ مقصد یہ تھا کہ ہم واضح کریں کہ قرآن نے ان تین پھلوں کا ذکر بلاوجہ نہیں کیا اور شاید اس زمانے میں ان کے فوائد کا اہم حصہ لوگوں سے مخفی تھا۔

۲۔ **تفکر، تعقل اور تذکر:** زیرِ بحث آیات میں نعماتِ الٰہی کو تین حصوں میں بیان کرنے کے بعد لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے فرق یہ ہے کہ ایک موقع پر قرآن کہتا ہے:

ان میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

دوسری جگہ کہتا ہے:

اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

تیسری جگہ فرماتا ہے:

اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو متذکر ہوتے ہیں۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۱۲۵۔

[2] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر جلد، ص ۱۰۱ و ص ۱۴۲۔

[3] اسلام پزشک بی دارد۔

Marfat.com

تعبیر کا یہ اختلاف یقیناً ازراہِ تفنن نہیں ہے بلکہ جیسا کہ قرآن کی روش سے واضح ہوتا ہے ان میں سے ہر ایک کسی نکتے کی طرف اشارہ ہے شاید فرق کا پہلو یہ ہے کہ زمین کی رنگارنگ نعمتوں کا مسئلہ اس قدر واضح ہے کہ وہاں صرف تذکر اور یاددہانی کافی ہے لیکن زراعت کا معاملہ اور زیتون کھجور، انگور اور کلی طور پر پھلوں کا مسئلہ ایسا ہے جس پر کچھ غور و فکر کرنا ضروری ہے تاکہ ان کے غذائی خواص اور علاج کے لیے ان کی اہمیت سے آشنائی ہو سکے لہٰذا اس ضمن میں "تفکر" کی دعوت دی گئی ہے۔ رہا سورج، چاند اور ستاروں کی تسخیر کا مسئلہ، نیزرات اور دن کے اسرار کا معاملہ تو اس کے لیے زیادہ سوچ بچار کی ضرورت ہے لہٰذا "تعقل" کا ذکر آیا ہے گویا یہ عام غور و فکر سے بالاتر مسئلہ ہے۔

بہرحال قرآن کا روئے سخن ہر جگہ سوچ بچار کرنے والوں، اہل فکر و نظر اور صاحبانِ عقل کی طرف ہے۔

اس طرف توجہ کریں کہ قرآن ایک ایسے ماحول میں اُترا کہ جہاں جہالت کے سوا کسی چیز کی حکمرانی نہ تھی ——— اس سے ان تعبیرات کی عظمت اور آشکار ہوتی ہے یہ امر ان لوگوں کے لیے دندان شکن جواب بھی ہے جو بعض خرافاتی مذاہب کی وجہ سے سچے مذاہب پر بھی سُرخ لکیر کھینچ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب توافیون ہے اور یہ فکر و نظر اور عقل و فہم کو بے کار کر دیتا ہے اور خدا پر ایمان لانا آدمی کی جہالت کی پیداوار ہے قرآن کی ایسی آیات تقریباً تمام سورتوں میں موجود ہیں جو وضاحت سے کہہ رہی ہیں کہ سچا مذہب سوچ بچار اور تفکر و تعقل کی پیداوار ہے اور اسلام ہر مقام پر سروکار ہی اہل فکر و نظر اور اولوالالباب سے رکھتا ہے نہ کہ جاہل خرافات بکنے والوں اور بے منطق روشن فکروں سے۔

Marfat.com

۱۴۔ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا
مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا
مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝
۱۵۔ وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا وَسُبُلًا لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُونَ ۝
۱۶۔ وَعَلَامَاتٍ ۚ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ ۝
۱۷۔ أَفَمَنْ يَخْلُقُ كَمَنْ لَا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ۝
۱۸۔ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ لَغَفُورٌ
رَحِيمٌ ۝

ترجمہ

۱۴۔ وہ ذات وہی ہے جس نے (تمھارے لیے) دریا کو مسخر کیا تاکہ اس سے تازہ گوشت کھاسکو اور لباس کے لیے اس سے وسائلِ زینت نکالو اور تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ دریا کا سینہ چیرتی ہیں تاکہ تم (تجارت کرسکو اور) فضلِ خدا سے بہرہ مند ہو شاید تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو۔

۱۵۔ اور اس نے زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑوں کو گاڑ دیا تاکہ تمھیں اس کی حرکت اور لرزنے سے محفوظ رکھے اور اس نے دریا پیدا کیے اور راستے بنائے تاکہ تمھیں ہدایت حاصل ہو۔

۱۶۔ اور اس نے نشانیاں پیدا کیں اور (رات کے وقت) ان (لوگوں) کی ستاروں کے ذریعے راہنمائی کی گئی ہے۔

۱۷۔ کہ خلق کرنے والا اس کی مانند ہے جو خلق نہیں کرتا کیا تم خیال نہیں کرتے۔

۱۸۔ اور اگر تم نعماتِ خدا کو گننا چاہو تو ہرگز شمار نہیں کر پاؤ گے۔ اللہ غفور و رحیم ہے۔

Marfat.com

تفسیر

پہاڑ، دریا اور ستارے نعمت ہیں:

ان آیات میں انسان کو حاصل کچھ اور اہم نعماتِ الٰہی کا ذکر ہے یہاں بات دریاؤں سے شروع کی گئی ہے کہ جو انسانی زندگی کا بہت اہم منبع ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: جس نے دریاؤں اور سمندروں کو تمھارے لیے مسخر کیا ہے اور انھیں تمھاری خدمت پر مامور کیا ہے۔ (وھو الذی سخر البحر)

ہم جانتے ہیں کہ زمین کا زیادہ تر حصہ دریاؤں اور سمندروں پر مشتمل ہے اور یہ بھی جانتے ہیں کہ زندگی کی پہلی کونپل دریا سے پھوٹی۔ اس وقت بھی دریا اور سمندر انسانوں اور زمین کی تمام موجودات کی زندگی کو جاری رکھنے کے لیے اہم منبع ہیں انھیں خدمتِ بشر پر مامور کرنا خدا تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے۔

اس کے بعد دریاؤں اور سمندروں کے تین فوائد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ۔ (لتأکلوا منه لحمًا طریًا) وہ گوشت کہ جس کی پرورش کی زحمت تم نے نہیں اٹھائی۔ صرف خدا کے دستِ قدرت نے انھیں سمندروں اور دریاؤں میں پالا ہے اور تمھیں یہ مفت حاصل ہوا ہے۔

اس گوشت کی تازگی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اس زمانے میں بھی پرانا اور باسی کئی طرح کا گوشت ملتا تھا اور ہمارے اس زمانے میں بھی ملتا ہے اس صورتِ حال پر نظر رہے تو اس نعمت کی اہمیت اور تازہ گوشت سے غذا تیار کر کے کھانے کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

انسان کی مادی زندگی اور تمدن میں بہت ترقی ہوئی ہے اس کے باوجود آج بھی دریا اور سمندر انسانی غذا کا ایک اہم منبع ہیں ہر سال لاکھوں ٹن گوشت جسے لطفِ پروردگار کے دستِ مبارک نے انسانوں کے لیے پالا ہے دریا اور سمندر سے حاصل کیا جاتا ہے۔

اس وقت جبکہ زمین پر بڑھتی ہوئی آبادی کو دیکھ کر اور ابتدائی مطالعہ کے بعد بعض لوگ آئندہ غذا کی کمی ہو جانے کا احساس کرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ غذا میں آئندہ کی یہ متوقع کمی ڈراتی ہے لیکن سائنس دانوں کی توجہ دریاؤں اور سمندروں کی طرف ہے انھوں نے ان کی طرف چشمِ امید لگا رکھی ہے ان کا خیال ہے کہ مختلف النوع مچھلیاں پال کر اور ان کی نسل کو بڑھا کر اس کمی کو بہت حد تک پورا کیا جا سکتا ہے دوسری طرف سائنس دانوں نے دریاؤں کے پانی کو آلودگی سے اور مچھلیوں کی نسل کو تباہی سے بچانے کے لیے قوانین اور طریقے بھی وضع کیے ہیں ان کے مجموعی مطالعے سے قرآن کے مذکورہ جملے کی اہمیت زیادہ واضح ہو جاتی ہے ——— جو کہ چودہ سو سال پہلے نازل ہوا ہے۔

سمندروں سے ملنے والی چیزوں میں سے زینت اور بناؤ سنگھار کے کام آنے والی چیزیں بھی ہیں لہٰذا قرآن مزید کہتا ہے تاکہ اس سے پہننے کے لیے زینت کی چیزیں نکال سکو (وتستخرجوا منه حلیة تلبسونها)۔

Marfat.com

انسان چوپایوں کی طرح ذوق سے محروم نہیں بلکہ روحِ انسانی کے چار مشہور پہلو ہیں ان میں سے ایک جمالیاتی حس ہے یہی ذوق حقیقی شعر اور ہنر کی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔

اس میں شک نہیں کہ انسان کا روحانی پہلو بشری زندگی میں بہت موثر ہے لہٰذا صحیح طریقے سے، افراط و تفریط سے بچتے ہوئے اس پہلو کی ضروریات بھی پوری کرنی چاہییں۔

جو لوگ جمال پرستی اور زینتوں اور لذتوں میں غرق ہیں وہ اسی طرح گمراہ ہیں جیسے وہ خشک افراد جو ہر قسم کی زینت کے مخالف ہیں ان میں سے ایک گروہ افراط میں مبتلا ہے اور دوسرا تفریط میں۔ ایک گروہ سرمایے کو ضائع کرنے، طبقاتی فاصلے پیدا کرنے اور معنویات کو قتل کرنے کا باعث ہے جبکہ دوسرا جمود اور ٹھہراؤ کا باعث ہے۔

اسی بنا پر اسلام میں معقول طریقے سے اور فضول خرچی سے بچتے ہوئے زیب و زینت سے استفادہ کی اجازت دی گئی ہے مثلاً اچھے لباس پہننے، مختلف قسم کے عطر استعمال کرنے بعض قیمتی پتھروں سے استفادہ کرنے کی سفارش کی گئی ہے خصوصاً عورتوں کے لیے چونکہ وہ زیب و زینت کی طرف فطری طور پر زیادہ رغبت رکھتی ہیں لیکن ہم پھر تاکید کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ فضول خرچی سے خالی ہونا چاہیے۔

آخر میں تیسری دریائی نعمت کا ذکر ہے اور وہ ہے اس میں کشتیوں کا چلنا جو کہ انسان اور اس کی ضروریات کی نقل و حمل کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ فرمایا گیا ہے: تم کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ وہ سمندر کا سینہ چیرتی ہیں (وتری الفلک مواخر فیہ)۔

کشتی پر بیٹھے ہوئے لوگ جب صفحۂ سمندر پر چل رہے ہوتے ہیں تو یہ منظر کس قدر قابلِ دید ہوتا ہے "خدا نے یہ نعمت تمھیں بخشی ہے تاکہ اس سے فائدہ اٹھاؤ اور راہ تجارت میں اس کے فضل و کرم سے استفادہ کرو (ولتبتغوا من فضلہ)[1] ان سب نعمتوں کی طرف متوجہ ہونے سے تم میں احساس ذمہ داری پیدا ہو تو "شاید اس کی نعمتوں کا شکر بجالاؤ" (ولعلکم تشکرون)۔

لفظ "فلک" "کشتی کے معنی میں ہے مفرد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

"مواخر" "ماخرۃ" کی جمع ہے اس کا مادہ "مخر" ہے جو پانی کو دائیں بائیں سے چیرنے کے معنی میں ہے کشتیاں چونکہ چلتے وقت پانی کا سینہ چیرتی ہیں اس لیے انھیں "ماخر" یا "ماخرۃ" کہتے ہیں۔

اصولاً وہ کون ہے جس نے اس مادّہ میں یہ خاصیت رکھی ہے جس سے کشتی بنائی جاتی ہے کہ وہ پانی کے اوپر ٹھہر سکے اگر ہر چیز پانی سے زیادہ بھاری ہوتی اور پانی کا مخصوص دباؤ بھی نہ ہوتا تو ہم سمندر کے بیکراں صفحے پر کبھی بھی نہیں چل سکتے تھے

---

[1] "ولتبتغوا من فضلہ" واؤ عطف کے ساتھ آیا ہے اس کا کوئی معطوف علیہ ہونا چاہیے قاعدہ مقدر ہے اور اس کی تقدیر یہ ہے۔

لتنتفعوا بہا و لتبتغوا من فضلہ

تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں پانی کا سینہ چیرتی ہیں تاکہ تم اس سے مختلف فائدے اٹھا سکو اور تجارت کیلئے اس سے بہرہ ور ہو سکو۔

Marfat.com

نیز وہ کون ہے جو سمندروں کی سطح پر منظم ہواؤں کو چلاتا ہے اور وہ کون ہے جس نے بخارات میں یہ طاقت پیدا کی ہے کہ ان سے ہم سمندر پر انجن والی کشتیاں چلا سکیں؟ ——— کیا ان میں سے ہر ایک عظیم نعمت نہیں ہے۔

سمندری راستے خشکی کی سڑکوں اور شاہراہوں کی نسبت بہت وسیع، بہت کم خرچ اور زیادہ مہیا ہوتے ہیں۔ بعض دیو قامت بحری جہاز شہروں کی طرح وسیع ہوتے ہیں اور اس طرح انسانوں کو نقل و حمل کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہاتھ آیا ہے ہم اس طرف توجہ کریں تو کشتی رانی کے لیے سمندروں کی نعمت کی عظمت زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

سمندروں اور دریاؤں کی نعمتوں کا ذکر کرنے کے بعد قرآن سخت اور مضبوط پہاڑوں کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے: زمین میں محکم اور مضبوط پہاڑ گاڑ دیئے گئے ہیں تاکہ اسے لرزنے اور حرکت کرنے سے بچایا جائے اور تم اس پر آرام و اطمینان سے رہ سکو (والقی فی الارض رواسی ان تمید بکم)۔[1]

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ پہاڑوں کی بنیادیں اور جڑیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور باہم وابستہ و پیوستہ ہیں اور زرہ کی طرح زمین کو اپنے اندر لیے ہوئے ہیں یہ چیز اندرونی گیس کے سبب ہر لحہ ممکن سرزنش سے زمین کو بہت حد تک بچائے ہوئے ہے۔ علاوہ ازیں پہاڑوں کی خاص وضع پانی کے مدوجزر کے مقابلے میں زمین کی جلد کی قوّت مدافعت کو بڑھاتی ہے اور اس پر پانی کے مدوجزر کے اثر کو بہت کم کر دیتی ہے اسی طرح پہاڑ زمین پر آنے والے شدید طوفانوں کی قوّت اور ہواؤں کی حرکت کو کم کر دیتے ہیں کیونکہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو زمین کی ہموار سطح تیز آندھیوں اور طوفانوں کی زد میں رہتی اور اس حالت میں اس کے لیے سکون ممکن نہ تھا۔

نیز پہاڑ چونکہ پانیوں کے اصل خزانوں میں سے ہیں (برف کی صورت میں یا اندرونی طور پر ان میں پانی ہوتا ہے) لہٰذا ان کے ساتھ ہی فوراً دریاؤں اور نہروں کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے، فرمایا گیا ہے: اور تمھارے لیے دریا اور نہریں پیدا کی گئی ہیں (وانھارًا)۔

ممکن تھا کہ پہاڑوں کے وجود سے یہ توہم پیدا ہوتا کہ وہ زمین کے مختلف حصّوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں اور راستوں کو بند کر دیتے ہیں لہٰذا مزید فرمایا گیا ہے اور تمھارے لیے راستے بنائے گئے ہیں تاکہ تم ہدایت پاؤ (وسبلا لعلکم تھتدون)۔[2]

یہ مسئلہ قابلِ توجہ ہے کہ دنیا میں پہاڑوں کے بڑے بڑے سلسلوں میں کٹاؤ موجود ہے جس سے انسان ان کے درمیان سے اپنا راستہ بنا لیتا ہے اور بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ پہاڑ زمین کے حصوں کو بالکل ہی ایک دوسرے سے

---

[1] "ان تمید بکم" تقدیر میں یوں تھا "لئلا تمید بکم" یا "کراھۃ ان تمید بکم" (تاکہ وہ تمھیں ہلا جلا نہ دے یا تمھیں حرکت دینے کو ناپسند کرتے ہوئے)۔

[2] بہرحال مندرجہ بالا آیت قرآن مجید کے علمی معجزات میں سے ہے۔ یہ بات کم از کم اس زمانے میں لوگوں پر ابھی منکشف نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے ہماری کتاب "قرآن و آخرین پیامبر" دیکھیے۔

Marfat.com

الگ کر دیں ۔

راستہ چونکہ نشانی اور علامت اور راہنما کے بغیر انسان کو مقصد تک نہیں پہنچاتا لہٰذا راستے کی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد ان نشانیوں اور علامتوں کا ذکر کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے : اور علامتیں قرار دی گئی ہیں (وعلٰمٰت)۔

یہ علامتیں مختلف قسم کی ہیں پہاڑوں کی شکل وصورت ، درّے اور ان کا ایک دوسرے سے کٹاؤ اور علیحدگی ، زمین کا نشیب وفراز ، مختلف رنگ کی مٹی ، پہاڑوں کے مختلف رنگ یہاں تک کہ ہر ایک میں چلنے والی ہواؤں کی کیفیت راستے تلاش کرنے کے لیے علامتیں ہیں ۔

ہمیں معلوم ہے کہ یہ علامتیں مسافروں کے لیے کس قدر مددگار ہیں یہ انھیں منزل سے دور ہو جانے اور کھو جانے سے بچاتی ہیں بعض بیابان ایک ہی طرز کے ہوتے ہیں انھیں عبور کرنا بہت زیادہ مشکل اور خطرناک ہے ایسے ایسے بیابان ہیں کہ کتنے ہی لوگ ان میں گئے ہیں اور پھر پلٹ کر نہیں آئے ۔ غور کیجیے کہ اگر اسی طرح ساری زمین ایک ہی طرز اور کیفیت کی ہوتی ، پہاڑ ایک جیسے ہوتے ، سب دشت وبیابان ایک ہی رنگ کے ہوتے اور درّے ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے تو کیا پھر انسان آسانی سے اپنے راستے معلوم کر سکتے ؟

بعض اوقات انسان تاریک راتوں میں بیابانوں میں سفر کرتا ہے یا رات کو وسطِ سمندر میں سفر کرتا ہے اور اس کے لیے ایسی کوئی علامات نہیں ہوتیں ایسے میں اللہ تعالیٰ آسمانی علامتوں کو مدد کے لیے بھیجتا ہے تاکہ اگر زمین میں کوئی علامت نہیں ہے تو مسافر آسمانی علامت سے استفادہ کریں اور بھٹک نہ جائیں لہٰذا مزید فرمایا گیا ہے اور ستاروں کے ذریعے لوگوں کی راہنمائی کی جاتی ہے (وبالنجم ھم یھتدون)۔

البتہ یہ ستاروں کے فوائد میں سے ایک کا ذکر ہے ورنہ ان کے بہت سے فوائد ہیں تاہم اگر ان کا صرف یہی فائدہ ہوتا تو بھی اہم تھا اگرچہ اب تو کشتیاں قطب نما کی مدد سے تیار کردہ نقشوں کے مطابق اپنا راستہ معین کر لیتی ہیں لیکن قطب نما کی ایجاد سے پہلے تو سمندروں میں ستاروں کی مدد کے بغیر چلنا ممکن ہی نہ تھا یہی وجہ ہے کہ رات کو جب بادل آسمان پر چھائے ہوتے تھے کشتیاں رک جاتی تھیں اور اگر وہ ایسے میں چلتی رہتیں تو انھیں موت کا خطرہ درپیش رہتا ۔

البتہ ہم جانتے ہیں کہ جو ستارے آسمان میں ہمیں اپنی جگہ بدلتے نظر آتے ہیں وہ پانچ سے زیادہ نہیں ہیں انھیں سیارے کہتے ہیں اگرچہ سیارے ان سے زیادہ ہیں لیکن باقی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے ۔ باقی ستارے اپنی جگہ پر برقرار رہتے ہیں گویا یہ سیاہ کپڑے پر جڑے ہوئے موتی ہیں یہ موتی کپڑے کو افق کی ایک طرف سے کھینچ کر دوسری طرف لے جاتے ہیں دوسرے لفظوں میں ثوابت کی حرکت مجموعی ہے لیکن سیاروں کی حرکت انفرادی ہے اور دیگر ستاروں سے ان کا راستہ تبدیل ہوتا رہتا ہے ۔ علاوہ ازیں ثابت ستاروں کی مختلف شکلیں ہیں جو "اشکالِ فلکی" کے نام سے مشہور ہیں اور چاروں سمتیں (مشرق ، مغرب شمال ، جنوب) معلوم کرنے کے لیے ان شکلوں کی پہچان بہت مفید ہے ۔

پروردگار کی ان عظیم نعمتوں اور پوشیدہ الطاف کا ذکر کرنے کے بعد قرآن انسانی وجدان کو فیصلے کی دعوت دیتا ہے کیا پیدا کرنے والا اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا ، کیا تم خیال نہیں کرتے (افمن یخلق کمن لا یخلق

Marfat.com

افلا تذکرون)۔
یہ تربیت کا ایک نہایت مؤثر طریقہ ہے۔ قرآن نے اس سے بہت سے مواقع پر استفادہ کیا ہے۔ قرآن سوالیہ طریقے سے مسائل پیش کرتا ہے اوران کا جواب ان پر چھوڑ دیتا ہے جن کا وجدان بیدار ہے۔ قرآن اس طریقے سے لوگوں کے احساس کو ابھارتا ہے تاکہ جواب اُن کی رُوح کے اندر سے اُٹھے اور پھر وہ اسے قبول کرلیں اوراس جواب سے اس طرح محبت کریں جیسے وہ اپنے وجود سے پیدا ہونے والی اولاد سے کرتے ہیں۔

اصولی طور پر علم نفسیات کی رُو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ صحیح تعلیم و تربیت کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کی جانا چاہیے اس طرح کی جسے تعلیم دی جارہی ہو وہ مطالب کا خود سے احساس کرے اور خود اس کے اندر سے وہ مطالب نکلیں اسے یہ احساس نہ ہو کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جو باہر سے اس پر ڈالی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ ان مطالب کو اپنے پورے وجود کے ساتھ قبول کرے اوران کا دفاع بھی کرے۔

اس نکتے کا تکرار بھی ضروری ہے کہ وہ مشرکین جو مختلف بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں ان کا کبھی یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ بُت پیدا کرتے ہیں اور وہ خالق ہیں بلکہ وہ بھی خلقت کو اللہ کے ساتھ مخصوص سمجھتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے: کیا ان لوگوں کے خالق کے سامنے سجدہ کرنا چاہیے یا ان کے سامنے جو ایک ناچیز مخلوق سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور جنھوں نے کبھی کسی چیز کو خلق نہیں کیا اور نہ وہ خلق کرسکتے ہیں۔

آخر میں اس بناء پر کہیں کوئی یہ خیال نہ کرے کہ نعمتِ الٰہی انھی چیزوں پر منحصر ہے، قرآن کہتا ہے: اور اگر خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو یہ تمھارے بس میں نہیں (وان تعدوا نعمۃ اللہ لاتحصوھا)۔

سرتاپا تمھارا وجود اس کی نعمتوں میں مستغرق ہے ہر سانس جو اندر اور باہر آتا ہے یہی دو نعمتیں نہیں۔ لمحہ بھر میں ہزاروں نعمتیں ہیں اور ہر نعمت پر ایک شکر واجب ہے ہماری عمر کے گذرنے والے ہر لمحے کے لیے ہمارے بدن کے اندر اور باہر لاکھوں زندہ اور بے جان موجود کام کرتے ہیں جن کی فعالیّت کے بغیر لحظہ بھر کی زندگی ممکن نہیں۔

اصولاً ہم تمام نعمتوں سے آگاہ ہی نہیں۔ انسانی علم و دانش کا دامن جتنا پھیلتا جارہا ہے ان نعمتوں کے نئے افق ہم پر کھلتے جارہے ہیں ایسے افق کہ جو بے کنار ہیں کیا ان حالات میں ہم خدا کی نعمتیں شمار کرسکتے ہیں؟

اس وقت سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ہم کس طرح اس کے شکر کا حق ادا کرسکتے ہیں اس حالت میں کیا ہم ناشکروں کے زُمرے میں نہیں آئیں گے؟

اس سوال کا جواب قرآن اس آیت کے آخری جملے میں دیتا ہے، کہتا ہے: خدا غفور و رحیم ہے۔ (ان اللہ لغفور رحیم)۔

جی ہاں! اللہ اس سے زیادہ مہربان اور بزرگوار ہے کہ اپنی نعمتوں پر شکر کی طاقت نہ ہونے پر تمھارا مواخذہ کرے اگر تم یہ جان لو کہ تم سرتاپا اس کی نعمت میں غرق ہو اور اس کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہو اور اپنا عذرِ کوتاہی اس کی بارگاہ میں

Marfat.com

پیش کرو تو تم نے اس کا بہت شکر ادا کیا ہے ــــــــــ ورنہ وہ شکر کہ جو اس کی خداوندی کے لائق ہے کوئی ادا نہیں کر سکتا ــــــــ لیکن یہ سب کچھ اس میں مانع نہیں کہ ہم مقدور بھر اس کی نعمتوں کو شمار کریں کیونکہ جس قدر جہاں بینی اور جہاں شناسی میں اضافہ ہوتا جائے گا معرفتِ الٰہی میں بھی اضافہ ہوگا اور عشقِ الٰہی کا نور بھی دل میں زیادہ ضیا پاش ہوگا۔ اس کی نعمتوں پر غور ہمارے احساسِ شکر گذاری کو بھی متحرک کرتا ہے اسی لیے ہادیانِ دین اپنے ارشادات میں بلکہ اپنی دعاؤں اور مناجاتوں میں بھی اس کی کچھ بے پایاں نعمتوں کو بیان کیا کرتے تھے تاکہ دوسروں کے لیے سبق ہو۔

شکرِ نعمت کے بارے میں اور اس بارے میں کہ انسان پروردگار کی نعمتوں کو شمار نہیں کر سکتا ــــــــ ہم سورۂ ابراہیم کی آیہ ۳۴ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں۔

راہ، نشانی اور رہبر

مندرجہ بالا آیات میں اگرچہ زمین کے راستوں کا ذکر ایک نعمتِ الٰہی کے طور پر آیا ہے کیونکہ راستے تمدنِ انسانی کی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ اسی لیے ترقیاتی کاموں میں سب سے پہلے مناسب راستہ بنانے کی فکر کی جاتی ہے کیونکہ اس کے بغیر کسی قسم کی آبادکاری اور انسانی فعالیت ممکن نہیں۔

بہرحال ہو سکتا ہے کہ اس سلسلے میں قرآن کا بیان انسان کی روحانی اور معنوی زندگی کے لیے نمونے کے طور پر ہو کیونکہ ہر مقدس ہدف تک پہنچنے کے لیے سب سے پہلے صحیح راستے کا انتخاب ضروری ہے نیز راستے کے علاوہ علامات اور نشانیوں کا وجود بھی زندگی کے لیے بہت اہم ہے کیونکہ ایک دوسرے سے مشابہ راستے بہت سے ہیں اور ان میں سے اصلی راستہ بھول جانا بہت ممکن ہے۔ ایسے موقع پر "علامات" کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

خصوصاً وہ مومنین جنھیں قرآن نے "متوسمین" (ہوشیار) کہا ہے انھیں چاہیے کہ ان نشانیوں پر گہری نظر رکھیں انھیں چاہیے کہ مکاتب و مذاہب اور سنت و دعوت کو یہاں تک کہ اشخاص و افراد کو بھی نشانیوں کے حوالے سے پہچانیں اور حق کی نشانیوں کو دیکھ کر اسے باطل سے جدا طور پر پہچانیں۔

اسی طرح رہبر و رہنما کا مسئلہ بھی محتاجِ وضاحت نہیں۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے مروی بہت سی روایات میں "نجم" سے رسول اللہؐ اور "علامات" سے آئمہ مراد لی گئی ہے۔ بعض روایات میں "نجم" اور "علامات" دونوں سے آئمہ اور ہادیانِ راہِ حق مراد لی گئی ہے ہم یہاں ان میں سے چند ایک احادیث کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۱۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپؑ نے فرمایا:

النجم رسول اللہ و العلامات الائمۃ علیہم السلام

ستارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اور علامات آئمہ علیہم السلام کی طرف اشارہ ہے۔[۱]

۱۔ تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

Marfat.com

بعینہ یہی مضمون امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے بھی نقل ہوا ہے۔

۲۔ ایک اور حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپ نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں فرمایا:

نحن النجم

ہم ہیں ستارہ۔[1]

۳۔ ایک اور حدیث میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

انت نجم بنی هاشم

تم بنی ہاشم کا ستارہ ہو۔[2]

ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا:

انت احد العلامات

علامات میں سے ایک تم ہو۔[3]

یہ سب روایات مندرجہ بالا آیات کی معنوی تفسیر کی طرف اشارہ ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۴۵۔

Marfat.com

۱۹۔ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ○

۲۰۔ وَالَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ لَا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّهُمۡ
يُخۡلَقُوۡنَؕ ○

۲۱۔ اَمۡوَاتٌ غَيۡرُ اَحۡيَآءٍ‌ۚ وَمَا يَشۡعُرُوۡنَ ۙ اَيَّانَ يُبۡعَثُوۡنَ ○

۲۲۔ اِلٰهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ۚ فَالَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَةِ قُلُوۡبُهُمۡ
مُّنۡكِرَةٌ وَّهُمۡ مُّسۡتَكۡبِرُوۡنَ ○

۲۳۔ لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ مَا يُسِرُّوۡنَ وَمَا يُعۡلِنُوۡنَ‌ؕ اِنَّهٗ لَا
يُحِبُّ الۡمُسۡتَكۡبِرِيۡنَ ○

ترجمہ

۱۹۔ جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ تم اعلانیہ کرتے ہو اللہ سب کو جانتا ہے۔

۲۰۔ خدا کے علاوہ وہ جن معبودوں کو پکارتے ہیں، وہ کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے بلکہ وہ تو خود مخلوق ہیں۔

۲۱۔ وہ بے جان موجودات ہیں جن میں زندگی کی کوئی رمق نہیں اور انھیں معلوم نہیں کہ ان کی عبادت کرنے والے کب محشور ہوں گے۔

۲۲۔ تمھارا معبود خدائے یکتا ہے لیکن جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل حق کا انکار کرتے ہیں اور وہ بڑے بن بیٹھے ہیں۔

۲۳۔ جسے وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں یقیناً خدا اس سب سے باخبر ہے۔ اور وہ مستکبرین کو پسند نہیں کرتا۔

Marfat.com

تفسیر

مُردہ اور بے شعور معبود

گذشتہ آیات میں خدا کی ان دو نہایت اہم صفات کی طرف اشارہ تھا جن میں سے کوئی بھی بتوں اور تراشے ہوئے معبودوں میں نہیں تھی یعنی موجودات کا خالق ہونا اور نعمتیں عطا کرنا۔

زیر نظر پہلی آیت میں معبود حقیقی کی تیسری صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور وہ ہے علم اور دانائی۔ ارشاد ہوتا ہے:
جسے تم پنہاں رکھتے ہو اور جسے تم آشکار کرتے ہو خدا سب کو جانتا ہے (واللہ یعلم ما تسرون و ما تعلنون)۔
پھر تم بتوں کے پیچھے کیوں جاتے ہو کہ جن کا کائنات کی خالقیت میں ذرہ برابر بھی حصہ نہیں۔ نہ جنھوں نے تمھیں کوئی چھوٹی سی چھوٹی نعمت بخشی ہے اور نہ جو تمھارے پوشیدہ اسرار اور ظاہری اعمال کو جانتے ہیں یہ کیسے معبود ہیں کہ جن میں ضرورت کی ایک بھی صفت نہیں۔

اس کے بعد قرآن دوبارہ مسئلۂ خالقیت کی طرف لوٹتا ہے لیکن اس کے مشابہ آنے والی پہلی آیت سے بات کچھ آگے کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: جن معبودوں کو وہ پکارتے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ کوئی چیز خلق نہیں کرتے بلکہ خود بھی مخلوق ہیں۔
(والذین یدعون من دون اللہ لا یخلقون شیئاً و ھم یخلقون)۔

اب تک تو بحث اس بارے میں تھی کہ وہ خالق نہیں ہیں لہٰذا لائق عبادت نہیں ہو سکتے اب فرمایا گیا ہے کہ وہ تو خود مخلوق ہیں، نیازمند اور محتاج ہیں۔ اس صورت میں وہ انسانوں کا سہارا کیسے ہو سکتے ہیں۔ کس طرح ان کی مشکل کشائی کر سکتے ہیں؟ یہ کیسا احمقانہ فیصلہ ہے۔

علاوہ ازیں وہ تو "مردہ" ہیں۔ انھوں نے زندگی کی بُو تک نہیں سونگھی اور نہ اس کی استعداد رکھتے ہیں" (اموات غیر احیاء)۔

کیا معبود کو موجود زندہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جو اپنے عبادت کرنیوالوں کی نیاز، حاجت اور عبادت سے باخبر ہو۔ لہٰذا معبود حقیقی کی چوتھی صفت یعنی "حیات" بھی ان میں بالکل نہیں ہے۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: یہ بُت بالکل نہیں جانتے کہ ان کی عبادت کرنے والے کس وقت اور کس زمانے میں مبعوث ہوں گے (وما یشعرون ایان یبعثون)۔

ثواب اور جزا ان کے ہاتھ میں ہوتی تو انھیں کم از کم اپنے عبادت گزاروں کے پھر سے جی اٹھنے کا تو پتہ ہوتا۔ اس جہالت کے ہوتے ہوئے وہ کس طرح لائق عبادت ہو سکتے ہیں یہ پانچویں صفت ہے جو معبود حقیقی میں ہونا چاہیے جبکہ وہ اس سے محروم ہیں[1]

---

[1] "اموات غیر احیاء و ما یشعرون ایان یبعثون" اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے دیگر احتمالات بھی ذکر کیے ہیں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اب تک ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ بُت اور بُت پرستی کا قرآن کی منطق میں وسیع مفہوم ہے ہر موجود یا ہر شخص جسے ہم خدا کے بدلے سہارا قرار دے لیں اور اپنی تقدیر اس کے ہاتھ میں سمجھیں وہ ہمارا بُت شمار ہوگا لہٰذا جو کچھ مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے وہ ان لوگوں کے بارے میں بھی ہے جو ظاہراً بُت پرست نہیں ہیں لیکن ایک سچے مومن کا سا استقلال نہیں رکھتے وہ جو کمزور بندوں کو اپنا سہارا بنائے ہوئے ہیں اور آزادی کی بجائے وابستگی اور دوسروں پر انحصار کی زندگی گزارتے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ عالمی سوپر طاقتیں مشکلات میں ان کا سہارا بن سکتی ہیں جبکہ یہ طاقتیں جہنمی اور خدا سے بیگانہ ہیں ایسے لوگ بھی عملی طور پر بُت پرست اور مشرک ہیں اور انہیں ان سے کہنا چاہیے کہ کیا تمھارے ان معبودوں نے کوئی چیز خلق کی ہے؟ کیا وہ کسی نعمت کا سرچشمہ ہیں؟ کیا یہ تمھارے اندرونی اسرار سے آگاہ ہیں۔

کیا وہ جانتے ہیں کہ تم کب اپنی قبروں سے اٹھو گے کہ تمھیں تمھاری جزا یا سزا دے سکیں۔ پس کیوں ان کی بتوں کی سی پرستش کرتے ہو۔

بتوں کی صلاحیت کی نفی پر ان واضح دلائل کے بعد نتیجہ اخذ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: تمھارا اللہ الہ واحد ہی ہے (الھکم الٰہ واحد)۔ مبداء و معاد چونکہ ہر جگہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں لہٰذا بلا فاصلہ مزید فرمایا گیا ہے وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (اور فطرتاً مبداء کے بارے میں بھی ٹھیک ایمان نہیں رکھتے) ان کے دل حقیقت کے منکر ہیں اور وہ حق کے مقابلے میں مستکبر بنے ہوئے ہیں[1] (فالذین لایؤمنون بالاٰخرۃ قلوبھم منکرۃ وھم مستکبرون)۔

ورنہ توحید کے دلائل تو متلاشیانِ حق کے لیے اور حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والوں کے لیے آشکار ہیں۔ اسی طرح معاد کے دلائل بھی واضح ہیں۔ استکبار و تکبّر اور حق کے سامنے سر نہ جھکانے کے سبب وہ ہمیشہ انکار ہی کرتے ہیں یہاں تک کہ حسی حقائق کے بھی منکر ہو جاتے ہیں۔

یہاں تک کہ ان کا یہ طرزِ عمل ان میں رچ بس جاتا ہے اور اس عادت کے ہوتے ہوئے حق کی کوئی بات اور دلیل و منطق ان پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

بُت پرستش کے لائق نہیں اس سلسلے میں گذشتہ آیات میں جو زندہ دلائل گزر چکے ہیں کیا وہ کافی نہیں کہ ہر ذی شعور تصدیق کرے کہ بُت لائق عبادت نہیں لیکن انتہائی تعجب کی بات ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ پھر بھی حقیقت قبول نہیں کرتے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) ان میں سے ایک کے مطابق یہاں مراد یہ ہے کہ بُت نہیں جانتے کہ وہ کب مبعوث ہوں گے اس سلسلے میں مفسرین نے بعض آیات سے شواہد بھی پیش کیے ہیں۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۹۸ میں خدا فرماتا ہے:

مشرکین اور ان کے بُت دونوں ہی جہنم میں ہوں گے۔

لیکن واضح ہے کہ اگر یہ مراد ہو تو پہلے اور بعد کی آیات میں مناسب ربط نہیں ہوگا لہٰذا صحیح تفسیر وہی ہے جو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں (غور کیجیے گا)۔

[1] جیسا کہ ہم جانتے ہیں "فالذین لا یؤمنون" میں "ف" تفریع کے لیے ہے۔ قیامت و مبعوث ہونے کا انکار مبداء کے انکار کی وجہ ہے اور اس کا سرچشمہ استکبار ہے۔

Marfat.com

زیر بحث آخری آیت میں ہم پھر دیکھتے ہیں۔ غیب وشہود اور پنہاں وآشکار پر خدا کی آگاہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: جسے تم پنہاں رکھتے ہو اور جسے تم آشکار کرتے ہو یقیناً خدا اس سے باخبر ہے (لا جرم ان الله یعلم ما یسرون وما یعلنون)۔

یہ جملہ درحقیقت کفار اور دشمنانِ حق کے لیے ایک دھمکی ہے کہ خدا تمھاری حالت سے ہرگز غافل نہیں ہے وہ نہ صرف ان کے ظاہر کو جانتا ہے بلکہ ان کے باطن سے بھی آگاہ ہے اور موقع آنے پر ان سے حساب لے گا۔

وہ مستکبر ہیں اور "خدا مستکبرین کو پسند نہیں کرتا" (انه لا یحب المستکبرین) کیونکہ حق کے سامنے استکبار اور تکبر خدا سے بیگانگی کی پہلی دلیل ہے۔

لفظ "لا جرم" "لا" اور "جرم" کا مرکب ہے یہ لفظ عام طور پر تاکید کے لیے اور قطعاً اور یقیناً کے معنی میں آتا ہے اور کبھی "لا بد" (ناچار) کے معنی میں آتا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات قسم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں:

لا جرم لافعلن

میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ کام کروں گا۔

رہا یہ سوال کہ "لا جرم" سے یہ معانی کیسے معلوم ہوئے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "جرم" دراصل درخت سے پھل چننے اور توڑنے کے معنی میں ہے اور جب اس کے شروع میں "لا" لگا دیا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اسے توڑ اور کاٹ نہیں سکتی اس طرح اس سے مسلماً، ناچار اور کبھی قسم کا مفہوم حاصل ہو جاتا ہے۔

مستکبر کون ہیں؟

قرآن مجید کی چند آیات میں "استکبار" کفار کی ایک خاص صفت کے عنوان سے استعمال ہوا ہے ان سب آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد "تکبر" کرتے ہوئے حق کو قبول نہ کرنا ہے۔ سورۂ نوح کی آیہ ۷ میں ہے:

وانی کلما دعوتهم لتغفر لهم جعلوا اصابعهم فی اٰذانهم واستغشوا ثیابهم واصرّوا واستکبروا استکبارًا

میں اپنے میں سے اس بے ایمان گروہ کو دعوت دیتا ہوں تاکہ تیری عفو وبخشش ان کے شاملِ حال ہو تو اس دعوت پر وہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور اپنے آپ کو اپنے لباس کے نیچے چھپا لیتے ہیں اور گمراہی پر اصرار کرتے ہیں اور حق کے سامنے استکبار کرتے ہیں۔

نیز سورۂ منافقین کی آیہ ۵ میں ہے:

واذا قیل لهم تعالوا یستغفر لکم رسول الله لوّوا رءوسهم ورأیتهم یصدّون وهم مستکبرون

Marfat.com

اور جب ان سے کہو کہ آؤ تاکہ اللہ کا رسول تمھارے لیے بخشش و مغفرت طلب کرے تو وہ نافرمانی کرتے ہیں اور تم دیکھو گے کہ وہ لوگوں کو راہِ حق سے روکتے ہیں اور استکبار کرتے ہیں۔

اور سورۂ جاثیہ کی آیہ ۸ میں اسی گروہ کے بارے میں ہے:

یسمع اٰیات اللّٰہ تتلٰی علیہ ثم یصر مستکبرًا کان لم یسمعہا

اللہ کی آیات انھیں سنائی جاتی ہیں وہ سنتے ہیں لیکن اس کے باوجود کفر پر اس طرح سے اصرار کرتے ہیں گویا انھوں نے یہ آیات سنی ہی نہیں۔

درحقیقت بدترین استکبار یہی ہے کہ حق کو قبول کرنے کی بجائے تکبر کیا جائے کیونکہ یہ تکبر ہدایت کے تمام راستے انسان کے سامنے بند کر دیتا ہے اور وہ ساری عمر بدبختی، گناہ اور بے ایمانی میں بھٹکتا رہتا ہے۔

نہج البلاغہ کے خُطبۂ قاصعہ میں حضرت علیؑ نے صراحت سے شیطان کو "سلف المستکبرین" (تکبر کرنے والوں کا سربراہ) قرار دیا ہے کیونکہ اس نے پہلا قدم ہی اٹھایا کہ حق کی مخالفت کی اور اس حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے سے انکار کر دیا کہ آدم اس سے زیادہ کامل ہیں اسی طرح وہ تمام افراد جو حق کو قبول کرنے سے منہ پھیر لیتے ہیں مالی طور پر تہی دست ہوں یا دولتمند وہ مستکبر ہیں لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اکثر اوقات زیادہ مالی طاقت ہی کے سبب انسان حق کو قبول کرنے سے روگردانی کرتا ہے۔

روضۃ الکافی میں امام صادق علیہ السّلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

ومن ذھب یری ان لہ علی الاٰخر فضلا فھو من المستکبرین، فقلت انما یری ان لہ علیہ فضلا بالعافیۃ اذا راٰہ مرتکبا للمعاصی؟ فقال ھیھات ھیھات! فلعلہ ان یکون قد غفر لہ ما اتی، و انت موقوف تحاسب، اما تلوت قصۃ سحرۃ موسٰی (ع)۔

جو شخص دوسرے پر برتری اور امتیاز کا قائل ہو وہ مستکبرین میں سے ہے۔

راوی کہتا ہے: میں نے امام سے پوچھا کیا اس میں کوئی حرج ہے کہ انسان کسی کو گناہ میں مشغول دیکھے اور خود اس نے چونکہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا لہٰذا اس پر اپنی برتری اور امتیاز سمجھے؟

امام نے فرمایا:

تو نے اشتباہ اور غلطی کی ہے ہو سکتا ہے کہ خدا بعد ازاں اس کا گناہ بخش دے اور تجھے حساب کے لیے کھڑا رکھے۔ کیا تو نے قرآن میں زمانۂ موسٰی کے جادوگروں کا قصہ نہیں پڑھا کہ وہ فرعون کے انعام و اکرام کی خاطر اور اس کے دربار میں تقرب حاصل کرنے کے لیے، اللہ کے ایک اولوالعزم پیغمبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لیے تیار

Marfat.com

ہو گئے۔ لیکن جونہی انھوں نے حق کا چہرہ دیکھا فوراً اپنا راستہ بدل لیا یہاں تک کہ فرعون کی طرف سے قتل کی دھمکیاں سن کر بھی وہ ڈٹے رہے اور خدا تعالیٰ نے انھیں اپنی عفو و بخشش اور رحمت و مہربانی سے نوازا۔[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۸۰۔

Marfat.com

۲۴۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ
الْاَوَّلِيْنَ ۙ
۲۵۔ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ
يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ۧ
۲۶۔ قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ
فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ
حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝
۲۷۔ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ
الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ
اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ
۲۸۔ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠
فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ
بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝
۲۹۔ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى
الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۴۔ اور جس وقت ان سے کہا جائے کہ تمھارے پروردگار نے نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں یہ (خدائی وحی نہیں) یہ تو گذشتہ لوگوں کے جھوٹے افسانے ہیں۔

Marfat.com

۲۵۔ روز قیامت ان کے گناہوں کا بوجھ انھیں پوری طرح اپنے کندھے پر اٹھانا ہوگا اور ان لوگوں کے گناہوں کا ایک حصّہ بھی جنھیں انھوں نے جہالت کی وجہ سے گمراہ کیا ہے۔ جان لو کہ اپنے کندھے پر بڑا سنگین بوجھ اٹھاتے ہیں۔

۲۶۔ جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ (بھی) اس قسم کی سازشیں کرتے تھے لیکن خدا ان کی (زندگی) کی بنیاد کی طرف گیا اور اسے بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور اوپر سے ان کے سروں پر چھت گرائی اور (اللہ کا) عذاب ان پر اُدھر سے آیا جہاں سے وہ نہیں جانتے تھے۔

۲۷۔ پھر قیامت کے دن خدا انھیں رسوا کرے گا اور انھیں کہے گا کہ تم نے جو میرے شریک بنا رکھے تھے کہ جن کی وجہ سے دوسروں کے ساتھ تم دشمنی کرتے تھے وہ کہاں ہیں۔ اس وقت اہلِ علم کہیں گے کہ آج کے دن رسوائی اور بدبختی کافروں کے لیے ہے۔

۲۸۔ (روح قبض کرنے والے) فرشتے ان کی روح اس حالت میں قبض کریں گے کہ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوگا۔ اس وقت وہ سر جھکالیں گے۔ (اور کہیں گے کہ) ہم بُرے کام نہیں کرتے تھے۔ جی ہاں! جو کچھ تم انجام دیتے تھے خدا اسے جانتا ہے۔

۲۹۔ اب جہنم کے دروازوں میں سے داخل ہوجاؤ وہ اس عالم میں ہمیشہ اس میں رہیں گے یہ مستکبرین کے لیے کیسا بُرا ٹھکانا ہے۔

شانِ نزول

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ بعض روایات کے مطابق پہلی آیت "مقتسمین" (تبعیض کرنے والوں) کے بارے میں نازل ہوئی ہے جن کے متعلق پہلے بحث ہو چکی ہے۔

یہ سولہ افراد تھے۔ ان کے چار گروپ تھے ان میں سے چار افراد حج کے دنوں میں مکہ کی سڑک پر لوگوں کے راستے میں کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ مکہ میں لوگوں کے داخل ہونے سے پہلے ان کے ذہنوں کو قرآن اور اسلام کے خلاف کر دیں وہ لوگوں سے کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کوئی نیا دین نہیں لایا بلکہ وہی پرانے لوگوں کے جھوٹے افسانے ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

جو دوسروں کے گناہ اپنے کندھے پر لادلیتے ہیں

گذشتہ آیات میں ان مستکبرین کے بارے میں گفتگو تھی جو کبھی بھی حق کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتے تھے بلکہ ان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح حق کو قبول کرنے سے بچ جائیں۔

زیر نظر آیات میں اس بے ایمان گروہ کی دائمی منطق بیان کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمھارے پروردگار نے کیا چیز نازل کی ہے تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی وحی نہیں ہے یہ تو وہی اگلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

(و اذا قیل لهم ماذا انزل ربکم قالوا اساطیر الاولین)۔

اس تکلیف دہ بات کے ساتھ دو باتیں وہ اور بھی کہتے۔ پہلی یہ کہ ہماری سطح فکر ان مسائل سے بہت بلند ہے یہ باتیں تو افسانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں جو عوام کو مشغول رکھنے کے لیے گھڑی گئی ہیں۔ دوسری یہ کہ یہ کوئی نئی باتیں نہیں ہیں کیونکہ یہ پہلا موقع نہیں کہ کوئی انسان ایسی باتیں سنائے کہ ہم کہیں کہ محمد نے کوئی ایجاد کی ہے یا کوئی اپنی نئی تخلیق کی ہے یہ تو انھی گذشتہ لوگوں کی فضول باتوں کا تکرار ہے "اساطیر" "اسطورہ[1]" کی جمع ہے یہ لفظ فضول اور جھوٹے قصے کہانیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ نو مرتبہ انبیاء کے مقابلے میں بے ایمان کافروں کی زبانی نقل ہوا ہے وہ لوگ اکثر اوقات ہادیان الٰہی کی دعوت کے جواب میں اپنی مخالفت کی توجیہ اور بہانے کے لیے اس لفظ کا سہارا لیتے تھے تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمیشہ لفظ "اساطیر" کے ساتھ "اولین" کو بھی صفت کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ تاکہ ثابت کریں کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے یہاں تک کہ کبھی تو یہ بھی کہتے کہ:

یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے ہم بھی اگر چاہیں تو ان جیسی باتیں کر سکتے ہیں۔

(انفال ـــــ ۳۱)

یہ بات جاذب توجہ ہے کہ آج کے مستکبرین بھی اکثر اوقات حق سے فرار کرتے ہوئے تکلیف و اذیت دینے کے لیے نیز دوسروں کو گمراہ کرنے کے لیے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں یہاں تک کہ انھوں نے معاشرہ شناسی کے نام پر کتابیں لکھی ہیں اور اپنے ان نظریات کو علمی شکل میں پیش کیا ہے انھوں نے مذہب کو انسانی جہالت کی پیداوار اور مذہبی تفاسیر و تشریحات کو افسانے اور قصے کہانیاں قرار دیا ہے لیکن اگر ان کی فکر کی گہرائیوں میں اتر کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسئلہ کچھ اور ہے اور یہ لوگ فضول اور جعلی مذاہب کے خلاف مصروف جنگ نہیں بلکہ یہ خود ان کی پیدائش اور نشر و اشاعت کا عامل ہیں۔ ان کی

---

[1] بعض اسے جمع الجمع سمجھتے ہیں ان کے مطابق "اساطیر" "اسطار" کی جمع ہے اور "اسطار" "سطر" کی جمع ہے بعض کا نظریہ ہے کہ "اساطیر" وہ جمع ہے کہ جس کا مفرد اس کی جنس میں سے نہیں ہے لیکن مشہور وہی ہے جو ہم نے متن تفسیر میں بیان کیا ہے۔

Marfat.com

مخالفت صرف سچے مذاہب کے ساتھ ہے کہ جو انسانی افکار کو بیدار کرتے ہیں۔ سامراج واستعمار کی زنجیریں توڑتے ہیں اور جو مستکبرین اور استعمار گروں کے لیے سدِّ راہ ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ مذہبی تعلیمات ان کے منصوبوں کے خلاف ہیں کیونکہ وہ عدل و انصاف کے اصول پر مبنی ہیں اور تفریق ظلم اور ہر قسم کی خود غرضی کے خلاف جنگ کرتی ہیں وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی آرزوؤں کے برخلاف مذہب کے اخلاقی احکام سرکش ہوا وہوس اور بے سروپا آزادیوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ ان سب پہلوؤں کو جب وہ مجموعی طور پر دیکھتے ہیں تو کوشش کرتے ہیں کہ اس رکاوٹ کو راستے سے ہٹا دیں یقیناً اپنے اس کام کے لیے انھیں ایک جواب کی بھی ضرورت ہے جو وہ لوگوں کو دے سکیں لہٰذا ان کے لیے اس سے بہتر کون سا جواب ہے کہ ان تعلیمات کو جھوٹے افسانے قرار دے لیں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کو کامیاب کرنے میں ان خرافات کا بہت ہاتھ ہے جنھیں بعض اوقات نادان اور ناآگاہ افراد گھڑتے ہیں اور انھیں مذہب کے سانچے میں ڈھال کر مذہب کے نام پر پیش کرتے ہیں۔

مذہب کے تمام حقیقی طرفداروں پر لازم ہے کہ وہ ایسی خرافات کا شدت سے مقابلہ کریں اور ان کے خلاف جنگ کریں اور دشمنوں کو غیر مسلح کر دیں یہ حقیقت ہر جگہ لکھیں اور کہیں کہ اس قسم کی خرافات کا سچے مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور دشمن کو انھیں سند نہیں بنانا چاہیے۔ اصول عقائد اور مسائل عملی کے بارے میں انبیاء کی تعلیمات عقل و منطق سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ ان کے لیے اس قسم کی تہمتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔

اگلی آیت میں ان دل کے اندھوں کے اعمال کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: روز قیامت یہ لوگ اپنے گناہوں کا بوجھ پوری طرح اپنے دوش پر اٹھائیں گے اور ایک حصہ ان لوگوں کے گناہوں کا بھی کہ جنھیں جہالت کی وجہ سے انھوں نے گمراہ کیا ہے (لیحملوا اوزارھم کاملۃ یوم القیمۃ ومن اوزار الذین یضلونھم بغیر علم)۔
جان لو گے کہ وہ بدترین بوجھ اور ذمہ داری اپنے کندھے پر اٹھائے ہوں گے (الاساء ما یزرون)۔ کیونکہ بعض اوقات ان کی گفتگو ہزاروں افراد کی گمراہی کا سبب بن جاتی ہے۔

کس قدر دشوار ہے کہ انسان اپنے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھائے ہزاروں دوسرے افراد کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائے اور اگر ان کی گمراہ کن باتیں بعد کی نسلوں کی گمراہی کا سرچشمہ بن جائیں تو ان کا بوجھ بھی ان کے کندھے پر پڑے گا۔

"لیحملوا" (چاہیے کہ اس بوجھ کو کندھے پر اٹھائیں) ——— یہ لفظ صیغہ امر کی شکل میں ہے جس کا مقصد نتیجہ اور انجام کار بیان کرنا ہے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ہم کسی سے کہیں کہ اب جبکہ یہ غلط کام تو نے انجام دیا ہے تو اس کا نتیجہ بھی بھگتو اور اس کی تلخی بھی چکھو۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "لیحملوا" کی لام، لام عاقبت ہے۔

Marfat.com

"اوزار" "وزر" کی جمع ہے اس کا معنی ہے بھاری بوجھ۔ یہ لفظ گناہ کے معنی میں بھی آیا ہے اور یہ جو "وزیر" کو "وزیر" کہا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے کندھوں پر بھاری ذمہ داری ہوتی ہے۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن کس طرح کہتا ہے کہ کچھ ان افراد کے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھے پر اٹھاتے ہیں جنھیں انھوں نے گمراہ کیا ہے۔

قرآن نے یہ نہیں کہا کہ "ان کے تمام گناہ" حالانکہ روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بُرے کام کی بنیاد رکھے تو جتنے لوگوں نے اس پر عمل کیا ان سب کا گناہ بنیاد رکھنے والے کے کندھے پر ہوگا۔

بعض مفسرین نے اس سوال کے جواب میں کہا ہے کہ گمراہ پیروکاروں کے دو قسم کے گناہ ہوتے ہیں ایک وہ کہ جن کا ارتکاب وہ اپنے رہبروں کی پیروی میں کرتے ہیں اور دوسرے وہ کہ جو وہ خود سے بجالاتے ہیں جبکہ رہبروں کے کندھے پر پہلی قسم کے گناہوں کا بوجھ ہے۔

بعض نے مندرجہ بالا آیت میں لفظ "من" کو تبعیض کے لیے نہیں لیا بلکہ "من" کو اس بات کا بیان سمجھا ہے کہ پیروکاروں کے گناہ رہبروں کے دوش پر ہیں۔

لیکن ایک اور تفسیر بھی نظر آتی ہے جو ان سب سے زیادہ دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ گمراہ پیروکاروں کی دو حالتیں ہیں، بعض اوقات وہ جانتے بوجھتے ہوئے ان منحرف اور کج رو رہبروں کے پیچھے جاتے ہیں اور اس کی مثالیں پوری تاریخ میں بہت ہیں اس صورت میں گناہ کا عامل رہبروں کا حکم بھی ہے اور ان کا اپنا ارادہ بھی۔ یہ وہ مقام کہ جہاں ان کے گناہوں کی ذمہ داری کا ایک حصہ رہبروں کے کندھے پر ہے۔ (بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں سے کسی چیز کی کمی ہو)۔

لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پیروکار مائل و راغب نہیں ہوتے بلکہ انھیں غفلت میں ڈالا جاتا ہے اور وہ گمراہ رہبروں کے وسوسوں کا شکار ہو جاتے ہیں بہت سے معاشروں میں عوام میں اس کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں ہو سکتا ہے کبھی وہ ایسے کاموں میں "تقرب الی اللہ" کی نیت سے شریک ہوں اس صورت میں ان کے تمام گناہوں کا بوجھ گمراہ پیشواؤں کے کندھے پر ہے اور اگر ایسے پیروکاروں نے تحقیق میں کوتاہی نہ کی ہو تو جوابدہ نہیں ہیں لیکن وہ لوگ کہ جنھوں نے علم و آگہی کے ہوتے ہوئے گمراہ پیشواؤں کی پیروی کی یقیناً ان کے گناہوں میں سے سوئی کے سرے کے برابر بھی کمی نہیں کی جائے گی جبکہ ان کے پیشواؤں کے کندھے پر بھی ذمہ داری کا ایک حصہ لادا جائے گا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ "بغیر علم" کے الفاظ اس بات کی دلیل نہیں کہ ان گمراہوں کے پیروکار اپنے رہبروں کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے اور وہ بالکل ہی غافل تھے کہ اس طرح ان کی کوئی ذاتی ذمہ داری ہی نہ ہو بلکہ یہ تعبیر اس بات کی طرح ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ جاہل و نادان افراد اغوا کرنے والوں کے جال میں جلدی سے پھنس جاتے ہیں لیکن دانا اور سمجھ دار لوگ بہت دیر میں۔

اسی لیے قرآن نے دوسری آیات میں ان پیروکاروں کو بری الذمہ نہیں قرار دیا بلکہ ذمہ داری کا ایک حصہ ان کے کندھے پر رکھا ہے چنانچہ سورۂ مومن کی آیہ ۴۷ اور ۴۸ میں ہے:۔

Marfat.com

وَاِذْ یَتَحَاجُّوْنَ فِی النَّارِ فَیَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِیْبًا مِّنَ النَّارِ ۝ قَالَ الَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُلٌّ فِیْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَکَمَ بَیْنَ الْعِبَادِ

گمراہ کرنے والے اور گمراہ ہونے والے آپس میں دوزخ میں بحث و مباحثہ اور جھگڑا کریں گے نادان اور کمزور پیروکار، مستکبرین سے کہیں گے ہم تمھارے پیرو تھے تو کیا آگ کا کچھ حصہ ہماری طرف سے تم قبول کروگے وہ جواب میں کہیں گے: ہم سب دوزخ میں ہیں خدا نے اپنے بندوں میں (عادلانہ) فیصلہ کیا ہے۔

بعد والی آیت میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں کہ مستکبرین ہادیانِ الٰہی پر تہمت لگا رہے ہیں اور آسمانی وحی کو "اساطیر الاولین" (پہلے لوگوں کے افسانے) شمار کرتے ہیں بلکہ ان سے پہلے والے بھی ایسی سازشیں کرتے تھے لیکن خدا ان کی زندگی کی بنیاد کی طرف گیا اور اسے بنیاد سے اکھیڑ دیا اور اوپر سے ان کے سروں پر چھت گرادی (قد مکرالذین من قبلهم فاتی الله بنیانهم من القواعد فخر علیهم السقف من فوقهم)۔

اور عذابِ الٰہی ادھر سے ان کی طرف آیا جدھر کا انھیں وہم و گمان بھی نہ تھا (و اتاهم العذاب من حیث لا یشعرون)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر نمرود کے ایک واقعہ سے کی ہے اس نے ایک عمارت بنائی تھی تاکہ آسمان کی طرف چڑھ کر آسمانی خدا سے مقابلہ کرے۔

بعض دیگر مفسرین نے اسے بخت النصر کے واقعہ کی طرف اشارہ قرار دیا ہے۔

لیکن مسلّم ہے کہ آیت کا مفہوم عام ہے اور اس میں تمام مستکبر اور گمراہ رہبر شامل ہیں۔

یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ خدا ان مستکبرین کے منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے ان کی عمارت کے سامنے کے حصے کی طرف سے اقدام نہیں کرتا بلکہ ان کی جڑ اکھاڑنے اور بیخ کنی کے لیے اقدام کرتا ہے اور چھتوں کو ان کے سروں پر گراتا ہے جی ہاں ایسے لوگوں کے لیے خدائی سزا ایسی ہی ہوتی ہے۔

عمارت کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکنا اور چھت کو نیچے گرانا ہوسکتا ہے ظاہری طور پر عمارتوں اور ان کی چھتوں کی طرف اشارہ ہو کہ جو زلزلوں اور بجلیاں گرنے سے تباہ و برباد ہوجائیں اور ان کے سروں پر آگریں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے اداروں اور ڈویلپمنٹ کی طرف اشارہ ہو کہ جو حکم خدا سے جڑ سے اکھاڑ پھینکی گئیں اور تباہ و برباد ہوگئیں۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ آیت دونوں معانی کی طرف اشارہ ہو۔

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ قرآن لفظ "سقف" کے بعد "من فوقهم" کہتا ہے حالانکہ مسلّم ہے کہ چھت ہمیشہ اوپر کی طرف ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تاکید کے لیے بھی ہو اور یہ نکتہ بیان کرنا بھی مقصود ہو کہ بعض اوقات چھت تو نیچے گرے

Marfat.com

لیکن صاحب خانہ چھت کے نیچے نہ ہو جب کہ ان ظالموں پر چھت گری تو وہ اس کے نیچے تھے اور وہ نابود ہو گئے آج کی اور گذشتہ تاریخ میں اس خدائی سزا کے کس قدر مناظر موجود ہیں۔

کئی طاقت ور اور جابر حکمران ہیں جو اپنے محلِ اقتدار کو اس قدر مستحکم سمجھتے تھے کہ انھوں نے صرف اپنے لیے بلکہ اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے بھی اس کے منصوبے بنا رکھے تھے ان کے پروگرام مکمل تھے اور ظاہراً انھوں نے اپنے اقتدار اور نظام کی بقا اور حفاظت کے پورے انتظامات کر رکھے تھے لیکن اچانک اس طرف سے عذاب الٰہی ان کی طرف آیا جدھر سے وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے اور ان کے اقتدار کی چھت ان کے سر پر آ گری اور وہ یوں نابود اور منتشر ہوئے گویا کبھی صفحۂ ارض پر وہ تھے ہی نہیں۔

جو کچھ کہا گیا ہے وہ ان کے لیے دنیاوی عذاب ہے لیکن ان کی سزا یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد روزِ قیامت بھی خدا انھیں رسوا کرے گا (ثم یوم القیامۃ یخزیھم) وہاں ان سے پوچھے گا اور کہے گا کہاں ہیں تمھارے وہ شریک جو تم نے میرے لیے بنائے تھے۔ اور ان سے تمھیں بڑی عقیدت تھی اور ان کی وجہ سے تم دوسروں سے جنگ و جدال کرتے تھے بلکہ دشمنی پر تل جاتے تھے" (و یقول این شرکاءی الذین کنتم تشاقون فیھم)۔[1]

یقیناً اس سوال کا جواب ان کے پاس نہیں ہے لیکن اس موقع پر اہلِ علم لب کشائی کریں گے اور کہیں گے۔ شرمندگی، رسوائی اور بدبختی آج کے دن کفار کے لیے ہے۔ (قال الذین اوتوا العلم ان الخزی الیوم و السوء علی الکافرین)۔

یہاں سے واضح ہو جاتا ہے کہ روزِ قیامت گفتگو علماء کریں گے کیونکہ اس عظیم بارگاہ میں ایسی گفتگو کرنا چاہیے جس میں کوئی غلطی نہ ہو اور ایسا اہلِ ایمان علماء کے سوا کسی سے نہیں ہو سکتا۔ یہ جو بعض روایات میں اس سے مراد آئمۂ اہلِ بیتؑ لیے گئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ "با ایمان علماء" کا بہترین مصداق ہیں۔[2]

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مشرکین اور علماء کے درمیان اس سوال و جواب کا رد و بدل کسی پنہاں بات کو ظاہر کرنے کے لیے نہیں بلکہ یہ بھی مشرکین کے لیے ایک قسم کی نفسیاتی سزا اور عذاب ہے خصوصاً آگاہ مومنین اس جہان میں ہمیشہ ان مغرور مشرکین کی ملامت کا نشانہ بنتے رہے تھے اور وہاں یہ مغرور اپنی سزا بھی اسی کیفیت سے پائیں گے انھیں بھی ملامت کی جائے گی جبکہ وہ ایسی جگہ پر ہوں گے جہاں نہ وہ انکار کر سکتے ہوں گے اور نہ وہاں سے نکل سکتے ہوں گے۔

گذشتہ آیت کے آخر میں جن کفار کا ذکر تھا اگلی آیت کے بارے میں انہی کا ذکر ہے یہ ذکر دراصل ایک ہلا دینے والا اور غافل افراد کو بیدار کرنے والا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وہ ایسے لوگ ہیں کہ موت کے فرشتے اس عالم میں ان کی روحیں قبض کرتے ہیں جبکہ انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہوتا ہے (الذین تتوفٰھم الملائکۃ ظالمی انفسھم)۔

---

[1] "تشاقون" "شقاق" کے مادہ سے مخالفت اور دشمنی کے معنی میں ہے اور اس کی اصل "شق" نصف کرنے اور شگافتہ کرنے) کے معنی میں آیا ہے۔

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ صفحہ ۵۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

انسان جو ظلم و ستم کرتا ہے، پہلے مرحلے میں وہ خود اسی پر ہوتا ہے اور دوسروں کے گھر سے پہلے وہ اپنا ہی گھر ویران کرتا ہے کیونکہ ظلم کا پہلا قدم یہ ہے کہ خود ظلم کرنے والے کی باطنی خوبیاں اور اس کی اپنی اچھی صفات برباد ہو جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں جس معاشرے میں ظلم کی بنیاد رکھی جائے اجتماعی و معاشرتی رشتوں کے حوالے سے چکر لگاتا ہوا وہ ظلم خود ظالم کے گھر کی طرف پلٹ آتا ہے۔

لیکن یہ ظالم جب اپنے آپ کو موت کی چوکھٹ پر دیکھتے ہیں اور غرور و غفلت کے پردے ان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے ہیں تو وہ فوراً مان لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے بُرا کام انجام دیا ہے (فالقوا السلم ما کنا نعمل من سوء)۔

وہ ہر قسم کے بُرے کام کا انکار کیونکر کریں گے ؟ کیا وہ جھوٹ بولیں گے، اس لیے کہ بار بار جھوٹ بولنے کی وجہ سے جھوٹ ان کی ذاتی صفت بن گیا ہے یا کیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے یہ کام انجام دیئے ہیں لیکن ہم سے غلطی ہو گئی ہے اگرچہ ہماری نیت بُری نہیں تھی۔ ممکن ہے دونوں وجوہ ہوں۔

مگر ان سے فوراً کہا جائے گا کہ تم جھوٹ بولتے ہو تم نے بہت سے بُرے کام کیے ہیں۔ جی ہاں! اللہ تمھارے اعمال اور اسی طرح تمھاری نیتوں سے باخبر ہے (بلیٰ ان اللہ علیم بما کنتم تعملون)۔ لہٰذا اب انکار کرنے اور بہانے بنانے کی گنجائش نہیں۔

اب جبکہ ایسا ہے تو جہنم کے دروازوں سے داخل ہو جاؤ کہ تم نے اس میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے (فادخلوا ابواب جھنم خالدین فیھا) متکبرین کا ٹھکانا کس قدر بُرا ہے (فلبئس مثوی المتکبرین)۔

چند اہم نکات

۱۔ اچھی اور بُری سُنّت :۔ ایک عمل انجام سے پہلے کئی مرحلوں سے گزرتا ہے اس میں رہبروں، ہدایت کرنیوالوں یا وسوسے ڈالنے والوں کا اثر بھی اہمیت رکھتا ہے اسی طرح اچھی یا بُری سنتیں اور رسمیں بھی اعمال کے لیے فکری اور معاشرتی اعتبار سے زمین ہموار کرتی ہیں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بعض اوقات رہبروں اور کسی کام کی بنیاد رکھنے والوں کا اثر دیگر تمام عوامل سے زیادہ ہوتا ہے لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ وہ برائیوں یا نیکیوں میں شریک نہ ہوں اسی منطق کی رُو سے قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں نیکی یا بدی کی بنیاد رکھنے یا اچھی بُری سنت قائم کرنے کے مسئلہ کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔

مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ گمراہ اور گمراہ کنندہ متکبر اپنے گناہوں کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر رکھتے ہیں اور ایک حصّہ اپنے پیروکاروں کے گناہوں کا بھی (بغیر اس کے کہ پیروکاروں کی ذمّہ داری میں کوئی کمی واقع ہو)۔

یہ بات اس قدر اہم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الدال علی الخیر کفاعلہ

نیکی کی دعوت دینے والا نیکی کرنے والے کی طرح ہے[1]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۱، ص ۴۳۶۔

Marfat.com

زیر بحث آیت کے ذیل میں رسول اللہؐ سے منقول حدیث میں ہے آپ نے فرمایا:

ایما داع دعی الی الھدی فاتبع ، فلہ مثل اجورھم، من غیر ان ینقص من اجورھم شیئًا وایما داع دعی الی ضلالۃ فاتبع علیہ فان علیہ مثل اوزار من اتبعہ، من غیر ان ینقص من اوزارھم شیئًا۔

جو شخص ہدایت کی دعوت دے اس کا اجر اس ہدایت پر عمل کرنے والوں جتنا ہوگا جبکہ عمل کرنے والوں کے ثواب میں بھی کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جو شخص گمراہی کی دعوت دے گا اسے اس کے پیروکاروں جتنی سزا ملے گی جبکہ پیروکاروں کی سزا میں بھی کوئی تخفیف نہ ہوگی[1]

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

من استن بسنۃ عدل فاتبع کان لہ اجر من عمل بھا، من غیر ان ینتقص من اجورھم شیء ومن استن سنۃ جور فاتبع کان علیہ مثل وزر من عمل بہ، من غیر ان ینتقص من اوزارھم شیء

جو شخص کسی اچھی سُنّت کی بنیاد رکھے اور لوگ اس کی پیروی کریں تو اس کا اجر پیروی کرنے والوں جتنا ہوگا جبکہ خود عمل کرنے والوں کا اجر بھی کم نہ ہوگا اور جو شخص کسی ظلم وجور کی بنیاد رکھے اور لوگ اس کی پیروی کریں تو اس کا گناہ عمل کرنے والوں جتنا ہوگا جبکہ عمل کرنے والوں کے گناہوں میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی[2]

اس مضمون کی متعدد دیگر روایات معصوم پیشواؤں سے نقل ہوئی ہیں شیخ حر عاملی علیہ الرحمۃ نے یہ روایات وسائل کی جلد ۱۱ کتاب "الامر بالمعروف والنہی عن المنکر" کے باب ۱۶ میں جمع کی ہیں۔

صحیح مسلم میں بھی رسول اکرمؐ سے اس مضمون کی ایک حدیث نقل ہوئی ہے۔

رسول اللہؐ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے کچھ افراد آپ کے پاس آئے ان کے پاؤں ننگے تھے جسم پر لباس نہیں تھا، تلواریں انھوں نے اپنی کمروں سے باندھ رکھی تھیں (اور وہ جہاد کے لیے تیار تھے) ان کے فقر وفاقہ کا یہ عالم دیکھا تو رسول اللہؐ کا چہرہ دگرگوں ہوگیا آپ اپنے گھر میں چلے گئے واپس آئے تو بلالؓ کو حکم دیا کہ لوگوں سے کہو کہ جمع ہو جائیں اور انھیں نماز کی دعوت دو، نماز پڑھی گئی، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا:

---

[1] مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ ص ۴۳۶۔

Marfat.com

اے لوگو! خدا سے ڈرو، وہی خدا کہ جس نے تم سب کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے، اور جان لو کہ خدا تمھیں دیکھ رہا ہے لوگو تقویٰ اختیار کرو اور کل قیامت کے لیے غور و فکر کرو۔ تم میں سے جو جس کے بس میں ہے۔ دینار، درہم، لباس، گندم، کھجور یہاں تک کہ آدھی کھجور سے بھی حاجت مند کی مدد کرو۔

اس دوران ایک انصاری رقم کی ایک تھیلی لے آیا۔ تھیلی اتنی بڑی تھی کہ اس کے ہاتھ میں نہیں آسکتی تھی۔ اس سے لوگوں کو تشویق ہوئی۔ یکے بعد دیگرے انھوں نے مختلف چیزیں امداد کے طور پر دیں۔ یہاں تک کہ اناج اور لباس کے دو ڈھیر لگ گئے۔

رسول اللہؐ کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، اس وقت آپؐ نے فرمایا:

من سن فی الاسلام سنة حسنة فله اجرها واجر من عمل بها بعده من غیر ان ینتقص من اجورهم شیء ومن سن فی الاسلام سنة سیئة کان علیه وزرها ووزر من عمل بها من بعده من غیر ان ینتقص من اوزارهم شیء۔

یعنی جس نے اسلام میں کسی اچھی سنّت کی بنیاد رکھی، اسے اس کا اجر ملے گا اور اس پر جو عمل ہوگا اس کا اجر بھی ملے گا جبکہ عمل کرنے والوں کے اجر میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔ اور جو کوئی اسلام میں کسی بُری سنت کی بنیاد رکھے گا اُسے اس کا بوجھ اٹھانا پڑے گا اور اس پر جو عمل ہوگا اس کا بوجھ بھی۔ جبکہ عمل کرنے والوں کے بوجھ میں بھی کوئی کمی نہ ہوگی۔[۱]

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ یہ احادیث اور ان جیسی قرآنی آیات سورۂ انعام کی اس آیت سے کیسے مطابقت رکھتی ہیں، جس میں فرمایا گیا ہے:

ولا تزر وازرة وزر اخرٰی

کوئی دوسرے کا گناہ اپنے کندھے پر نہیں اٹھاتا۔ (انعام ــــــ ۱۶۵)

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب پوری طرح واضح ہوجاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ لوگ دوسروں کے گناہوں کے جواب دہ نہیں ہیں بلکہ اپنے ہی گناہوں کے جواب دہ ہیں کیونکہ یہ دوسروں کے گناہوں کے عمل میں آنے میں شریک ہیں اور ایک لحاظ سے یہ خود انہی کا گناہ شمار ہوتا ہے۔

۲۔ بے موقع تسلیم حق: بہت کم ایسے لوگ ہیں جو حقیقت کو شہود کے عالم میں دیکھ کر بھی جھٹلا دیں۔ یہی وجہ ہے کہ گنہگار اور ظالم جب موت کی چوکھٹ پر پہنچتے ہیں اور غفلت و غرور کے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ برزخ کھل جاتی ہے تو اظہار ایمان

---

[۱] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۷۰۴، (باب "الحث علی الصدقة ولو بشق تمرة")۔

Marfat.com

کرنے لگتے ہیں جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں ہے۔

فالقوا السلم

البتہ ایسے لوگ اس موقع پر مختلف باتیں کرتے ہیں۔ بعض اپنے پرانے اعمال کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم نے کوئی برا کام نہیں کیا (جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں آیا ہے) یعنی وہ اس قدر جھوٹ بول چکے ہوتے ہیں کہ جھوٹ اب اُن کے خمیر بدن کا حصّہ ہو گیا ہے اگرچہ وہ جانتے ہیں کہ جھوٹ بولنے کا موقع نہیں پھر بھی جھوٹ بولتے ہیں یہاں تک کہ بعض آیاتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ روزِ قیامت بھی جھوٹ بولیں گے۔ قرآن کہتا ہے:

قالوا واللہ ربنا ما کنا مشرکین

مشرکین کہیں گے پروردگار کی قسم ہم مشرک نہیں ہیں ———— (انعام—۲۳)

بعض دوسرے اظہارِ ندامت کریں گے اور دُنیا کی طرف لوٹائے جانے کی درخواست کریں گے۔ (سجدہ—۱۲)

بعض ایسے بھی ہوں گے جو صرف اظہارِ ایمان کریں گے مثلاً فرعون۔ (یونس—۹۰)

بہر حال ان میں سے کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ اس کا وقت گزر چکا ہو گا۔ ایسا اظہارِ ایمان اضطراری پہلو رکھتا ہے۔ اور ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ اضطراری ایمان کا کوئی فائدہ نہیں۔

Marfat.com

۳۰۔ وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۚ قَالُوا خَيْرًا ۗ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ ۚ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِينَ ۙ ○

۳۱۔ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۖ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ ۚ كَذَٰلِكَ يَجْزِي اللَّهُ الْمُتَّقِينَ ۙ ○

۳۲۔ الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ۙ يَقُولُونَ سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ○

ترجمہ

۳۰۔ جب پرہیزگاروں سے کہا جاتا ہے کہ تمھارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں خیر (اور سعادت) جن لوگوں نے اس دُنیا میں نیکی کی ہے ان کے لیے بھلائی ہے اور آخرت کا گھر تو اس سے بھی بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کتنا اچھا ہے۔

۳۱۔ بہشتِ جاوداں کے باغات ہیں کہ جن میں وہ سب داخل ہوں گے ان کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ جو کچھ چاہیں گے وہاں موجود ہے۔ اللہ پرہیزگاروں کو اسی طرح جزا دیتا ہے۔

۳۲۔ وہی کہ (قبض روح کرنے والے) فرشتے جن کی روح اس حالت میں قبض کریں گے کہ وہ پاک و پاکیزہ ہوں گے انھیں کہیں گے کہ تم پر سلام ہو اپنے اعمال کے سبب بہشت میں داخل ہو جاؤ۔

تفسیر

نیک لوگوں کا انجام:

گذشتہ آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ مشرکین قرآن کے بارے میں کیا اظہارِ خیال کرتے تھے ان آیات میں ہم نے ان مشرکین کا

Marfat.com

انجام بھی پڑھا ہے۔ زیرِ نظر آیات میں مومنین کا اعتقاد بتایا گیا ہے اور ان کے انجام کار کی بھی خبر دی گئی ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جب پرہیزگاروں سے کہا جاتا کہ تمھارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں خیر و سعادت (وقیل للذین اتقوا ماذا انزل ربکم قالوا خیرًا)۔

تفسیر قرطبی میں ہے کہ جس وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں تھے تو موسم حج میں جزیرۃ العرب کے مختلف گوشوں سے لوگ جوق در جوق مکہ میں آتے تھے۔ ان کے کانوں تک پیغمبر اسلامؐ کے بارے میں ادھر اُدھر سے اڑتی ہوئی باتیں پہنچی ہوتی تھیں لہٰذا جب وہ مختلف لوگوں سے ملتے تو اس بارے میں پوچھتے۔ جب وہ مشرکین سے بات کرتے تو وہ کہتے کہ کوئی خاص بات نہیں وہی فضول افسانے اور گھسی پٹی کہانیاں ہیں اور جب اُن کی ملاقات مومنین سے ہوتی اور وہ ان سے سوال کرتے تو وہ کہتے کہ ہمارے پروردگار نے سوائے خیر و سعادت کے کوئی چیز نازل نہیں کی۔

"خیر" کس قدر معنی خیز، خوبصورت اور جامع تعبیر ہے وہ بھی مطلق صورت میں کہ جس کے مفہوم میں تمام طرح کی نیکیاں، مادی، روحانی سعادتیں اور کامیابیاں شامل ہیں دنیا میں خیر، آخرت میں خیر، فرد کے لیے خیر، معاشرے کے لیے خیر، تعلیم و تربیت میں خیر، سیاست و اقتصاد میں خیر اور امن و آزادی کی خیر، مختصر یہ کہ ہر لحاظ سے خیر۔ (کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ جب کسی لفظ کے متعلق کو حذف کر دیا جائے تو اس کے مفہوم میں عمومیت پیدا ہو جاتی ہے)۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن کے متعلق خود قرآن میں طرح طرح کی تعبیریں آئی ہیں مثلاً نور، شفاء، ہدایت اور فرقان (حق کو باطل سے جدا کرنے والا) حق اور تذکرہ وغیرہ۔ لیکن شاید یہ واحد آیت ہے جس میں "خیر" کی تعبیر آئی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ دیگر تمام خاص مفاہیم اس عام مفہوم میں جمع ہیں۔

ضمناً وہ اختلاف تعبیر جو مشرکین اور مومنین قرآن کے بارے میں کرتے تھے قابلِ ملاحظہ ہے مومنین کہتے تھے "انزل خیرًا" یعنی خدا نے خیر و سعادت نازل کی ہے اس طرح سے وہ اپنے اس ایمان کا بھی اظہار کرتے تھے کہ قرآن وحی الٰہی ہے[1] جبکہ مشرکین سے پوچھا جاتا کہ تمھارے پروردگار نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے کہ یہ تو "اساطیر الاولین" یعنی گزرے ہوؤں کے قصے کہانیاں ہیں اس طرح وہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے کا قطعی انکار کر دیتے تھے[2]

اس کے بعد جیسا کہ گزشتہ آیات میں مشرکین کی باتوں کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے کہ انھیں دنیا اور آخرت میں کئی گنا مادی و روحانی عذاب کا سامنا کرنا پڑے گا۔

زیرِ نظر آیات میں مومنین کے اعتقادات کا نتیجہ بھی بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے جنھوں نے نیکی کی ہے ان کے لیے اس دنیا میں نیکی ہے (للذین احسنوا فی ھذہ الدنیا حسنۃ)۔

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ ان کی جزا "حسنۃ" ان کے اظہار ایمان "خیر" کی طرح مطلق ہے اور اس کے مفہوم میں اس جہان

---

[1] "خیرًا" درحقیقت فعل محذوف کا مفعول ہے اور تقدیر میں "انزل خیرًا" تھا۔

[2] "اساطیر الاولین" مبتداء محذوف کی خبر ہے اور تقدیر میں "ھذہ اساطیر الاولین" تھا۔

Marfat.com

انواع واقسام کی حسنات اور نعمات شامل ہیں۔

یہ تو ان کی دنیا کی جزا ہے جبکہ "آخرت کا گھر اس سے بھی بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کس قدر اچھا ہے (ولدار الاخرة خیر ولنعم دار المتقین)۔

یہاں پھر ہم "خیر" اور "نعم دار المتقین" کے الفاظ پا رہے ہیں یہ دونوں اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ مطلق ہیں اور ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ ثواب اور جزا کیفیت و کمیّت کے اعتبار سے انسانی اعمال کا عکس العمل ہیں۔

جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے ضمناً یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ "للذین احسنوا...... تا آخر آیہ" ——— ظاہراً کلام خدا ہے اور ان آیات میں اور گذشتہ آیات میں مقابلے کا قرینہ اس معنی کو تقویت پہنچاتا ہے البتہ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر میں دو احتمال ذکر کیے ہیں پہلا یہ کہ یہ کلام خُدا ہے اور دوسرا یہ کہ پرہیزگاروں کے کلام کا تتمّہ ہے۔

پہلے تو پرہیزگاروں کے گھر کا ذکر سربستہ طور پر کیا گیا ہے اگلی آیت میں اس کی توصیف یوں کی گئی ہے: پرہیزگاروں کا گھر بہشت کے جاوداں باغ ہیں۔ یہ سب ان گھروں میں داخل ہوجائیں گے (جنات عدن یدخلونها) ان درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی (تجری من تحتها الانهٰر)۔ یہی نہیں کہ وہاں باغات اور درخت ہوں گے بلکہ وہ جو کچھ چاہیں وہاں موجود ہے (لهم فیها ما یشاءون)۔

کیا نعماتِ بہشت کی جامعیت اور وسعت کے بارے میں اس سے بہتر تعبیر ہوسکتی ہے؟ یہاں تک کہ یہ تعبیر سُورہ زخرف کی آیہ[1] میں آنے والی تعبیر سے زیادہ وسیع نظر آتی ہے، جہاں فرمایا گیا ہے:

وفیها ما تشتهیه الانفس و تلذّ الاعین

بہشت میں ہر وہ چیز موجود ہے جو دل چاہیں گے اور آنکھیں جس سے لذت محسوس کریں گی۔

سُورۂ زخرف کی اس آیت میں دلوں کی خواہش کا ذکر ہے جبکہ زیر بحث آیت میں مطلق "خواہش" کی بات کی گئی ہے (یشاءون) بعض مفسرین نے "لهم فیها" کے "ما یشاءون" پر مقدم ہونے سے انحصار کا استفادہ کیا ہے یعنی صرف وہی ایسی جگہ ہے جہاں انسان کو وہ سب کچھ ملے گا جو وہ چاہے گا ورنہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

ہم کہہ چکے ہیں کہ زیر بحث آیات کہ جن میں پرہیزگاروں کی زندگی اور موت کی کیفیت بیان کی گئی ہے، گزشتہ آیات سے ہم آہنگ اور ہم قرینہ ہیں کہ جن میں متکبر مشرکین کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ وہاں ہم نے پڑھا ہے کہ فرشتے ان کی روح اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ ظالم ہیں اور ان کی موت ان کی بدبختی کے نئے دور کی ابتداء ہے۔ اس کے بعد انھیں حکم دیا جائے گا کہ جہنم کے دروازوں میں داخل ہوجاؤ۔

لیکن یہاں فرمایا گیا ہے: پرہیزگار وہ لوگ ہیں کہ روح قبض کرنے والے فرشتے ان کی روح اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک و پاکیزہ ہیں (الذین تتوفاهم الملئکة طیبین)۔ اس موقع پر فرشتے "انھیں کہتے ہیں سلام ہو تم پر" (یقولون سلام علیکم)۔ وہ سلام کہ جو امن و سلامتی اور آرام و سکون کی نشانی ہے۔

اس کے بعد کہتے ہیں: اپنے اعمال کے سبب جنّت میں داخل ہوجاؤ (ادخلوا الجنة بما کنتم تعملون)۔

Marfat.com

تتوفاھم (ان کی روح حاصل کرتے ہیں) ــــــــ یہ موت کے بارے میں ایک لطیف تعبیر ہے اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ موت فنا و نابودی نہیں اور اس سے ہر چیز ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک بالاتر مرحلے کی طرف منتقل ہونے کا مرحلہ ہے۔

تفسیر المیزان میں ہے کہ:

اس آیت میں تین موضوعات پیش کیے گئے ہیں:

۱۔ متقین کی روح اس حالت میں قبض کی جائے گی کہ وہ پاک و طیب ہوں گے۔

۲۔ ان کے لیے ہر لحاظ سے امن و سلامتی کا ہونا۔

۳۔ بہشت کی طرف ان کی راہنمائی۔

ان تین نعمات کی نظیر سورہ انعام کی آیہ ۸۲ میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں۔

الذین اٰمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولٰئک لھم الامن وھم مھتدون

وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا ان کے لیے امن و امان ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔

Marfat.com

۳۳۔ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ تَأْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ أَوْ يَأْتِيَ أَمْرُ رَبِّكَ ؕ
كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ
كَانُوٓا أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ○
۳۴۔ فَأَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوا وَحَاقَ بِهِمْ مَا كَانُوا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُونَ ○ ع
۳۵۔ وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ
دُونِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُونِهٖ
مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ
إِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِينُ ○
۳۶۔ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا
الطَّاغُوتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَنْ حَقَّتْ
عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ
عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ○
۳۷۔ إِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي مَنْ يُضِلُّ وَ
مَا لَهُمْ مِنْ نّٰصِرِينَ ○

ترجمہ

۳۳۔ کیا وہ اس چیز کے علاوہ کسی چیز کے منتظر ہیں کہ (قبض رُوح کرنے والے) فرشتے ان کے پاس آئیں یا پھر (ان کی سزا کے بارے میں) تیرے پروردگار کا حکم آپہنچے (اور پھر وہ توبہ کریں جبکہ اس وقت کی توبہ

Marfat.com

بے سود ہے) ان سے پہلے والے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ خدا نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود انھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

۳۴۔ اور ان کے بُرے اعمال کا نتیجہ ان تک پہنچا اور جس (وعدۂ عذاب) کا وہ مذاق اڑاتے تھے وہ ان تک آپہنچا۔

۳۵۔ مشرکین نے کہا: اگر خدا چاہتا تو ہم اور ہمارے آباؤ اجداد اس کے غیر کی عبادت نہ کرتے اور نہ اس کی اجازت کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے (جی ہاں) ان سے پہلے لوگوں نے بھی یہی کام انجام دیے ہیں لیکن کیا انبیاء کی ذمہ داری سوائے واضح تبلیغ کے کچھ ہے؟

۳۶۔ ہم نے ہر امت میں ایک رسُول بھیجا کہ وہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اور طاغوت سے اجتناب کریں۔ ایک گروہ کو خدا نے ہدایت کی اور ایک گروہ کو گمراہی دامن گیر ہوئی پس رُوئے زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

۳۷۔ تم ان کی ہدایت کی جتنی بھی لالچ کرو (کوئی فائدہ نہیں) کیونکہ اللہ نے جسے گمراہ کیا ہے اس کی ہدایت نہیں کرتا اور ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔

تفسیر

انبیاء کی ذمہ داری واضح تبلیغ ہے

قرآن دوبارہ مشرکین اور مستکبرین کی طرز فکر اور طرز عمل کے بارے میں تجزیہ و تحلیل کرتا ہے اور تہدید آمیز لہجے میں کہتا ہے: وہ کس انتظار میں ہیں "کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ موت کے فرشتے ان کے پاس آئیں" توبہ کے دروازے بند ہو جائیں دفتر اعمال لپیٹ دیا جائے اور واپسی کی کوئی راہ باقی نہ رہے (هل ینظرون الا ان تأتیهم الملائکة)۔

یا پھر کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے لیے تیرے پروردگار کی طرف سے عذاب کا حکم صادر ہو (او یأتی امر ربک) جبکہ اس حالت میں بھی توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے اور بازگشت اور تلافی کا راستہ باقی نہ رہے گا۔

یہ ان کی کیسی طرز فکر ہے، کیسی ہٹ دھرمی ہے اور کیا احمقانہ انداز ہے۔

یہاں لفظ "ملائکہ" اگرچہ مطلق طور پر آرہا ہے لیکن گذشتہ آیات کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ جن میں رُوح قبض کرنے والے فرشتے کے بارے میں گفتگو ہے یہاں بھی وہی مراد ہیں۔

"یأتی امر ربک" (خدا کا حکم آجائے گا) اس جملے سے بہت سے احتمالات پیدا ہوسکتے ہیں لیکن اگر اس امر کی طرف

Marfat.com

توجہ کی جائے کہ یہ تعبیر قرآن کی مختلف آیات میں نزولِ عذاب کے بارے میں آئی ہے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہاں بھی وہی معنی مراد ہے۔
بہرحال مجموعی طور پر ان دو جملوں سے تہدید کا مفہوم نکلتا ہے یہ تہدید اور دھمکی مستکبرین کے لیے ہے ان سے کہا گیا ہے کہ اگر خدا کی طرف سے پند و نصیحت اور اس کے انبیاء کی طرف سے وعظ و نصیحت سے تم بیدار نہیں ہوتے تو عذاب اور موت کے تازیانے تمھیں بیدار کریں گے لیکن اس وقت بیدار ہونے سے تمھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: یہی گروہ نہیں کہ جس کا یہ طرزِ عمل ہے بلکہ "گذشتہ مشرکین اور مستکبرین بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے (کذٰلک فعل الذین من قبلهم) خدا نے تو ان پر ظلم نہیں کیا انھوں نے خود ہی اپنے اُوپر ظلم کیا ہے (و ما ظلمهم الله ولکن کانوا انفسهم یظلمون)۔

کیونکہ درحقیقت خدا اُن کے اعمال ہی کا نتیجہ ان کی طرف لوٹائے گا۔ یہ جملہ پھر اس حقیقت کی تاکید کرتا ہے کہ ہر ظلم اور برائی جو انسان سے سرزد ہوتی ہے آخرکار اسی کی دامن گیر ہوتی ہے بلکہ ہر چیز سے پہلے ان تک آپہنچتی ہے کیونکہ بُرے عمل کے بُرے آثار اپنے فاعل کی روح پر اثرانداز ہوتے ہیں اور اس سے اس کا دِل تاریک ہوجاتا ہے روح آلودہ ہوجاتی ہے اور آرام و سکون جاتا رہتا ہے۔

دوبارہ ان کے اعمال کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: بالآخر ان کے اعمال کی برائیاں ان تک آپہنچتی ہیں (فاصابهم سیئات ما عملوا)۔ (وعدہ عذابِ الٰہی کہ) جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے ان تک آپہنچے گا (وحاق بهم ما کانوا به یستهزءون)۔

"حاق بهم" کا معنی ہے "ان پر وارد ہوا"، لیکن قرطبی، فرید وجدی اور بعض دیگر مفسرین نے اسے احاطہ کرنے کے معنی میں لیا ہے۔ البتہ اس سے ایسا مفہوم مراد لیا جانا چاہیے جس میں وارد ہونا اور احاطہ کرنا دونوں معانی شامل ہوں۔

بہرحال یہ آیت کہ جو کہتی ہے کہ "ان کے اعمال کی برائیاں اُن تک آپہنچیں" ایک مرتبہ پھر اس حقیقت پر زور دیتی ہے کہ یہ انسان کے اپنے ہی اعمال ہیں کہ جو اس جہان میں بھی اور اس جہان میں بھی اسے دامن گیر ہوتے ہیں اس کے یہ اعمال مختلف صُورتوں میں بھی مجسم ہوتے ہیں اور اسے رنج تکلیف، آزار اور اذیت دیتے ہیں[۱]۔

اگلی آیت مشرکین کی ایک کمزور اور بے بنیاد منطق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے: مشرکین کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم، ہمارے آباؤ اجداد اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرتے" اور بتوں کا رُخ نہ کرتے (و قال الذین اشرکوا لو شاء الله ما عبدنا من دونه من شیءٍ نحن ولا اٰباؤنا) اور کوئی چیز اس کے اذن کے بغیر حرام قرار دیتے (ولا حرمنا من دونه من شیءٍ)۔

یہ کچھ چوپایوں کی طرف اشارہ ہے کہ جنھیں مشرکین نے زمانۂ جاہلیت میں اپنی طرف سے حرام قرار دے لیا تھا اُن کے اس طرزِ عمل پر پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدید تنقید کرتے تھے۔

---

[۱] اس بناء پر ضروری نہیں کہ ہم "جزا" کو "سیئات" سے پہلے مقدّر فرض کریں۔

Marfat.com

خلاصہ یہ کہ ان کا دعویٰ تھا کہ بتوں کی پرستش اور حلال حرام قرار دینا اور ان کے دیگر کام اللہ کی رضا سے ہیں اور اس کے اذن کے بغیر نہیں ہیں۔

ہوسکتا ہے یہ گفتگو اس امر کی طرف اشارہ ہو کہ وہ جبر کا عقیدہ رکھتے تھے اور ہر چیز کو تقدیر سے وابستہ سمجھتے تھے۔ اس آیت سے بہت سے مفسرین نے یہی مراد لیا ہے۔

لیکن یہ احتمال بھی ہے کہ ان کا یہ کہنا عقیدۂ جبر کی بنیاد پر نہ ہو اور اس کا استدلال یہ ہو کہ اگر ہمارے اعمال پر خدا راضی نہیں ہے تو پھر اس نے پہلے پیغمبر اور رسول بھیج کر ان سے منع کیوں نہیں کیا اور کیوں ہمارے بزرگوں سے پہلے دن ہی نہیں کہا کہ میں ان کاموں سے راضی نہیں ہوں۔ اس کی یہ خاموشی اس کی رضا کی دلیل ہے۔

یہ تفسیر اس آیت اور اس کے بعد کی آیات کے ظاہری مفہوم سے مناسبت رکھتی ہے اسی لیے بلافاصلہ فرمایا گیا ہے ان کے آباؤ اجداد بھی یہی کچھ کرتے تھے (اور انہی بہانوں کا سہارا لیتے تھے) لیکن کیا انبیاءِ الٰہی کی ذمہ داری واضح تبلیغ کے علاوہ کچھ اور ہے؟ (کذلک فعل الذین من قبلھم فھل علی الرسل الا البلاغ المبین)۔

یعنی

اوّلاً یہ جو تم کہتے ہو کہ خدا نے سکوت اختیار کر رکھا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے، جو پیغمبر بھی آیا ہے اس نے توحید کی اور نفیِ شرک کی دعوت دی ہے۔

ثانیاً خدا اور پیغمبر کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ مجبور کریں بلکہ ان کے ذمہ ہے کہ راستے کی نشان دہی کریں اور یہ کام کیا جا چکا ہے۔

ضمنی طور پر "کذلک فعل الذین من قبلھم" (جو لوگ اُن سے پہلے تھے انہوں نے بھی یہی کام انجام دیئے ہیں) یہ ایک طرح سے پیغمبر کی تسلی کے لیے ہے تاکہ وہ جان لیں کہ یہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں پہلے انبیاء کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا آیا ہے لہٰذا ملول نہ ہوں، استقامت سے کام لیں اور ڈٹ جائیں خدا آپ کا یاور و مددگار ہے۔

یہ حقیقت بیان کرنے کے بعد کہ انبیاء کی ذمہ داری صرف ابلاغ آشکار اور تبلیغ واضح ہے۔ اگلی آیت میں انبیاء کی کیفیتِ دعوت کی طرف ایک مختصر اور جامع اشارہ کیا گیا ہے فرمایا گیا ہے: ہم نے ہر اُمت میں رسول بھیجا ہے (و لقد بعثنا فی کل امۃ رسولا)۔

لفظ "امّۃ" "ام" سے ماں کے معنی میں ہے یا ہر اس چیز کے معنی میں ہے جو کسی دوسری چیز کو اپنا ضمیمہ قرار دے لہٰذا ہر وہ جماعت کہ جس کے افراد میں زمان، مکان، فکر یا ہدف میں کسی طرح کی وحدت ہو اسے "امہ" کہا جاتا ہے قرآن میں یہ لفظ ۶۴ سے زیادہ مرتبہ آیا ہے ان کے مطالعے سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: کہ ان سب رسولوں نے یہی دعوت دی ہے کہ خدائے یکتا کی پرستش کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو" (ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت)[1]

---

[1] یہ جملہ تقدیر میں یوں تھا - "لیقول لھم اعبدوا اللہ ......"

Marfat.com

یعنی تمام انبیاء کی دعوت کی بنیاد عقیدۂ توحید اور طاغوت سے مقابلہ تھا اور یہی وہ پہلی چیز تھی کہ جس کی طرف سب انبیاءؑ بلااستثناء دعوت دیتے تھے کیونکہ اگر توحید کے ستون مستحکم نہ ہوں اور انسانی معاشرے سے طاغوتیت اور طاغوتی افکار نکال باہر نہ کیے جائیں تو کوئی اصلاحی پروگرام قابلِ عمل نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "طاغوت" مبالغے کا صیغہ ہے یہ "طغیان" کے مادہ سے ہے جس کا مطلب ہے حد اور سرحد سے تجاوز کرنا اور "طاغوت" تجاوز کرنے والے کو کہتے ہیں لہذا شیطان، بُت اور ظالم و ستمگر حاکم کو "طاغوت" کہتے ہیں اور ہر وہ راستہ جو غیر حق تک جا پہنچائے اسے "طاغوت" کہا جاتا ہے یہ لفظ مفرد اور جمع دونوں معانی میں استعمال ہوتا ہے اگرچہ بعض اوقات اس کی جمع "طواغیت" کی جاتی ہے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کی دعوتِ توحید کا نتیجہ کیا نکلتا ہے قرآن کہتا ہے: ان امتوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں خدا نے ہدایت کی (فمنهم من هدى الله) اور ان میں ایسے بھی تھے کہ گمراہی جنھیں دامن گیر ہوئی (و منهم من حقت عليه الضلالة)۔

اس موقع پر بھی مکتبِ جبر کے پیروکاروں نے آواز بلند کی ہے کہ یہ آیت بھی ہمارے مکتب کی صداقت کے لیے ایک دلیل ہے لیکن ہم نے بارہا کہا ہے کہ اگر ہدایت و ضلالت والی آیات کو ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو کسی قسم کا کوئی ابہام باقی نہیں رہتا اور نہ صرف یہ کہ وہ جبر کی طرف اشارہ نہیں کرتیں، وضاحت سے انسانی اختیار، ارادے اور آزادی کو بیان کرتی ہیں کیونکہ بہت سی قرآنی آیات میں ہے کہ خدائی ہدایت و ضلالت اس اہلیت اور نااہلی کے بعد ہے کہ جو انسانوں کے اعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

قرآن صراحت سے کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ ظالموں، ہیرا پھیری کرنے والوں، جھوٹوں اور اس قسم کے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا اس کے برعکس جو لوگ راہِ خدا میں جہاد اور جد و جہد کرتے ہیں اور دعوتِ انبیاء کو قبول کرتے ہیں ان پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے۔ انھیں تکامل وارتقاء کی منزلوں کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور سیر الی اللہ کا راستہ کہ جو نشیب و فراز سے پُر ہے اس میں ہدایت کرتا ہے جبکہ ظالموں اور جھوٹوں کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتیں اور عالمِ بے راہ روی میں سرگرداں رہیں نیز اعمال اچھے ہوں یا بُرے ان کی خاصیت چونکہ خدا کی طرف سے ہے لہٰذا ان کے نتائج کی نسبت خدا کی طرف دی جاسکتی ہے۔

جی ہاں! خدا کی سنت یہ ہے کہ وہ ہدایتِ تشریعی کا طریقہ اختیار فرماتا ہے یعنی انبیاء کو مبعوث کرتا ہے تاکہ وہ فطرت سے ہم آہنگ ہوکر لوگوں کو توحید اور نفیٔ طاغوت کی دعوت دیں اس ہدایتِ تشریعی کے بعد جو شخص بالگر وہ اپنی لیاقت و اہلیت ثابت کرتا ہے وہ اس کے لطف و ہدایتِ تکوینی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔

جی ہاں! یہ ہے خدا کی دائمی سنت، نہ وہ کہ جو فخر الدین رازی اور اس جیسے مکتبِ جبر کے طرفداروں نے کہا ہے کہ خدا پہلے انبیاء کے ذریعے دعوت دیتا ہے اور پھر جبری طور پر (بغیر کسی وجہ کے) لوگوں میں ایمان یا کفر پیدا کر دیتا ہے تعجب کی بات یہ ہے کہ ان کے خیال میں اس سلسلے میں خدا سے کسی قسم کا کوئی سوال و جواب نہیں ہوسکتا۔

واقعاً ان لوگوں نے خدا کا کیسا وحشت ناک تصور پیش کیا ہے کہ جو کسی عقل، احساس اور منطق سے مناسبت نہیں رکھتا۔

Marfat.com

یہ امر لائق توجہ ہے کہ زیر بحث آیت میں ہدایت اور ضلالت کے بارے میں مختلف انداز سے بات کی گئی ہے پہلے فرمایا گیا ہے: "خدا نے ایک گروہ کی ہدایت کی" لیکن ضلالت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ" خدا نے ایک گروہ کو گمراہ کیا" بلکہ فرمایا: ۔

حقت علیھم الضلالۃ

یعنی ــــــــ گمراہی ان کے لیے ثابت ہوگئی اور ان کے دامن سے لپٹ گئی۔

تعبیر کا یہ فرق ہوسکتا ہے۔ دوسری آیات قرآن اور بعض روایات سے ظاہر ہونے والی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ ہدایت کا زیادہ تر تعلق ان مقدمات سے ہے جو خدا تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں۔ اس نے عقل دی ہے، انسانی فطرت کو توحید کے لیے آمادہ کیا ہے، انبیاء بھیجے ہیں اور تشریعی و تکوینی آیات دکھائی ہیں اب صرف بندوں کی طرف سے ایک آزادانہ ارادے کی ضرورت ہے کہ جو انھیں منزل مقصود تک پہنچادے۔

جبکہ ضلالت و گمراہی میں تمام تر کردار خود بندوں کا ہے کیونکہ خود بندے ہی تکوینی و تشریعی ہدایت کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں الٰہی فطرت کے قوانین کو پامال کرتے ہیں۔ تشریعی و تکوینی آیات کو پس پُشت ڈال دیتے ہیں اور انبیاء کی دعوت پر چشم بصیرت اور گوش ہوش بند کر لیتے ہیں۔ خلاصہ یہ تخریب و تحریف کے ان سب عناصر کے ساتھ وادیٔ ضلالت میں قدم رکھتے ہیں ـــــــ تو کیا یہ سب امور خود انھی کی طرف سے نہیں ہیں؟

سورۃ نسآء کی آیہ ۷۹ میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ما اصابك من حسنة فمن الله و ما اصابك من سيئة فمن نفسك

جو بھلائی تجھے حاصل ہو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو برائی تجھے پہنچے وہ خود تیری طرف سے ہے۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی طرف سے اصولِ کافی میں ایک حدیث نقل ہوئی ہے کہ جو اسر ب کو زیادہ واضح کرتی ہے۔

ایک صحابی نے آپ سے جبر و اختیار کے بارے میں سوال کیا۔

آپ نے جواب میں فرمایا:

لکھو:

بسم الله الرحمٰن الرحيم

قال علی بن الحسين قال الله عز وجل،

یابن آدم! بمشیتی کنت انت الذی تشاء،

وبقوتی ادیت الی فرائضی،

وبنعمتی قویت علی معصیتی،

جعلتك سميعًا بصيرًا،

Marfat.com

" ما اصابك من حسنة فمن الله وما اصابك من سيئة فمن نفسك "

" وذلك انى اولى بحسناتك منك ، وانت اولى بسيئاتك منى "

ترجمہ :- بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(امام) علی بن الحسین (زین العابدین) نے فرمایا کہ

(حدیث قدسی میں) اللہ عزوجل فرماتا ہے :

اے فرزند آدم ! میرا ارادہ ہے کہ جس کی بنیاد پر تو ارادہ کر سکتا ہے (میں نے تجھے ارادے کی آزادی بخشی ہے) ،

اور میری عطا کردہ قوت کے ساتھ تو واجبات ادا کر سکتا ہے ،

جبکہ میری نعمت سے سوئے استفادہ کرتے ہوئے تو نے اس قوت کو نافرمانی کی طاقت میں بدل لیا ہے ،

میں نے تجھے سننے اور دیکھنے والا بنایا ہے (اور صحیح اور غلط راستے کی نشاندہی کر دی ہے) ۔

اب جو بھلائی تجھے پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جس برائی کا تجھے سامنا کرنا پڑتا ہے وہ خود تیری طرف سے ہے"

یہ اس لیے ہے کہ تُو جو نیک کام انجام دیتا ہے اس کے حوالے سے میں تجھ سے اولیٰ اور زیادہ مستحق ہوں اور جن بُرے کاموں کا تو مرتکب ہوتا ہے مجھ سے سزاوار تر ہے [1]

آیت کے آخر میں گمراہوں کو بیدار کرنے اور ہدایت یافتہ افراد کی روحانی تقویت کے لیے ایک عمومی حکم صادر فرمایا گیا ہے : زمین میں چلو پھرو اور صفحۂ زمین پر یا تہِ خاک چھپے ہوئے گزشتہ لوگوں کے آثار کا مطالعہ کرو اور دیکھو آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا (فسيروا فى الارض فانظروا كيف كان عاقبة المكذبين) ۔

یہ تعبیر بھی انسانی ارادے کی آزادی کے لیے ایک زندہ دلیل ہے کیونکہ ہدایت و گمراہی جبری ہوتی تو زمین میں چلنا پھرنا اور گزشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنا فضول تھا لہٰذا یہ حکم بذاتِ خود اس بات کی تاکید ہے کہ کسی شخص کی سرنوشت پہلے سے معین شدہ نہیں ہے بلکہ خود اس کے اپنے ہاتھ میں ہے ۔

" سير فى الارض " (زمین میں چلنا پھرنا) اور گذشتہ لوگوں کے حالات کا مطالعہ کرنا ، اس بارے میں قرآن مجید میں بہت اور قابلِ توجہ مباحث موجود ہیں اس کا تفصیلی ذکر ہم تفسیر نمونہ ، جلد ۳ سورہ آلِ عمران آیت ۱۳۷ کے ذیل میں کر آئے ہیں ۔

زیر بحث آخری آیت میں پیغمبر اکرمؐ کی دلجوئی کے طور پر تاکید کی گئی ہے آخر کار یہ گمراہ اور ہٹ دھرم لوگ اس مقام تک

---

[1] اصول کافی جلد ۱ ص ۱۶۰ (باب الجبر والقدر حدیث ۱۲) ۔

Marfat.com

چاہیں گے تو جس قدر بھی" ان کی ہدایت کے لیے خواہش مند ہو جائے اور کوشش کرے، کوئی فائدہ نہ ہوگا، کیونکہ خدا جسے گمراہ کرے (پھر اسے) ہدایت نہیں کرتا" (ان تحرص علی ھداھم فان اللہ لا یھدی من یضل) "اور ان کے لیے کوئی یار و مددگار نہیں ہے" (و مالھم من ناصرین)۔

"تحرص" مادہ "حرص" سے خوب کوشش کے ساتھ کوئی چیز طلب کرنے کے معنی میں ہے۔

واضح ہے کہ یہ جملہ تمام منحرفین اور کج رو لوگوں کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ پیغمبر کا فریضہ ہے تبلیغ و ہدایت کرنا اور ہم جانتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ تبلیغ و ہدایت بہت سے گمراہوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کے باعث بہت سے افراد دینِ حق سے منسلک ہو جاتے ہیں اور بڑے عشق اور جذبے سے دینِ حق کا دفاع کرنے لگتے ہیں اور اس کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔

لہٰذا مندرجہ بالا جملہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے کہ جن کی ہٹ دھرمی اور بد دماغی انتہاء کو پہنچ گئی ہو اور وہ استکبار، غرور، غفلت اور گناہ میں ایسے غرق ہو گئے ہوں کہ ان کے سامنے ہدایت کے دروازے نہ کھل سکیں۔ ایسے لوگوں کی ہدایت کے لیے پیغمبر جتنی بھی کوشش کریں بے نتیجہ ہوتی ہے کیونکہ اپنے اعمال کے سبب وہ اس حد تک گمراہ ہیں کہ قابلِ ہدایت نہیں رہے۔

فطری امر ہے کہ ایسے لوگوں کا کوئی یار و مددگار بھی نہیں ہوتا کیونکہ یار و مددگار تو کسی مناسب موقع پر ہی اقدام کر سکتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر بھی نفی جبر کی دلیل ہے کیونکہ "ناصر" ایسے موقع سے مربوط ہے جہاں خود انسان کے اندر سے جوش پیدا ہو اور اس کا نتیجہ نصرت و مدد ہو (غور کیجئے گا)۔

"ناصرین" جمع کی صورت میں ہے یہ شاید اس طرف اشارہ ہو اس گروہ کے برعکس گروہ مومنین کا ایک دوست اور مددگار نہیں بلکہ بہت سے دوست اور مددگار ہیں خدا ان کا مددگار ہے انبیاء اور اولیاء الٰہی ان کے ناصر ہیں۔ ملائکہ رحمت بھی ان کے حامی و مددگار ہیں۔ سورۂ مومن کی آیہ ۵۱ میں ہے۔

انا لننصر رسلنا والذین امنوا فی الحیٰوۃ الدنیا و یوم یقوم الاشھاد

ہم اپنے رسولوں کی اور اسی طرح مومنین کی اس جہان میں روزِ قیامت جبکہ گواہی دینے والے شاہد کے لیے اٹھیں گے، نصرت کریں گے۔

نیز سورۂ حم السجدہ کی آیہ ۳۰ میں ہے:۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملائکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون ۝

جو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس عقیدے پر استقامت سے قائم رہتے ہیں ان پر آسمان کے ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور انھیں کہتے ہیں ڈرو نہیں اور غم نہ کھاؤ تمھیں اس جنت کی خوشخبری ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

Marfat.com

چند اہم نکات

۱۔ **"بلاغ مبین" کیا ہے :** آیات بالا میں بتایا گیا ہے کہ تمام انبیاء کی ذمہ داری "بلاغِ مبین" ہے۔

فھل علی الرسل الا البلاغ المبین

یعنی ہادیانِ الٰہی محدود وقت کے سوا اپنی دعوت مخفی طور پر جاری نہیں رکھ سکتے۔ مخفی کام اور وہ بھی دعوتِ رسالت کے زمانے میں قابلِ قبول اور نتیجہ بخش نہیں ہو سکتا۔ ایسی صراحت کہ جس میں رشد و ہدایت اور قاطعیت ہو تدبیر کے ساتھ ساتھ اس دعوت کی شرط ہے۔

اسی بناء پر تاریخ شاہد ہے کہ تمام انبیاء اگرچہ وہ عام طور پر تنہا ہوتے تھے، اپنی دعوت صراحت و وضاحت سے پیش کرتے تھے اور اس سلسلے میں ہر قسم کی مشکلات کے لیے تیار رہتے تھے اور یہی تمام حقیقی رہبروں کا دستور العمل ہے چاہے وہ انبیاء و مرسلین ہوں یا ان کے علاوہ۔ کیونکہ خاموش رہنے سے دعوت کو کوئی قبول نہیں کرتا اور نہ ہی دو مختلف پہلو رکھنے والی باتوں سے کوئی استفادہ کر پاتا ہے۔ حقیقی رہبر حقیقت بیان کرنے کے لیے کوئی چیز فروگذاشت نہیں کرتے وہ اس صراحت و قاطعیت کے تمام نتائج بھی دل و جان سے قبول کرتے ہیں۔

۲۔ **ہر اُمت کے لیے ایک رسول :** زیر بحث آیات میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول مبعوث کیا ہے۔
یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اگر ہر اُمت میں رسول بھیجا گیا ہے تو پھر دنیا کے تمام ممالک میں پیغمبر مبعوث ہوئے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کم از کم ایک امت ہے حالانکہ تاریخ اس بات کی نشاندہی نہیں کرتی۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ انبیاء بھیجنے کا مقصد یہ ہے کہ خدائی دعوت امتوں کے کانوں تک پہنچ جائے ورنہ ہم جانتے ہیں کہ جس زمانے میں پیغمبر اسلام نے مکہ یا مدینہ میں قیام کیا تھا حجاز کے دوسرے شہروں میں کوئی پیغمبر نہ تھا لیکن رسول اللہ نے اپنے نمائندے ان علاقوں میں بھیجے تھے ان نمائندوں نے رسول اللہ کی آواز ان سب کے کانوں تک پہنچائی علاوہ ازیں خود رسول اللہ نے خطوط لکھے اور مختلف ممالک مثلاً ایران، روم اور حبشہ کی طرف قاصد روانہ کیے اس طرح ان تک پیغامِ الٰہی پہنچایا گیا۔

اس وقت ہم بھی ایک اُمت ہیں ہم نے صدیوں بعد پیغمبر اسلام کی دعوت آپ کا پیغام لانے والے علماء کے ذریعے سُنی ہے۔
ہر اُمت میں رسول بھیجنے کا مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

Marfat.com

۳۸۔ وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ
يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَعْلَمُوْنَ ۙ○

۳۹۔ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِيْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا
اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ○

۴۰۔ اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ
فَيَكُوْنُ ○

ترجمہ

۳۸۔ انھوں نے تاکید سے قسم کھا کر کہا کہ مرجانے والوں کو خدا ہرگز مبعوث نہیں کرے گا۔ جی ہاں! یہ خدا کا قطعی وعدہ ہے (کہ وہ تمام مرنے والوں کو پھر سے زندہ کرے گا) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

۳۹۔ مقصد یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے وہ ان کے سامنے واضح کر دی جائے تاکہ انکار کرنے والے جان لیں کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

۴۰۔ (معاد و قیامت ہمارے لیے مشکل نہیں ہے کیونکہ) ہم جس وقت کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف کہتے ہیں کہ ہوجا، تو وہ فوراً ہوجاتی ہے۔

شانِ نزول

پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں مفسرین نقل کرتے ہیں:

ایک مسلمان نے کسی مشرک سے کچھ لینا تھا جب اس نے مطالبہ کیا تو اس نے قرض ادا کرنے میں لیت و لعل کی یہ مسلمان پریشان ہوا، اس نے دورانِ گفتگو قسم کھائی:

اس چیز کی قسم کہ میں جس کے انتظار میں ہوں ......

(اس کا مقصد قیامت اور حساب خدا تھا)۔

مشرک کہنے لگا:

Marfat.com

"تم سمجھتے ہو کہ ہم موت کے بعد زندہ کیے جائیں گے۔ واللہ وہ کسی مُردہ کو زندہ نہیں کرے گا۔
(اس نے یہ بات اس لیے کہی کیونکہ ان لوگوں کا خیال تھا کہ مردوں کی بازگشت اور حیاتِ نو فضول یا محال بات ہے)۔
اس کی اس بات پر مذکورہ آیت نازل ہوئی اس میں اسے اور اس جیسے افراد کو جواب دیا گیا ہے اور مسئلہ معاد کو واضح دلیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے[1]

تفسیر

معاد اور اختلافات کا خاتمہ

گذشتہ آیات توحید اور رسالتِ انبیاء کے بارے میں تھیں۔ زیرِ بحث آیات میں مباحثِ توحید کے ایک پہلو کا ذکر ہے۔
ارشاد ہوتا ہے: وہ تاکید کے ساتھ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ مرجانے والوں کو خدا ہرگز مبعوث نہیں کرے گا اور انھیں حیاتِ نو عطا نہیں کرے گا (واقسموا باللہ جھد ایمانھم لا یبعث اللہ من یموت)۔
بغیر کسی دلیل کے ان کا یہ انکار اور وہ بھی تاکیدی قسموں کے ساتھ ان کی نادانی اور جہالت کی نشانی ہے لہٰذا ان کے جواب میں قرآن کہتا ہے: یہ خدا کا قطعی وعدہ ہے (کہ وہ تمام مرنے والوں کو حیاتِ نو عطا کرے گا تاکہ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ لیں) لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اور نہ جاننے کی وجہ سے انکار کر دیتے ہیں (بلی وعدا علیہ حقًا و لکن اکثر الناس لا یعلمون)۔
"بلٰی" (جی ہاں) "حقًا" اور اس کے بعد وعدہ کا ذکر، وہ وعدہ کہ جو خدا کی طرف سے ہے۔ معاد کی تاکید اور قطعیت کی دلیل ہیں۔
اصولی طور پر جو شخص کسی حقیقت کا قاطعیت کے ساتھ انکار کرے اس کا جواب بھی قاطعیت کے ساتھ دیا جانا چاہیے تاکہ اس انکار کے بُرے نفسیاتی اثرات اثباتِ قاطع کے ذریعے دُور ہو سکیں اور یہ بات واضح ہو جائے کہ اس کی طرف سے نفی، بے خبری اور نادانی کی وجہ سے ہے۔ اس طرح انکار اپنا اثر بالکل کھو دے گا۔
اس کے بعد معاد و قیامت کا مقصد اور اس پر خدا کی قدرت کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ اس امر کی نشاندہی کی جائے کہ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حیاتِ نو قدرتِ خدا میں نہیں ہے تو یہ ان کا بہت بڑا اشتباہ ہے اور اگر ان کا خیال ہے کہ معاد و قیامت بے مقصد ہے تو یہ بھی ان کی بہت بڑی غلطی ہے۔
فرمایا گیا ہے: خدا مرنے والوں کو مبعوث کرے گا تاکہ جس چیز کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے ان کے سامنے واضح کر دے (لیبین لھم الذی یختلفون فیہ)۔ اور اس لیے کہ وہ جان لیں کہ وہ اس حقیقت کا جھوٹ انکار کرتے تھے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، تفسیر قرطبی اور تفسیر ابوالفتوح رازی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

(ولیعلم الذین کفروا انھم کانوا کٰذبین)۔ کیونکہ وہ جہان تو ایسا ہے کہ جس میں پردے ہٹ جائیں گے، اور حقائق آشکار ہو جائیں گے ۔

جیسا کہ سورہ ق کی آیہ ۲۲ میں ہے ۔

لقد کنت فی غفلۃ من ھٰذا فکشفنا عنک غطائک فبصرک الیوم حدید

انسان سے کہا جائے گا کہ تو اس دن کے بارے میں غفلت میں تھا لیکن ہم نے تیری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹا دیا ہے اور آج تو خوب دیکھتا ہے ۔

سورۂ طارق کی آیہ ۹ میں ہے :

یوم تبلی السرائر

قیامت ایسا دن ہے کہ جب رازہائے پنہاں آشکار ہو جائیں گے ۔

نیز سورۂ ابراہیم کی آیت ۴۸ میں ہے :

وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّارِ ۝

اس روز سب کے سب خدائے واحد و قہار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے ۔

خلاصہ یہ کہ وہ دن شہود، کشف اسرار اور ظہور کا دن ہے ۔ اس روز پنہاں چیزیں آشکار ہو جائیں گی ایسے حالات اور ماحول میں اختلاف عقیدہ کا کوئی معنی نہیں ہے اگرچہ ممکن ہے کہ بعض ہٹ دھرم منکر اپنے آپ کو بچانے کے لیے جھوٹے سہارے لینے کی کوشش کریں لیکن یہ ایک استثنائی اور زود گزر امر ہے یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کسی مجرم کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جائے تو وہ اپنے تمام جرائم کا انکار کر دے لیکن جب فوراً ٹیپ ریکارڈ لگا کر اس کی آواز اسے سنائی جائے اس کے دستخط اسے دکھائے جائیں اور واضح ثبوت اس کے سامنے پیش کیے جائیں اور اسے ساتھ لے جا کر، اس کے جرم کے آثار، موقع و محل دکھایا جائے تو اب جائے کلام باقی نہ رہے گی اور وہ اقرار کرے گا ۔ عالم قیامت میں حقائق کا ظہور اس سے بھی زیادہ واضح اور آشکار ہوگا ۔

موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کے مختلف اہداف و مقاصد ہیں جن کی مختلف مقامات پر آیات قرآنی میں نشاندہی کی گئی ہے مثلاً انسان کا تکامل و ارتقاء، اجرائے عدالت، اس جہان کی زندگی کو با مقصد بنانا، فیض الٰہی کو جاری و ساری رکھنا وغیرہ ۔

زیر بحث آیت ایک اور مقصد کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ ہے اختلافات کو دُور کرنا اور توحید کی طرف لوٹنا ۔

ہم جانتے ہیں کہ بہترین اصل کہ جو سارے عالم پر حکمران ہے وہ اصل توحید ہے ۔ یہ وسیع اور ہمہ گیر اصل خدا کی ذات، صفات اور افعال پر بھی صادق آتی ہے سارے عالم خلقت اور قوانین آفرینش پر بھی یہ اصل حکمران ہے اور ہر چیز کو آخر کار اسی اصل کی طرف پلٹنا چاہیے لہٰذا ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ اختلافات اور نزاعات ایک دن ختم ہو جائیں گے اور ساری دنیا کے لوگ ایک حکومت کے پرچم تلے جمع ہو جائیں گے اور یہ حضرت مہدی علیہ السلام کی حکومت ہوگی کیونکہ عالم ہستی کی رُوح یعنی توحید کے برخلاف جو کچھ بھی ہے اسے آخر کار ایک دن ختم ہونا چاہیے ۔

لیکن ——— عقائد کا یہ اختلاف دنیا سے مکمل طور پر کبھی بھی ختم نہیں ہوگا کیونکہ یہ جہان عالم غطا ہے یہاں بہت کچھ پردے

Marfat.com

میں ہے ۔ البتہ ایک دن آئے گا کہ جب یہ پردے ہٹ جائیں گے اور وہ "یوم ظہور" ہے۔ اس بناء پر معاد کا ایک حدف یہ ہے کہ سب وحدت کی طرف پلٹ آئیں اور تمام اختلافات ختم ہو جائیں ۔ اسی ہدف کی طرف مذکورہ بالا آیت میں اشارہ ہوا ہے قرآن مجید کی بہت سی آیات میں اس مسئلے کی تکرار اور تاکید موجود ہے کہ خداوند عالم روز قیامت لوگوں کے درمیان عدالت کرے گا اور اختلافات ختم ہو جائیں گے۔[1]

دوسرا نکتہ ایک اور حقیقت پر مبنی ہے وہ یہ کہ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کی بازگشت اور نئی زندگی محال ہے تو یہ جان لیں کہ قدرت خدا اس سے برتر اور بالا ہے "جب ہم کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں تو فقط یہ کہتے ہیں کہ "ہو جا" تو وہ فوراً موجود ہوتی ہے" (انما قولنا لشیء اذا اردنٰه ان نقول له کن فیکون)۔

ایسی قدرتِ کاملہ کہ جس میں صرف "ہو جا" کا فرمان ہر چیز کے وجود کے لیے کافی ہو تو پھر اس کے لیے مُردوں کے حیاتِ نو عطا کرنے کی قدرت کے بارے میں تردد و شک کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے ۔

شاید وضاحت کی ضرورت نہ ہو کہ "کُن" (ہو جا) کی تعبیر بھی تنگی بیان کی وجہ سے ہے ورنہ خدا کے لیے "کُن" کی ضرورت نہیں۔ اس کا ارادہ ہی کام کا ہو جانا ہے۔ اس کی ناقص سی مثال اپنی زندگی سے پیش کرنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ ہم ارادہ کرتے ہیں کسی چیز کے تصور کا تو وہ ہمارے ذہن میں ایجاد ہو جاتا ہے ہم اگر کسی عظیم پہاڑ، وسیع سمندر، درختوں سے بھرے بہت بڑے باغ یا ایسی کسی چیز کا تصور کرنا چاہیں تو ہمارے لیے کیا مشکل ہے کیا اس کے لیے ہمیں کسی جملے اور لفظ کی احتیاج ہے ؟ ان موجوداتِ ذہنی کی تصویر تو صرف تصور ہی سے ہمارے صفحۂ ذہن پر ابھر آتی ہے ۔ تو اسی طرح خدا کے "ہو جا" کہے بغیر صرف ارادے سے چیز موجود ہو جاتی ہے ۔

امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے کہ ایک صحابی نے آپ سے عرض کیا کہ خدا کے ارادہ اور مخلوق کے ارادہ کے بارے میں وضاحت فرمائیے تو امامؑ نے فرمایا :

> مخلوق کا ارادہ باطنی ہے اس کے بعد افعال ہیں کہ جو بعد میں آشکار ہوتے ہیں لیکن خدا کا ارادہ ہی اس کی ایجاد ہے نہ کہ اس کا غیر، کیونکہ خدا میں سوچ بچار، تصمیم اور فکر و نظر نہیں ہے (کیونکہ یہ صفات زائد بر ذات ہیں) خدا کے بارے میں ان چیزوں کا کوئی مفہوم نہیں ہے یہ مخلوقات کی صفات ہیں لہٰذا خدا کا ارادہ ہی ایجادِ افعال ہے۔ فقط خدا کہتا ہے : "ہو جا" تو وہ ہو جاتا ہے بغیر کوئی لفظ ادا کیے، اسے زبان سے ادا کرنے، کمر ہمت باندھنے اور غور و فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور خدا کا یہ ارادہ بھی اس کی ذات کی طرح قابلِ توصیف نہیں ہے ۔[2]

---

[1] اس سلسلے میں آل عمران کی آیہ ۵۵، مائدہ کی ۴۸، انعام کی ۱۶۴، نحل کی ۹۲ اور حج کی ۶۹ کی طرف رجوع فرمائیں ۔

[2] اصولِ کافی جلد ۱، باب الارادہ حدیث نمبر ۳ ۔

Marfat.com

۴۱۔ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○

۴۲۔ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ○

ترجمہ

۴۱۔ جن لوگوں پر ظلم ہوا ہے اور پھر انھوں نے خدا کے لیے ہجرت کی ہے ہم اس دنیا میں انھیں اچھا مقام دیں گے اور اگر وہ جانیں تو آخرت کی جزا بہت بڑی ہے۔

۴۲۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جنھوں نے صبر و استقامت کو اختیار کیا ہے اور وہ صرف اپنے پروردگار پر توکّل کرتے ہیں۔

شانِ نزول

ان آیات کی شانِ نزول میں بعض مفسّرین نے نقل کیا ہے کہ مکّہ میں اسلام لانے کے بعد بعض مسلمانوں مثلاً بلال، عمار یاسر صہیب اور خباب پر سخت تشدّد کیا گیا اسلام کی تقویت اور دوسروں تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے پیغمبر اکرمؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی یہ ہجرت آپ کی اور دوسروں کی کامیابی کا باعث بنی۔ صہیب سن رسیدہ شخص تھے انھوں نے مشرکین مکّہ سے کہا کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں میں اگر تمھارے پاس رہوں تو تمھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا اور اگر میں تمھارا مخالف رہوں تو تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتا تم ایسا کرو کہ میرا مال لے لو اور مجھے مدینہ جانے دو۔ اس پر وہ لوگ راضی ہوگئے۔ صہیب نے انھیں اپنا تمام مال و اسباب دے دیا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہجرت کی۔ اس پر بعض لوگوں نے صہیب سے کہا کہ تو نے نفع کا سودا کیا ہے اس پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں جن میں اس جہان میں، دوسرے جہان میں ان کی اور ان جیسے لوگوں کی کامیابی کا تذکرہ ہے۔

تاریخ میں ہے کہ خلفاء کے زمانے میں جب بیت المال کے اموال تقسیم ہوتے تھے تو مہاجرین کی باری آتی تھی تو انھیں کہا جاتا تھا کہ اپنا حصّہ لے لو یہ وہی ہے کہ جو خدا نے تمھیں دنیا میں دینے کا وعدہ کیا ہے اور جو کچھ دوسرے جہان میں تمھارے انتظار میں ہے وہ بہت زیادہ ہے اس کے بعد وہ مذکورہ بالا آیت تلاوت کرتے تھے[1]

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

تفسیر

مہاجرین کی جزا

ہم نے بارہا کہا ہے کہ قرآن اپنے تربیتی امور میں جس مؤثر ترین روش سے استفادہ کرتا ہے وہ ہے موازنہ اور تقابل۔ قرآن ہر چیز کو اس کے متضاد کے سامنے لے آتا ہے تاکہ ہر ایک کا مقام واضح اور متعین ہو جائے۔ گزشتہ آیات میں منکرین قیامت اور ہٹ دھرم مشرکین کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات سچے اور پاکباز مہاجرین کی بات کرتی ہیں تاکہ موازنہ اور تقابل سے دونوں کی کیفیت واضح ہو جائے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جن لوگوں نے ستم اٹھائے اور پھر راہِ خدا میں ہجرت کی ہم اس دنیا میں انھیں اچھی جگہ اور مقام دیں گے (والذین ھاجروا فی اللہ من بعد ما ظلموا لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ)۔

یہ ان کی دنیاوی جزاء ہے، رہی اُخروی جزا، اگر وہ جانیں تو وہ بہت ہی بڑی ہے (و لاجر الاٰخرۃ اکبر لو کانوا یعلمون)۔

بعد والی آیت میں ان سچے با استقامت اہلِ ایمان مہاجرین کی توصیف میں ان کے دو اوصاف بیان کیے گئے ہیں فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جنھوں نے صبر و استقامت کا دامن تھاما اور جو اللہ پر توکل رکھتے ہیں (الذین صبروا وعلی ربھم یتوکلون)۔

چند اہم نکات

۱۔ ہجرت اور مہاجرین: آغازِ اسلام میں مسلمانوں نے دو ہجرتیں کیں۔ پہلی ہجرت نسبتاً مختصر تھی اس میں چند مسلمانوں نے حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کی سربراہی میں حبشہ کی طرف ہجرت کی۔ دوسری ہجرت ہمہ گیر تھی۔ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمام مسلمانوں نے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ زیرِ نظر آیات دوسری ہجرت سے متعلق ہیں۔ ان آیات کی شانِ نزول بھی اس امر کی تائید کرتی ہے۔

گذشتہ زمانے میں اور دورِ حاضر میں مسلمانوں کے لیے ہجرت کی دائمی اہمیت کے متعلق ہم سورۂ نساء کی آیہ ۱۰۰ اور سورۂ انفال کی آیہ ۵، کے ذیل میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں[1]

بہرحال مہاجرین کا مقام اسلام میں بہت بلند ہے۔ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بعد کے مسلمان سب ان کا خاص احترام کرتے تھے کیونکہ انھوں نے دعوتِ اسلام کی توسیع کی خاطر اپنے تمام سرمایہ حیات کو ٹھوکر مار دی۔ بعض نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۴ ص ۸۵ (اردو ترجمہ) اور جلد ۷ ص ۲۰۳ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

صہیبؓ جیسے بعض افراد نے اپنے سارے مال و متاع سے منہ پھیر لیا

ان دنوں میں اگر ان مہاجرین کا ایثار نہ ہوتا تو مکہ کا تنگ ماحول اور اس میں موجود شیطانی عناصر ہرگز اجازت نہ دیتے کہ اسلام کی آواز کسی کے کانوں تک پہنچے وہ یہ آواز ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے حلقوم میں دبا دیتے لیکن یہ مہاجرین تھے کہ جن کی اس سوچی سمجھی تحریک اور انقلاب کے ذریعے نہ صرف مکہ ان کے زیر تسلط آگیا بلکہ اسلام کی آواز پوری دنیا کے کانوں تک پہنچ گئی ان کا یہ طرزِ عمل بعد کے مسلمانوں کے لیے اس قسم کے حالات میں ایک دائمی سُنت کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ **"هاجروا فی الله" کا مفہوم:** اس تعبیر میں لفظ "سبیل" تک ذکر نہیں ہوا۔ یہ دراصل ان مہاجرین کے انتہائی خلوص کی طرف اشارہ ہے جنھوں نے صرف خدا کی راہ میں، اس کی رضا کی خاطر اور اس کے دین کی حفاظت کے لیے اس قسم کی ہجرت کی، نہ کہ اپنی جان بچانے کے لیے یا کسی دوسرے مادی مفاد کے لیے۔

۳۔ **"من بعد ما ظلموا" کا مطلب:** یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ میدان فوراً خالی نہیں کر دینا چاہیے بلکہ جب تک ممکن ہو قیام کرنا چاہیے اور مشکلات کو برداشت کرنا چاہیے۔ البتہ جس وقت دشمن کے آزار اور مظالم برداشت کرنے کا نتیجہ اس کی جسارت میں اضافہ ہو اور مومنین کی کمزوری کے سوا کچھ نہ ہو اس وقت ہجرت کرنا چاہیے تاکہ زیادہ طاقت جمع کرنے اور زیادہ مضبوط مورچے قائم کرنے کا موقع مل سکے اور ہمہ گیر جہاد کے لیے بہتر جگہ میسر آسکے اور اہلِ حق کو فوجی، ثقافتی اور تبلیغاتی محاذ پر کامیابی حاصل ہو سکے۔

۴۔ **"لنبوئنهم فی الدنیا حسنة" کا مفہوم:** یہ جملہ "بوأت له مكانا" (وہ مکان کہ جو میں نے اس کے لیے تیار کیا اور اسے اس میں جگہ دی) کے مادہ سے لیا گیا ہے۔ یہ جملہ نشاندہی کرتا ہے کہ حقیقی مہاجرین اگرچہ ابتداء میں اپنے مادی وسائل کھو بیٹھے تھے لیکن آخر کار انھیں مادی زندگی کے لحاظ سے بھی کامیابی حاصل ہوئی[1]

انسان آخر دشمن کی ضربوں میں رہ کر ذلت کے ساتھ کیوں مرجائے؟ وہ شجاعت و جرارت کے ساتھ ہجرت کیوں نہ کر جائے اور کیوں نہ نئی جگہ سے مقابلے کی تیاری کرے تاکہ اپنا حق لے سکے۔

سورۂ نساء کی آیہ ۱۰۰ میں یہی مسئلہ زیادہ صراحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

ومن یهاجر فی سبیل الله یجد فی الارض مراغمًا کثیرًا وسعة

جو لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں انھیں دنیا میں امن کی بہت وسیع جگہ ملے گی کہ جہاں رہ کر وہ دشمن کو رسوا کر سکتے ہیں۔

۵۔ **مہاجرین کی صفات:** مہاجرین کی دو صفات بیان کی گئی ہیں صبر اور توکل۔ ان کی ان صفات کو بیان کرنے کا مقصد واضح ہے کیونکہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے ایسے روح فرسا حوادث میں سب سے پہلے صبر و استقامت ضروری ہے جتنی مصیبت

---

[1] "لنبوئنهم" اصل میں "بواء" کے مادہ سے جگہ کے اجزاء مساوی ہونے کے معنی میں ہے۔ اس کے برعکس "نبوه" (بروزن "تبدہ") جگہ کے اجزاء مساوی نہ ہونے کے معنی میں ہے۔ لہذا "بوأت له مكانا" کا معنی ہے: میں نے اس کے لیے جگہ صاف کی لہذا یہ کسی کے لیے کوئی جگہ تیار کرنے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

زیادہ ہوگی، اتنی ہی استقامت زیادہ درکار ہوگی پھر اللہ پر توکل اور اعتماد بھی ضروری ہے اصولی طور پر ایسی مشکلات میں اگر انسان کا کوئی مستحکم اور قابلِ اطمینان سہارا نہ ہو تو اس کے لیے صبر و استقامت ممکن نہیں ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ صبر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس راہ میں پہلے پہل خواہشاتِ نفسانی کے مقابلے میں صبر و استقامت ضروری ہے اور توکل کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس راستے کا آخر یہ ہے کہ انسان اللہ کے سوا ہر کسی سے کٹ جائے اور اس سے پیوستہ ہو جائے لہٰذا پہلی صفت آغاز سفر ہے اور دوسری اختتام سفر[1]

بہرحال بیرونی ہجرت اندرونی ہجرت کے بغیر ممکن نہیں ہے انسان کو چاہیے کہ پہلے وہ اندرونی مادی برائیوں کو چھوڑ کر اخلاقی فضائل کی طرف ہجرت کرے تاکہ وہ بیرونی طور پر اس قسم کی ہجرت کر سکے اور دارالکفر کی ہر چیز کو ٹھوکر مار کر دارالایمان کی طرف منتقل ہو سکے۔

---

[1] تفسیر کبیر، فخرالدین رازی، زیر بحث آیت کے ذیل میں

Marfat.com

۴۳۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـئَلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۙ

۴۴۔ بِالۡبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ‌ؕ وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ

ترجمہ

۴۳۔ ہم نے تجھ سے پہلے بھی ایسے مرد کہ جن پر وحی نازل کی، کے سوا کسی کو نہیں بھیجا، اگر تم نہیں جانتے تو باخبر لوگوں سے پوچھ لو۔

۴۴۔ (اور وہ لوگ جو) واضح دلائل اور (گزشتہ انبیاء کی) کُتب سے (آگاہ ہیں) اور ہم نے اس ذکر (قرآن) کو تجھ پر نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کی طرف جو کچھ ہم نے بھیجا ہے وہ ان سے بیان کرو شاید وہ غور و فکر کریں۔

تفسیر

نہیں جانتے تو پوچھ لو

گزشتہ دو آیتیں حقیقی مہاجرین کے بارے میں تھیں البتہ زیر بحث آیات کے بارے میں دوبارہ اصولِ دین سے متعلق گزشتہ مسائل کا ذکر ہے ان میں مشرکین کے ایک مشہور اعتراض کا جواب دیا گیا ہے۔

وہ کہتے تھے کہ خدا نے تبلیغ رسالت کے لیے کوئی فرشتہ کیوں نہیں بھیج دیا (یا وہ کہتے تھے کہ پیغمبرؐ کے پاس کوئی ایسی غیر معمولی قوت کیوں نہیں ہے جس کے ذریعے وہ ہمیں یہ کام ترک کرنے پر مجبور کر دے کہ جو ہم انجام دیتے ہیں) ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ہم نے تجھ سے پہلے بھی رسول بھیجے ہیں اور وہ بھی بس ایسے ہی مرد تھے کہ جن پر وحی نازل ہوتی تھی (وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم)۔

جی ہاں! یہ مرد نوعِ بشر میں سے تھے ان میں تمام تر انسانی جذبات و احساسات موجود تھے یہ لوگوں کی مشکلات اور مصائب کو سب سے زیادہ سمجھتے تھے۔ ان کی ضروریات کو جانتے تھے جبکہ کوئی فرشتہ ان اُمور سے اچھی طرح آگاہ نہیں ہو سکتا۔ انسان کے اندر جو گذرتی ہے فرشتہ اُسے نہیں سمجھ پاتا۔

مُسلّم ہے کہ صاحبانِ وحی کی اس کے سوا کوئی ذمہ داری نہ تھی کہ وہ ابلاغِ رسالت کریں۔ ان کا کام تھا کہ وہ پیامِ وحی حاصل کریں

Marfat.com

اسے انسانوں تک پہنچائیں اور معمول کے ذرائع کے ساتھ مقاصدِ وحی کے حصول کی جد و جہد کریں۔ ان کا یہ کام نہ تھا کہ کسی غیر معمولی خدائی طاقت کے ذریعے تمام طبعی قوانین کو توڑتے ہوئے لوگوں کو قبولیت کی دعوت دیں اور انھیں تمام انحرافات ترک کرنے پر مجبور کریں کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو پھر کسی کا ایمان لانا کوئی افتخار کی بات نہ ہوتی اور نہ ہی ایسا ایمان ترقی و کمال کا ذریعہ ہوتا۔

اس حقیقت پر تاکید اور اس کی تائید کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: اگر اس بات کا تھیں علم نہیں تو جاؤ باخبر لوگوں سے پوچھو (فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لاتعلمون)۔

"ذکر" آگاہی اور اطلاع کے معنی میں ہے اور "اهل الذکر" کا ایک وسیع مفہوم ہے۔ مختلف سطح پر اس کے مفہوم میں تمام آگاہ اور باخبر لوگ شامل ہیں۔

بہت سے مفسرین نے "اهل الذکر" سے اہلِ کتاب کے عُلماء مراد لیے ہیں۔ البتہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "اهل الذکر" کا مفہوم اسی میں محدود سمجھ لیا جائے بلکہ یہ درحقیقت اس کے کُلّی مفہوم کا ایک مِصداق ہے کیونکہ اس بارے میں سوال قاعدتاً اہلِ کتاب کے اور یہود و نصاریٰ کے عُلماء سے کیا جانا چاہیے کہ گذشتہ انبیاء و مرسلین نوعِ بشر میں سے تھے اور مرد تھے کہ جو خدائی احکام کی تبلیغ اور اجراء کے لیے مامور ہوئے تھے۔

یہ ٹھیک ہے کہ اہلِ کتاب ہر لحاظ سے مشرکین کے ہم آہنگ نہ تھے لیکن اسلام کی مخالفت میں وہ ان سے ہم آہنگ تھے لہٰذا گذشتہ انبیاء کے حالات بیان کرنے کے لیے اہلِ کتاب کے علماء بہتر ذریعہ تھے۔

مفردات میں راغب نے کہا ہے کہ "ذکر" کے دو معانی ہیں یہ لفظ کبھی "حفظ" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی "یادآوری" کے معنی میں۔ البتہ ممکن ہے یادآوری دل ہی سے ہو (دل سے یاد کرنا دراصل باطنی ذکر شمار ہوتا ہے) یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کو ذکر کہا جاتا ہے یہ اس بناء پر ہے کہ قرآن حقائق کو واضح کرتا ہے۔

اگلی آیت میں ہے: اگر تم انبیاء اور ان کی کُتب کے واضح دلائل سے آگاہ نہیں ہو تو آگاہ اور باخبر لوگوں کی طرف رجوع کرو (بالبینٰت و الزبر) [۱]

"بیّنات" "بینة" کی جمع ہے اس کا معنی ہے "واضح دلائل"۔ ہوسکتا ہے یہاں یہ انبیاء کے معجزات اور ان کی حقانیت کے دیگر دلائل کی طرف اشارہ ہو۔

"زبر" "زبور" کی جمع ہے اس کا معنی ہے "کتاب"۔

---

[۱] "بالبینٰت والزبر" ترکیب کے لحاظ سے کس فعل سے متعلق ہے اس سلسلے میں مفسرین نے کئی ایک احتمالات ذکر کیے ہیں بعض نے اسے "لاتعلمون" سے متعلق سمجھا ہے (جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے اور ظاہری مفہوم سے یہی بات مطابقت رکھتی ہے)

توجہ رہے کہ علم باء کے بغیر اور باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے پہلے "ارسلنا" مقدر ہے اور اصل میں یوں تھا۔

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

درحقیقت "بینات" کا مفہوم ہے اثباتِ نبوت کے دلائل اور "زبر" ان کتب کی طرف اشارہ ہے جن میں انبیاء کی تعلیمات جمع تھیں۔

اس کے بعد قرآن روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے یہ ذکر (قرآن) تجھ پر نازل کیا تاکہ لوگوں کے لیے جو کچھ نازل ہوا ہے تو ان سے بیان کرے (وانزلنا الیك الذكر لتبين للناس ما نزل اليهم)۔
تاکہ وہ ان آیات پر غور و فکر کریں اور ان کے حوالے سے جو ذمہ داریاں ان پر عائد ہوتی ہیں ان کی طرف متوجہ ہوں (ولعلهم يتفكرون)۔

درحقیقت تیری دعوت اور رسالت کا پروگرام اصولی طور پر کوئی نئی چیز نہیں۔ گزشتہ رسولوں پر بھی ہم نے آسمانی کتابیں نازل کی ہیں تاکہ وہ لوگوں کو ان ذمہ داریوں سے آگاہ کریں کہ جو خدا، مخلوق اور خود اپنی ذات کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں ہم نے تجھ پر قرآن نازل کیا ہے تاکہ تو اس کے مفاہیم اور تعلیمات کو بیان کرے اور انسانوں کی فکر کو بیدار کرے تاکہ وہ مسئولیت اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ قدم اٹھائیں اور رشد و کمال کی طرف آگے بڑھیں (نہ کہ جبری طریقے سے اور خدا کی خلافِ معمول جبری طاقت سے)۔

ایک اہم نکتہ

اہلِ ذکر کون ہیں؟ اہلِ بیت علیہم السلام کے ذرائع سے مروی متعدد روایات میں ہے کہ اہلِ ذکر آئمہ اہلِ بیت ہیں۔
ان میں سے ایک روایت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے مروی ہے۔ اس آیت کے بارے میں آپ سے پوچھا گیا تو فرمایا:

نحن اهل الذكر ونحن المسئولون

ہم ہیں اہلِ ذکر اور ہم سے سوال کیا جانا چاہیے [1]

ایک اور روایت میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں فرمایا:

الذكر القرآن، وآل الرسول اهل الذكر وهم المسئولون

ذکر قرآن ہے اور آلِ رسولؐ اہلِ ذکر ہیں اور انھیں سے سوال کیا جانا چاہیے۔ [2]

بعض روایات میں ہے کہ ذکر خود رسول اللہؐ ہیں اور ان کے اہلِ بیت اہل الذکر ہیں [3]

اس مضمون کی اور بھی کئی ایک روایات ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر) ارسلناهم بالبينات والزبر

بعض نے کہا ہے کہ اس کا متعلق "وما ارسلنا" قبل کی آیت میں ہے۔

بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ "نوحی الیهم" سے متعلق ہے۔

واضح ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے مطابق آیت کا ایک خاص مفہوم ہوگا لیکن مجموعی طور پر کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

[1]، [2]، [3] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۵ تا ۵۶ سے۔

Marfat.com

اہل سنت کی تفاسیر اور کتب میں بھی اسی مضمون کی بہت سی روایات ہیں ان میں سے ایک روایت ابنِ عباس سے مروی ہے جسے اہل سنت کی مشہور بارہ تفاسیر میں زیر بحث آیت کی تفسیر کے ضمن میں نقل کیا گیا ہے۔ ابن عباس کہتے ہیں:

هو محمد وعلی و فاطمه والحسن والحسین هم اهل الذکر والعقل و البیان

محمدؐ، علی، فاطمہ، حسن اور حسین ہی اہل ذکر، اہلِ عقل اور اہلِ بیان ہیں[1]

آیاتِ قرآن کی تفسیر میں معین مصادیق پر مبنی روایات سے یہ ہمارا پہلا سابقہ نہیں ہے ایسا مصداق آیت کے وسیع مفہوم کو کبھی محدود نہیں کرتا۔

اسی طرح یہاں بھی جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ذکر ہر قسم کی آگاہی، یاد آوری اور اطلاع کے معنی میں ہے اور اہلِ ذکر کے مفہوم میں ہر سطح کے آگاہ اور باخبر افراد شامل ہیں لیکن قرآن مجید چونکہ یاد آوری، علم اور آگہی کا زیادہ واضح نمونہ ہے لہٰذا اس پر "ذکر" کا اطلاق

---

[1] احقاق الحق جلد ۳ ص ۴۸۲۔

بارہ تفاسیر سے مندرجہ ذیل تفاسیر مراد ہیں:

۱۔ تفسیر ابو یوسف

۲۔ تفسیر ابن جحر

۳۔ تفسیر مقاتل بن سلیمان

۴۔ تفسیر وکیع بن جراح

۵۔ تفسیر یوسف بن موسیٰ

۶۔ تفسیر قتادہ

۷۔ تفسیر حرب الطائی

۸۔ تفسیر سدی

۹۔ تفسیر مجاہد

۱۰۔ تفسیر مقاتل بن حیان

۱۱۔ تفسیر ابو صالح اور

۱۲ تفسیر محمد بن موسیٰ الشیرازی

اسی آیت کی تفسیر میں جابر جعفی کی ایک حدیث ثعلبی کی کتاب میں مرقوم ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

لما نزلت هذه الآیة قال علی (ع) نحن اهل الذکر

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی حضرت علیؑ نے فرمایا: "ہم اہلِ ذکر ہیں"

(مذکورہ بالا مدرک کی طرف رجوع کریں)

Marfat.com

ہوا ہے۔ اسی طرح رسول اللہ کی ذات بھی اس کا واضح مصداق ہے اسی طرح آئمہ معصومین کہ جو آنحضرتؐ کے اہل بیت اور آپ کے علم کے وارث ہیں وہ "اہل الذکر" کا واضح ترین مصداق ہیں۔

اس سارے مسئلے کو قبول کرلیا جائے تو یہ آیت کے عمومی مفہوم کے منافی نہیں اور نہ ہی اس بات کے منافی ہے کہ اہل کتاب کے علماء کے بارے میں نازل ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے علماءِ اصول اور فقہاء نے اس سے اجتہاد اور تقلید کی بحث میں استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ دینی مسائل میں ناآگاہ افراد کو آگاہ افراد اور مجتہدین کی پیروی اور تقلید کرنا چاہیے۔

اس موقع پر ایک روایت کے حوالے سے ایک سوال اُبھرتا ہے۔ روایت عیون الاخبار میں امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام سے مروی ہے روایت کے مطابق جو لوگ اس آیت کی تفسیر میں کہتے تھے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کروان پر آپ نے اعتراض کیا اور فرمایا:

سبحان اللہ! کیسے ممکن ہے کہ ہم علماءِ یہود و نصاریٰ کی طرف رجوع کریں کیونکہ اس طرح تو یقیناً وہ ہمیں اپنے مذہب کی طرف دعوت دیں گے۔

پھر فرمایا:

اہلِ ذکر ہم ہیں [1]

اس سوال کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ امام نے یہ بات ان لوگوں سے کہی ہے جو آیت سے یہ مراد سمجھتے ہیں کہ ہر دور میں صرف علماءِ اہلِ کتاب کی طرف رجوع کیا جائے حالانکہ یہ بات ہر زمانے کے لیے نہیں ہے۔ مثلاً امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کے زمانے میں لوگوں کی ہرگز یہ ذمہ داری نہ تھی کہ وہ حقائق جاننے کے لیے یہودی اور عیسائی علماء کے پاس جائیں ایسے زمانے میں علماءِ اسلام مرجع ہیں اور علماءِ اسلام کے سید و سردار آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام ہیں۔

دوسرے لفظوں میں پیغمبر اکرمؐ کے زمانے کے مشرکین کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس مسئلے سے آگاہی کے لیے کہ اللہ کے نبی نوعِ بشر میں سے تھے، علماءِ اہلِ کتاب کی طرف رجوع کریں لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ ہر زمانے میں تمام لوگ انہی کی طرف رجوع کریں بلکہ چاہیے کہ ہر زمانے میں ہر مسئلہ اس مسئلے سے آگاہ افراد سے پوچھا جائے اور یہ ایک بدیہی بات ہے۔

بہرحال زیرِ بحث آیت میں ایک بنیادی اسلامی اصول بیان کیا گیا ہے یہ آیت مادی و روحانی تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور تمام مسلمانوں کو تاکید کرتی ہے کہ جو چیز وہ نہیں جانتے اس کے بارے میں آگاہ افراد سے پوچھیں اور جن مسائل سے جو لوگ آگاہ نہیں ہیں وہ ان میں دخل اندازی نہ کریں۔ اس طرح سے قرآن نے نہ صرف اسلامی دینی مسائل میں "تخصص" (SPECIALIZA-TION) کی ضرورت کو باقاعدہ قانونی طور پر تسلیم کیا ہے بلکہ تمام شعبوں، تمام مواقع اور تمام علاقوں میں اس کے لیے تاکید کی ہے اس بناء پر تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ ہر زمانے میں ہر شعبے اور ہر موضوع پر ان کے پاس آگاہ اور ماہر افراد موجود ہوں۔ تاکہ نہ جاننے والے ان کی طرف رجوع کریں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۰۔

Marfat.com

اس نکتے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ ہمیں ایسے متخصصین اور ماہرین کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کی صداقت، بے غرضی اور دوستی ثابت ہو۔ کیا ہم کبھی کسی ایسے ماہر ڈاکٹر کی طرف رجوع کریں گے خود جس کے کام سے ہم مطمئن نہ ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ تقلید اور مرجعیت کی بحث میں اجتہاد یا اعلمیت کے ساتھ عدالت کو بھی شرط قرار دیا جاتا ہے ——— یعنی مرجع تقلید اسلامی مسائل کا عالم و آگاہ بھی ہو، صاحبِ تقوٰی بھی ہو۔

Marfat.com

۴۵۔ اَفَاَمِنَ الَّذِیۡنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنۡ یَّخۡسِفَ اللّٰہُ بِہِمُ الۡاَرۡضَ اَوۡ یَاۡتِیَہُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ حَیۡثُ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ۙ﴿۴۵﴾
۴۶۔ اَوۡ یَاۡخُذَہُمۡ فِیۡ تَقَلُّبِہِمۡ فَمَا ہُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿ۙ۴۶﴾
۴۷۔ اَوۡ یَاۡخُذَہُمۡ عَلٰی تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۴۷﴾

ترجمہ

۴۵۔ کیا سازش کرنے والے اللہ کے اس دردناک عذاب سے مامون ہو گئے ہیں کہ جو ممکن ہے۔ خدا ان کو زمین میں دھنسا دے یا (اس کی) سزا ایسی جگہ سے ان کے پاس آپہنچے کہ جہاں سے انھیں توقع نہیں ہے۔

۴۶۔ یا جس وقت (زیادہ مال و دولت سمیٹنے کے لیے) وہ دوڑ دھوپ کر رہے ہوں ان کا دامن آپکڑے، جبکہ وہ کہیں فرار بھی نہ کرسکیں۔

۴۷۔ یا انھیں تدریجی طور پر خوف انگیز تنبیہات کے ساتھ اپنی گرفت میں لے کیونکہ پروردگار رؤف اور رحیم ہے۔

تفسیر

مختلف گناہوں کی مختلف سزائیں:

بہت سے مباحث میں قرآن استدلالی مطالب، جذباتی پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس طرح سے پیش کرتا ہے کہ وہ سامعین کے دلوں کے لیے بہت زیادہ اثر انگیز ہو جاتے ہیں۔ زیر نظر آیات قرآن کی اسی روش کا ایک نمونہ ہیں۔

گذشتہ آیات میں نبوت و معاد کے مسئلے پر مشرکین سے ایک بحث تھی لیکن زیر بحث آیات میں جابر، مستکبر اور ہٹ دھرم گنہ گاروں کو تہدید کی گئی ہے اور انھیں مختلف طرح کے عذاب الٰہی سے ڈرایا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: نورِ حق کو بجھا دینے کے لیے طرح طرح کی منحوس سازشیں کرنے والے یہ لوگ کیا عذاب الٰہی سے مامون ہو گئے ہیں حالانکہ ہر آن ممکن ہے خدا انھیں زمین میں دھنسا دے (افامن الذین مکروا السیئات ان یخسف اللہ بھم الارض)۔

کیا یہ بعید ہے کہ زمین پر ایک دہشت ناک زلزلہ آجائے، سطح زمین پھٹ جائے اور اس میں وہ تمام تر ساز و سامانِ حیات کے ساتھ دھنس جائیں اور اقوام عالم کی تاریخ میں ایسا بارہا ہوا ہے۔

Marfat.com

"مکروا السیئات" گھٹیا مقاصد اور غلط اہداف تک پہنچنے کے لیے سازشیں کرنے اور منصوبے بنانے کے معنی میں ہے جیسا کہ مشرکین نورِ قرآن کو خاموش کرنے، پیغمبر اسلام کو ختم کرنے اور مومنین کو اذیت دینے کے لیے سازشیں کرتے تھے۔

"یخسف" "خسف" (بروزن "وصف") کے مادہ سے پنہاں ہونے اور مخفی ہونے کے معنی میں ہے اسی لیے چاند کی روشنی جب زمین کے سایے میں چھپ جائے تو اسے "خسوف" کہتے ہیں۔ نیز "مخسوف" اس کنوئیں کو کہتے ہیں جس میں پانی چھپ جائے اسی طرح انسان اور مکان زلزلے وغیرہ سے پیدا ہونے والے زمین کے شگاف میں چھپ جائیں تو اسے "خسف" کہتے ہیں۔

اس کے بعد قرآن مزید کہتا ہے: یا جب وہ غفلت میں ہوں عذابِ الٰہی ایسی جگہ سے آپہنچے جہاں سے انھیں توقع ہی نہ ہو (او یأتیهم العذاب من حیث لا یشعرون)۔

یا جس وقت وہ زیادہ مال جمع کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہے ہوں انھیں عذاب دامنگیر ہو جائے (او یأخذهم فی تقلبهم) جبکہ وہ کہیں بھاگ بھی نہ سکیں (فما هم بمعجزین)۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں "معجزین" "اعجاز" کے مادہ سے ناتواں اور عاجز کرنے کے معنی میں ہے۔ ایسے مواقع پر یہ عذاب کے چنگل سے فرار کرنے کے معنی میں ہے۔

یا یہ کہ عذابِ الٰہی اچانک ان تک نہ پہنچے بلکہ تدریجی طور پر پے درپے تنبیہوں کے بعد انھیں اپنی گرفت میں لے (او یأخذهم علی تخوف)۔

آج ان کا ہمسایہ کسی سانحے کا شکار ہوا، کل ان کے کسی باغ کو نقصان پہنچا اگلے روز ان کے کچھ اور اموال ضائع ہو گئے ——— خلاصہ یہ کہ یکے بعد دیگرے انھیں تنبیہیں کی گئیں وہ بیدار ہو گئے تو کیا خوب ورنہ آخری اور اصلی عذاب انھیں اپنی گرفت میں لے لے گا۔

کسی گروہ کے لیے ایسے مواقع پر عذاب اور سزا تدریجی اس لیے ہے کہ ابھی اس میں احتمالِ ہدایت موجود ہے اور خدا کی رحمت اجازت نہیں دیتی کہ اس کے ساتھ دوسروں کا سا سلوک کیا جائے کیونکہ تمھارا پروردگار رؤف و رحیم ہے (فان ربکم لرءوف رحیم)۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیات میں چار قسم کی سزاؤں کا تذکرہ ہے:

پہلی "خسف" اور زمین میں دھنس جانا۔

دوسری بے خبری میں ایسی جگہ سے عذاب آنا کہ جہاں سے توقع نہ ہو۔

تیسری اس وقت عذاب آپہنچنا جب انسان مال و دولت جمع کرنے کی دُھن میں مگن ہو۔

چوتھی تدریجی سزا اور تدریجی عذاب۔

مسلّم ہے کہ چار قسم کی ان سزاؤں میں سے ہر ایک کسی خاص قسم کے گناہ سے مناسبت رکھتی ہے اگرچہ یہ سب گناہگار "الذین مکروا السیئات" (ایسے لوگ جو گھٹیا سازشیں کرتے اور غلط منصوبے بناتے ہیں) کا مصداق ہیں۔ مختلف گناہوں پر یہ مختلف سزائیں اس لیے ہیں کہ خدا کے تمام کام حکمت کے مطابق اور استحقاق کی مناسبت سے ہوتے ہیں۔

Marfat.com

جہاں تک ہماری نظر ہے، اس سلسلے میں مفسرین نے کوئی بات نہیں کہی لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ:

پہلا عذاب سازشیوں کے اس گروہ کے لیے مخصوص ہے جو خطرناک، جابر اور مستکبر ہیں جیسے قارون۔ خدا ان لوگوں کو اقتدار اور طاقت کی ایسی بلندی سے نیچے کھینچتا ہے اور انھیں زمین کی گہرائیوں میں اس طرح سے دھنسا دیتا ہے کہ وہ سب کے لیے باعثِ عبرت بن جاتے ہیں۔

دوسرا عذاب ایسے سازشیوں کے لیے مخصوص ہے کہ جو عیش و نوش میں سرمست ہوں اور جو سرکش ہوا و ہوس میں غرق ہوں عذابِ الٰہی اچانک ایسی جگہ سے انھیں آپکڑتا ہے کہ جہاں سے انھیں توقع تک نہیں ہوتی۔

تیسرا عذاب دنیا پرست زراندوز لوگوں کے لیے مخصوص ہے ایسے لوگ کہ جو شب و روز اس کوشش میں ہیں کہ جیسے بھی ممکن ہو اور جس جرم اور ظلم سے ہو سکے اپنی دولت میں اضافہ کریں یہ لوگ مال و دولت جمع کرنے میں لگے ہوتے ہیں کہ عذابِ الٰہی انھیں آجکڑتا ہے۔[1]

چوتھا عذاب ایسے لوگوں کے لیے ہے جو طغیان و سرکشی اور سازش و گناہ میں اس حد تک جا پہنچے ہیں کہ اب ان کے لوٹ آنے کی اور کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس مقام پر تخوف تنبیہ و تہدید کے ذریعے اللہ تعالیٰ انھیں بیدار کرتا ہے، وہ بیدار ہو جائیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو بہتر ورنہ انھیں دہن عذاب میں ڈال دیتا ہے۔

خدا کی رأفت و رحمت کا ذکر ایک علت کے طور پر چوتھے گروہ سے مربُوط ہے یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ابھی خدا سے اپنے تمام رشتے منقطع نہیں کیے اور اپنی واپسی کے تمام راستے ابھی تباہ نہیں کیے۔

---

[1] لغت عرب میں "تقلب" اگرچہ ہر قسم کی آمدورفت کے معنی میں ہے لیکن جیسا کہ بہت سے مفسرین نے کہا ہے اور بعض اسلامی روایات میں بھی تاکید کی گئی ہے ایسے مواقع پر تجارت اور کسبِ مال کے لیے آمدورفت کے معنی میں ہے (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

۴۸۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ○

۴۹۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○

۵۰۔ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ○

ترجمہ

۴۸۔ کیا انھوں نے مخلوق کے خدا کو نہیں دیکھا کہ ان کے سائے کس طرح دائیں بائیں سے حرکت کرتے ہیں اور وہ خضوع وخشوع سے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں۔

۴۹۔ (نہ صرف ان مخلوقات کے سائے بلکہ) آسمانوں اور زمین میں چلنے والے تمام اور ملائکہ خدا کے حضور سجدہ کرتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی تکبر نہیں ہے۔

۵۰۔ وہ اپنے پروردگار (کی نافرمانی) سے ڈرتے ہیں کہ جو اُن کا حاکم ہے اور جس چیز پر وہ مامور ہیں اسے انجام دیتے ہیں۔

تفسیر

سائے تک اللہ کے حضور سجدہ ریز ہیں

ان آیات میں دوبارہ بحث توحید کی طرف لوٹ آئی ہے۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: کیا وہ (سازشی مشرک) مخلوقِ خدا کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح ان کے سائے ان کے دائیں بائیں حرکت کرتے ہیں اور بڑے خشوع وخضوع سے اللہ کو سجدہ کرتے ہیں (اولم یروا الی ما خلق اللہ من شیءٍ یتفیؤا ظلٰلہ عن الیمین والشمائل سجدًا للہ وھم داخرون)[۱]۔

"یتفیؤا" "فییٔ" کے مادہ سے لوٹ آنے اور رجوع کے معنی میں ہے۔

---

[۱] "داخرون" اصل میں "دخور" کے مادہ سے انکساری اور اپنے آپ کو چھوٹا ظاہر کرنے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

بعض کہتے ہیں کہ عرب چیزوں کے صبح کے سائے کو "ظل" کہتے ہیں اور عصر کے سائے کو "فیئ" کہتے ہیں اور یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ غنائم و اموال کے ایک حصّے کو "فیئ" کہا گیا ہے تو یہ اس حقیقت کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ مالِ دنیا کا بہترین حصّہ بھی وقتِ عصر کے سائے کی طرح ہے کہ جو جلد ہی زائل اور ختم ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طرف توجّہ کی جائے کہ زیرِ بحث آیت میں دائیں اور بائیں طرف کے سایوں کا ذکر ہے اور لفظ "فیئ" ان سب کے لیے استعمال ہوا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لفظ "فیئ" وسیع معنی رکھتا ہے اور اس کے مفہوم میں ہر طرح کا سایہ شامل ہے۔

جس وقت آفتاب طلوع ہوتا ہے، انسان جنوب کی طرف منہ کرکے کھڑا ہو تو وہ دیکھے گا کہ سورج اس کے بائیں طرف افقِ مشرق سے بلند ہو رہا ہے اور تمام چیزوں کا سایہ اس کی دائیں طرف پڑ رہا ہے۔ اسی دائیں طرف مغرب ہے یہ صورت اسی طرح سے رہتی ہے اور دائیں طرف کا سایہ رفتہ رفتہ کم ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ وقتِ زوال آپہنچتا ہے اس وقت سائے بائیں جانب کو ڈھلنے لگتے ہیں اور غروبِ آفتاب تک مشرق کی طرف سائے بڑھتے پھیلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ سورج غروب ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ چھپ جاتا ہے۔

اس مقام پر خدا تعالیٰ چیزوں کے سایوں کی دائیں اور بائیں طرف حرکت کا ذکر اپنی عظمت کی نشانی کے طور پر کرتا ہے اور ان کے اس ڈھلنے کو پروردگار کے حضور عالمِ خضوع و خشوع میں سجدہ ریز ہونا قرار دیتا ہے۔

ہمارے سایوں کا ہماری زندگی پر اثر

اس میں شک نہیں کہ ہمارے سائے ہماری زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں شاید بہت سے لوگ اس سے غافل ہیں قرآن نے سایوں کا ذکر اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے کیا ہے۔

سائے اگرچہ عدمِ نور کے علاوہ کچھ نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سے فوائد کے حامل ہیں مثلاً:

۱۔ سورج کی روشنی اور اس کی حیات بخش شعاعیں موجودات کی زندگی اور نشو و نما کا باعث ہیں جبکہ سائے روشنی کی شعاعوں کی تابش کو اعتدال میں رکھنے کے لیے ایک حیات آفریں کردار ادا کرتے ہیں سورج کی روشنی اگر ایک ہی طرز پر طویل عرصے کے لیے چمکتی رہے تو ہر چیز پژمُردہ ہو جائے اور جل جائے ایسے میں سایے اس شدّت وحدت کو اعتدال عطا کرتے ہیں وہ کم و بیش ہوتے رہتے ہیں کبھی اس جانب کو جھکتے ہیں اور کبھی اس جانب کو۔ گویا کبھی اِدھر نوازش کرتے ہیں اور کبھی اُدھر عنایت کرتے ہیں سایوں کا یہ طرزِ عمل چیزوں کی حفاظت اور بچاؤ میں نہایت تاثیر بخش ہے۔

۲۔ جو لوگ بیابانوں میں پھرتے رہتے ہیں یا جنہیں بیابانوں میں رہنا اور گزرنا پڑ جائے ان کے لیے انسانی نجات کے لیے سایوں کی غیر معمولی اثر انگیزی بالکل واضح ہے ایسے میں سایہ بھی وہ کہ جو متحرک ہو اور ایک ہی جگہ ٹھہر نہ جاتا ہو اور ہر طرف حرکت کرتا ہو انسانی خواہش اور ضرورت کے عین مطابق ہوتا ہے۔

۳۔ سائے کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے جو عام لوگوں کے خیال کے برخلاف ہے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں چیزوں کو دیکھنے کا ذریعہ صرف روشنی ہی ہے حالانکہ نور ہمیشہ سایے یا نیم سایے کے ساتھ ہو تو چیزیں دکھائی دیتی ہیں دوسرے لفظوں میں اگر کسی موجود کے ہر طرف ایک جیسی روشنی چمکے اور اس پر کسی قسم کا کوئی سایہ یا نیم سایہ نہ ہو تو روشنی میں مستغرق یہ چیز ہرگز نہیں دیکھی جا سکے گی۔

Marfat.com

یعنی ـــــــ جس طرح مطلق تاریکی میں کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی اسی طرح مطلق نور میں بھی کوئی چیز نہیں دیکھی جا سکتی بلکہ نور و ظلمت باہم ہوں تو چیزوں کا دکھا جانا ممکن ہوتا ہے۔ لہٰذا سایے بھی چیزیں نظر آنے اور ان کی شناخت میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ (غور کیجیے گا)۔

زیرِ نظر آیت میں ایک نکتہ اور قابلِ توجہ ہے آیت میں لفظ "یمین" (دائیں طرف) مفرد صورت میں آیا ہے جبکہ "شمائل" جمع کی صورت میں ہے "شمائل"، "شمال" (بروزن "مشعل") کی جمع ہے اور شمال کا معنی ہے بائیں طرف۔

تعبیر کا یہ فرق ہو سکتا ہے اس بناء پر ہو کہ جو لوگ جنوب کی طرف رُخ کیے ہوں، ذم صبح سایہ ان کے دائیں طرف پڑتا ہے اور پھر وہ مسلسل بائیں طرف حرکت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وقتِ مغرب افقِ مشرق میں محو ہو جاتا ہے۔[1]

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "یمین" اگرچہ مفرد ہے لیکن بعض اوقات اس سے جمع مراد ہوتی ہے اور یہاں جمع مراد ہے۔[2]

گذشتہ آیت میں صرف سایوں کے سجدہ کرنے کی بات ایک وسیع مفہوم کے طور پر آئی تھی لیکن اگلی آیت میں تمام مادی و غیر مادی اور تمام آسمانی و زمینی موجودات کے بارے میں فرمایا گیا ہے: آسمانوں اور زمین میں حرکت کرنے والی تمام موجودات اور اسی طرح فرشتے خدا کے حضور سجدہ کرتے ہیں (وللہ یسجد ما فی السمٰوٰت وما فی الارض من دابۃ والملٰئکۃ) اور وہ اس میں کسی قسم کا کوئی تکبر نہیں کرتے (وھم لا یستکبرون)۔ اور وہ خدا اور اس کے فرمان کے سامنے تسلیم محض ہیں۔

سجدہ درحقیقت انتہائی خشوع و خضوع اور پرستش کا نام ہے وہ سجدہ جو سات اعضاء کے ساتھ ہم انجام دیتے ہیں سجدہ کے عمومی مفہوم کا ایک مصداق ہے ورنہ سجدہ کا مفہوم بس اسی میں منحصر نہیں ہے۔

عالمِ تکوین اور جہانِ آفرینش میں خدا کی تمام مخلوقات اور موجودات عام قوانین کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔ اور ان قوانین سے انحراف نہیں کرتیں اور تمام قوانین خدا کی طرف سے ہیں ـــــــ پس درحقیقت تمام چیزیں بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز ہیں۔ سب اس کی عظمت کی ترجمان ہیں سب اس کی بزرگی و بے نیازی کا مظہر ہیں مختصر یہ کہ سب اس کی مقدس ذات کی دلیل ہیں۔

"دابۃ" حرکت کرنے والے موجود کے معنی میں ہے نیز اس سے زندگی کا معنی بھی لیا جاتا ہے یہ جو زیرِ نظر آیت میں کہا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں چلنے والی سب موجودات خدا کے حضور میں سجدہ ریز ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ موجودات کرۂ ارض ہی سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ آسمانی کرات میں بھی زندہ اور چلنے پھرنے والے موجودات وجود رکھتے ہیں۔

اگرچہ بعض نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ لفظ "من دابۃ" صرف "ما فی الارض" کے لیے ہے یعنی یہاں صرف زمین میں حرکت کرنے اور چلنے پھرنے والوں کے بارے میں بات کی گئی ہے لیکن یہ احتمال بہت بعید معلوم ہوتا ہے خصوصاً جبکہ سورہ شوریٰ کی

---

[1] تفسیر قرطبی، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۷، ص ۱۱۰۔

Marfat.com

آیہ ۲۹ میں ہے ۔

ومن اٰیاتہ خلق السمٰوٰت والارض وما بث فیھما من دابۃ

خدا کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین دونوں میں اس کی چلنے پھرنے والی مخلوق موجود ہے ۔

یہ بجا ہے کہ تکوینی اعتبار سے سجدہ اور خشوع وخضوع متحرک موجودات میں منحصر نہیں ہے لیکن چونکہ متحرک موجودات خلقت و آفرینش کے بہت سے اسرار وعجائبات کا مظہر ہیں لہٰذا یہاں انھی کی نشاندہی کی گئی ہے ۔

آیت کے مفہوم میں چونکہ عقل رکھنے والے انسان اور صاحب ایمان فرشتے بھی شامل ہیں نیز حیوانات اور دوسرے جانور بھی اس مفہوم میں داخل ہیں لہٰذا سجدہ یہاں عام اختیاری اور تشریعی معنی کا بھی حامل ہے اور تکوینی واضطراری معنی کا بھی ۔

رہا یہ سوال کہ زیر بحث آیت میں فرشتوں کا الگ سے ذکر کیوں ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ " دابۃ " صرف ان چلنے پھرنے والے موجودات کو کہا جاتا ہے کہ جو جسم رکھتی ہیں جبکہ فرشتے چلتے پھرتے تو ہیں لیکن مادی جسم نہیں رکھتے لہٰذا وہ " دابۃ " کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں ۔

ایک حدیث میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ فرماتے ہیں :

اللہ کے کچھ فرشتے ایسے بھی ہیں جو ابتدائے آفرینش سے خدا کے حضور سجدے میں ہیں اور روز قیامت تک اسی طرح سربسجود رہیں گے اور جب وہ قیامت کے دن سجدے سے سر اٹھائیں گے تو کہیں گے :

ما عبدناک حق عبادتک

ہم سے حق عبادت ادا نہیں ہو سکا ۔

" وھم لایستکبرون " فرشتوں کی اسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بارگاہ حق میں خضوع اور سجدہ کرتے ہیں اور اس میں ان کے اندر غرور وتکبر کا شائبہ تک نہیں ہوتا ۔

لہٰذا اس کے بعد فوراً ان کی دو صفات کا تذکرہ ہے اور یہ دونوں ان میں تکبر کے نہ ہونے کی جانب اشارہ کرتی ہیں ۔

ارشاد ہوتا ہے وہ اپنے پروردگار کی مخالفت سے ڈرتے ہیں کہ جو اُن کا حاکم ہے (یخافون ربھم من فوقھم) ۔

اور جس چیز پر وہ مامور ہیں اسے خوب انجام دیتے ہیں (ویفعلون ما یؤمرون) ۔

جیسا کہ سورہ تحریم کی آیہ ۶ میں فرشتوں کے ایک گروہ کے بارے میں ہے :

لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون

وہ فرمانِ الٰہی کی مخالفت نہیں کرتے اور انھیں جو کچھ حکم دیا جاتا ہے اسے بجالاتے ہیں ۔

اس آیہ سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ غرور وتکبر کے نہ ہونے کی دو نشانیاں ہیں ۔ ذمہ داریوں کا خوف اور احکام الٰہی کو بے چون و چرا انجام دینا ۔ ان میں سے ایک تکبر نہ کرنے کی نفسیاتی کیفیت کی طرف اشارہ ہے اور دوسری قوانین اور احکام کے بارے میں ان کے طرز عمل کی طرف ۔ طرز عمل درحقیقت نفسیاتی کیفیت کا رد عمل ہے اور اس کا عملی مظاہرہ ہے ۔

Marfat.com

آیت میں " من فوقھم" یقیناً حسی اور مکانی طور پر اوپر ہونے کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ مقام کی برتری کی طرف اشارہ ہے کیونکہ خدا سب سے برتر اور بالاتر ہے۔

سورہ انعام کی آیہ ۶۱ میں ہے:

وھو القاھر فوق عبادہ

وہ اپنے بندوں پر قاہر و غالب ہے۔

قرآن میں ہے کہ فرعون نے اپنی قدرت و طاقت کے اظہار کے لیے کہا:

وانا فوقھم قاھرون

میں ان پر قاہر و غالب ہوں۔ (اعراف ــــ ۱۲۷)

ان تمام مواقع پر لفظ " فوق" مقام کی برتری کو بیان کرتا ہے۔

Marfat.com

۵۱۔ وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ
فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ○

۵۲۔ وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ
تَتَّقُوْنَ ○

۵۳۔ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ
تَجْـــَٔرُوْنَ ○

۵۴۔ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ
يُشْرِكُوْنَ ○

۵۵۔ لِيَكْفُرُوْا بِمَآ اٰتَيْنٰهُمْ ۭ فَتَمَتَّعُوْا ۣ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ:

۵۱۔ اور اللہ نے حکم دیا ہے کہ دو خداؤں کا انتخاب نہ کرو (تمھارا) معبود صرف ایک ہے۔ صرف مجھ سے (اور میرے عذاب سے) ڈرو۔

۵۲۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اسی کا ہے اور دین (اور دینی قانون) ہمیشہ اسی کا ہے تو کیا اس کے غیر سے ڈرتے ہو؟

۵۳۔ تمھارے پاس جو کچھ بھی نعمتیں ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں پھر جب تمھیں پریشانیاں (اور تکالیف) پہنچتی ہیں تو اسی کو پکارتے ہو۔

۵۴۔ اور جب وہ رنج و تکلیف تم سے دُور کر دیتا ہے تو تم میں سے بعض اپنے پروردگار کے لیے شریک ماننے لگتے ہیں۔

۵۵۔ (چھوڑو انھیں) ہم نے انھیں جو نعمتیں دی ہیں ان کا کُفران کریں اور چند دن (اس دنیاوی مال و متاع سے) فائدہ اٹھالیں۔ پس عنقریب جان لوگے (کہ تمھارا انجام کار تمھیں کہاں کھینچ لے آیا ہے)۔

Marfat.com

تفسیر:

ایک دین اور ایک معبود

توحید اور خدا شناسی کی بحث کے بعد زیر نظر آیات میں نظام خلقت کے حوالے سے نفی شرک پر زور دیا گیا ہے تاکہ ان دونوں سے مجموعی طور پر حقیقت زیادہ آشکار ہو جائے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: خدا نے حکم دیا ہے کہ دو خدا نہ مانو (وقال اللہ لاتتخذوا الٰھین اثنین)۔ معبود ایک ہی ہے (انما ھو الٰہ واحد)۔

نظامِ خلقت کی وحدت اور اس پر حاکم قوانین کی وحدت، خود خالق و معبود کی وحدت کی دلیل ہے اب جبکہ ایسا ہی ہے تو "صرف میرے عذاب سے ڈرو اور میرے فرمان کی مخالفت سے خوف کھاؤ نہ کہ کسی غیر سے ڈرتے رہو (فایای فارھبون)۔

لفظ "ایای" کا مقدم ہونا حصر کی دلیل ہے جیسے "ایاك نعبد"۔ مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف میری مخالفت اور میرے عذاب سے ڈرتے رہو۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت میں صرف دو معبودوں کی نفی کی گئی ہے حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ عرب کے مشرکین نے بہت سے بُت اور معبود بنا رکھے تھے اور ان کے بُت خانے مختلف قسم کے بتوں سے بھرے ہوئے تھے ہو سکتا ہے یہ تعبیر ذیل کے نکات میں سے کسی ایک یا سب کی طرف اشارہ ہو۔

۱۔ آیت کہتی ہے کہ دو معبودوں کی عبادت بھی غلط ہے چہ جائیکہ زیادہ معبودوں کی۔ دوسرے لفظوں میں کم از کم بات بیان کر دی گئی ہے تاکہ باقی ماندہ کی نفی زیادہ تاکید کے ساتھ ہو کیونکہ ایک سے زیادہ جس عدد کو بھی اختیار کریں دو سے بہر حال گذرنا پڑے گا۔

۲۔ یہاں تمام باطل معبود ایک شمار کیے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ انھیں حق کے مقابلے میں قرار نہ دو۔ اور دو معبودوں (معبودِ حق اور معبودِ باطل) کی پرستش نہ کرو۔

۳۔ زمانہ جاہلیت کے عربوں نے درحقیقت دو معبود اپنا رکھے تھے ایک وہ معبود جو خالق ہے اور جہان کو پیدا کرنے والا ہے یعنی اللہ اور دوسرا وہ معبود جسے وہ اپنے اور اللہ کے درمیان وسیلہ سمجھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ بُت خیر، برکت اور نعمت کا وسیلہ ہیں۔

۴۔ ہو سکتا ہے کہ مندرجہ بالا آیت "ثنویین" (دو خداؤں کی پوجا کرنے والوں) کے عقیدے کے لیے نفی ہو ثنویین دو خداؤں یعنی نیکی کا خدا اور بدی کا خدا کے قائل تھے۔ دو خداؤں کی پوجا کرنے والوں کی منطق اگرچہ ضعیف اور غلط تھی، لیکن عرب بُت پرستوں کے پاس تو ایسی کمزور منطق بھی نہ تھی۔

عظیم مفسر مرحوم طبرسی نے اس آیت کے ذیل میں بعض حکماء سے یہ لطیف جملہ نقل کیا ہے:

خدا نے تجھے حکم دیا ہے کہ دو خداؤں کی عبادت نہ کر لیکن تو نے تو اپنے اتنے سارے معبود بنا رکھے ہیں۔

Marfat.com

ایک بت تیرا سرکش نفس ہے، دوسرا بت تیری ہوا و ہوس ہے ۔ تیرے مادی مقاصد اس پر مستزاد ہیں یہاں تک کہ تو انسانوں کو سجدہ کرتا ہے ۔ تو کس قسم کا توحید کا پرستار ہے ۔

اس کے بعد تین آیات میں توحید عبادت کی دلیل چار حوالوں سے پیش کی گئی ہے ۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی ملکیت ہے (ولہ ما فی السمٰوٰت و الارض) تو کیا عالم ہستی کے مالک کو سجدہ کرنا چاہیے ، یا بتوں کو کہ جو کسی بھی قابلیت سے محروم ہیں ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف آسمان و زمین اس کی ملکیت ہیں بلکہ ہمیشہ سے دین اور تمام قوانین بھی اسی کی طرف سے ہیں (ولہ الدین واصبًا) ۔

جب یہ ثابت ہے کہ عالم ہستی اسی کی طرف سے ہے اور وہی تکوینی قوانین ایجاد کرتا ہے تو مسلم ہے کہ تشریعی قوانین بھی اسی کے ذریعے معین ہونا چاہییں لہٰذا طبعًا و فطرتًا اطاعت بھی اسی کے ساتھ مخصوص ہے ۔

" واصب " دراصل " وصوب " کے مادہ سے " دوام " کے معنی میں لیا گیا ہے بعض نے اس کا معنی " خالص " کیا ہے ۔ فطری بات ہے کہ جب تک کوئی چیز خالص نہ ہو دوام حاصل نہیں کر سکتی) ہو سکتا ہے آیت میں یہ لفظ دونوں پہلوؤں کی طرف اشارہ کر رہا ہو یعنی ہمیشہ اور ہر زمانے میں دینِ خالص خدا کی طرف سے ہے جنھوں نے دین کو اطاعت کے مفہوم میں لیا ہے ، انھوں نے " واصب " کا معنی " واجب " لیا ہے یعنی صرف خدا کے حکم کی اطاعت ہونی چاہیے ۔

ایک روایت میں بھی ہے کہ ایک شخص نے امام صادق علیہ السلام سے اس جملے کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا تو امام نے فرمایا

واصب یعنی واجب[1]

لیکن واضح ہے کہ یہ معانی ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں ۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کیا اس کے باوجود کہ تمام قوانین دین اور اطاعتِ خدا سے مخصوص ہیں اس کے غیر سے ڈرتے ہو (افغیر اللہ تتقون) ۔

کیا بت تمھیں کوئی نقصان پہنچا سکتے ہیں ؟

کیا بت تمھیں کوئی نعمت بخش سکتے ہیں ؟

نہیں تو ـــــــ پھر ان کی مخالفت کا تمھیں خوف کیوں ہے اور ان کی عبادت کو تم کیوں ضروری سمجھتے ہو حالانکہ جتنی نعمتیں تمھارے پاس ہیں سب خدا کی طرف سے ہیں : (و ما بکم من نعمۃ فمن اللہ) ۔

یہ درحقیقت معبود یگانہ یعنی اللہ کی عبادت ضروری ہونے کے بارے میں یہاں تیسری بات کی گئی ہے مراد یہ ہے کہ بتوں کی عبادت اگر شکرِ نعمت کی وجہ سے ہے تو انھوں نے تو تمھیں کوئی نعمت نہیں دی کہ جس کا شکر ضروری ہو بلکہ تمھارے وجود پر سرتاپا نعمتِ الٰہی محیط ہے اس کے باوجود تم نے اس کی بندگی کو چھوڑ رکھا ہے اور بتوں کے پیچھے لگے پھرتے ہو ۔

---

[1] تفسیر برہان جلد ۲ ص ۳۷۳ ۔

Marfat.com

علاوہ ازیں جب تمھیں پریشانیوں، مصیبتوں اور رنج و بلا کا سامنا ہوتا ہے تو انھیں دُور کرنے کے لیے بارگاہِ الٰہی میں آہ و زاری کرتے ہو اور اسے پکارتے ہو (ثم اذا مسکم الضر فالیہ تجئرون)۔ لہٰذا بتوں کی پرستش اگر دفع ضرر اور حلِ مشکلات کے لیے کرتے ہو تو غلط ہے کیونکہ خود تم نے بھی عملی طور پر ثابت کیا ہے کہ زندگی کے سنگین لمحات میں سب چیزوں کو چھوڑ کر خدا کی بارگاہ کی طرف جاتے ہو۔ یہ دراصل مسئلہ توحید عبادت کے بارے میں چوتھی بات ہے۔

"تجئرون" دراصل "جؤار" (بروزن "غبار") کے مادہ سے ہے یہ چوپایوں اور وحشی جانوروں کی اس آواز کو کہتے ہیں جو تکلیف کے عالم میں ان سے بے اختیار نکلتی ہے بعد ازاں یہ لفظ کنایے کے طور پر ہر اس آہ و زاری کے لیے استعمال ہونے لگا جو درد و غم کے موقع پر بے اختیار بلند ہو۔

اس لفظ کا یہاں پر خصوصیت سے انتخاب اس بات کو تقویت پہنچاتا ہے کہ جب مشکلات بہت زیادہ ہو جائیں جان عذاب میں ہو اور درد و غم کے مارے بے اختیار فریاد بلند کرو تو کیا اس وقت اللہ کے علاوہ کسی کو پکارتے ہو؟ نہیں تو پھر آرام اور سکون کے وقت اور چھوٹی چھوٹی مشکلات کے موقع پر بتوں کے دامن سے کیوں جا لگتے ہو۔

جی ہاں! ان مواقع پر خدا تمھاری فریاد سنتا ہے اس کا جواب دیتا ہے اور تمھاری مشکلات کو برطرف کرتا ہے" پھر جب اللہ تمھارے ضرر اور رنج و غم کو برطرف کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ اپنے پروردگار کے لیے شریک ماننے لگتے ہیں اور بتوں کی راہ لیتے ہیں (ثم اذا کشف الضر عنکم اذا فریق منکم بربھم یشرکون)۔

قرآن درحقیقت اس باریک نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہے کہ فطرتِ توحید تم سب میں موجود ہے عام حالات میں غفلت غرور، جہالت، تعصب اور خرافات کے پردے اسے ڈھانپ دیتے ہیں لیکن جب طوفانِ حوادث آجائیں اور مصائب کی تند و تیز آندھیاں چل پڑیں تو یہ پردے ہٹ جاتے ہیں اور نورِ فطرت آشکار ہو جاتا ہے اور چہرۂ فطرت چمکنے لگتا ہے ایسی حالت میں تم خدا کو اپنے پورے وجود اور اخلاص کے ساتھ پکارتے ہو۔ اور خدا بھی رنج و بلا تم سے دور کر دیتا ہے۔ رنج و بلا کے پردے اس لیے ہٹ جاتے ہیں کہ غفلت کے پردے اُٹھ چکے ہوتے ہیں (توجہ رہے کہ آیت میں لفظ "کشف الضر" استعمال ہوا ہے جس کا مطلب ہے مشکلات کے پردے ہٹ جانا)۔

اِدھر طوفانِ مصائب تھمتا ہے زندگی ساحلِ سکون سے ہم کنار ہوتی ہے اور اُدھر وہی غفلت، غرور اور شرک و بُت پرستی ظاہر ہونے لگتی ہے۔

منطقی دلائل اور توضیحِ حقیقت کے بعد، زیرِ بحث آخری آیت میں تہدید آمیز لہجے میں کہا گیا ہے، تمھیں جو نعمتیں دی گئی ہیں ان کا کفران کر لو اور چند روز اس دنیاوی مال و متاع سے بہرہ مند ہو لو لیکن عنقریب تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ تمھارے کام کا انجام کیا ہے (لیکفروا بما اٰتینٰھم فتمتعوا فسوف تعلمون)۔

یہ بالکل اس طرح ہے جیسے کوئی انسان کسی منحرف شخص کو مختلف دلائل و براہین کے ساتھ وعظ و نصیحت کرے تو ممکن ہے اس پر کوئی اثر نہ ہو تو آخر میں ایسے تہدید آمیز جملے پر اپنی گفتگو تمام کر دے کہ، جو باتیں میں تم سے کہہ چکا ہوں یہ سننے کے باوجود اگر تم

Marfat.com

اپنی اصلاح نہ کرو تو پھر جو کچھ کر سکو کرتے رہو لیکن یاد رکھو تم جلد اس کے انجام سے دوچار ہو گے۔
اس بناء پر" لیکفروا " میں لام" لام امر" ہے وہ امر جو تہدید کے لیے آیا ہے جیسے" تمتعوا " بھی امر ہے تہدید کے لیے۔ فرق یہ ہے کہ" لیکفروا " غائب کا صیغہ ہے اور" تمتعوا " مخاطب کا۔ گویا پہلے انھیں غائب فرض کر کے قرآن کہتا ہے:

یہ جائیں اور تمام نعمتوں کا کفران کریں۔

اس تہدید سے اب وہ کچھ متوجہ ہوئے ہیں گویا وہ مخاطب کے طور پر سامنے آگئے ہیں۔ اب قرآن ان سے کہتا ہے۔

ان دنیاوی نعمتوں سے چند دن فائدہ اٹھا لو لیکن ایک روز دیکھو گے کہ تم کس عظیم اشتباہ اور کتنی بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے ہو اور آخر کار تم کس انجام تک آپہنچے ہو۔

درحقیقت یہ آیت سورۃ ابراہیم کی آیہ ۳۰ کے مشابہ ہے:

قل تمتعوا فان مصیرکم الی النار

کہہ دو چند روز اس دنیا کی لذتیں اٹھا لو آخر کار تمھارا انجام کار آتش جہنم ہے۔[1]

---

[1] بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے" لیکفروا " اس شرک و کفران کی غایت و نتیجہ ہے جو پہلی آیت میں ذکر ہوا ہے اس بناء پر معنی یہ ہو گا:

حوادث کے چنگل سے نجات مل گئی تو بعد ازاں انھوں نے راہِ توحید کو چھوڑ دیا اور شرک کی راہ اپنا لی تاکہ نعمتوں کا کفران و انکار کریں۔

Marfat.com

۵۶۔ وَيَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ نَصِيْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ۭ تَاللّٰهِ
لَتُسْـَٔـلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ۝
۵۷۔ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝
۵۸۔ وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ
كَظِيْمٌ ۝
۵۹۔ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْۗءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ
اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝
۶۰۔ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ۭ
وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

ترجمہ:

۵۶۔ جو روزی ہم نے انھیں دی ہے وہ اس کا ایک حصہ بتوں کے نام کر دیتے ہیں جبکہ ان سے وہ کسی قسم کے سود و زیاں کی خبر نہیں رکھتے۔ خدا کی قسم (قیامت کی عدالت میں) ان جھوٹی تہمتوں پر اُن سے بازپرس ہوگی۔

۵۷۔ وہ (اپنے خیال میں) اللہ کے لیے بیٹیوں کے قائل تھے وہ (اس سے) منزہ ہے (کہ اس کی اولاد ہو) لیکن اپنے لیے وہ کچھ چاہتے جو انھیں پسند ہوتا ہے۔

۵۸۔ حالانکہ جب اُن میں سے کسی کو بشارت دی جائے کہ تمھارے ہاں بیٹی ہوئی ہے تو (غم اور پریشانی کے مارے) اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔

۵۹۔ اس بُری خبر پہ اپنے قوم قبیلے سے منہ چھپائے پھرتا ہے اور اس فکر میں ہوتا ہے کہ ذلت اٹھا کر اسے زندہ رہنے دے یا تہہ خاک چھپا دے یہ لوگ کیسا بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔

۶۰۔ بُری صفتیں انھیں ہی جچتی ہیں جو دار آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ خدا کے لیے تو اعلیٰ صفات ہیں اور وہ عزیز و حکیم ہے۔

Marfat.com

تفسیر:

جہاں بیٹی کو باعثِ رسوائی سمجھا جاتا تھا

گذشتہ آیات میں شرک و بُت پرستی کے خلاف مدلل بحث تھی۔ اب زیرِ نظر آیات میں مشرکین کی بعض بُری بدعتوں اور گھٹیا عادتوں کو بیان کیا گیا ہے تاکہ شرک پرستی کے خلاف ایک اور دلیل قائم ہو جائے۔

پہلے ارشاد ہوتا ہے: ان مشرکوں کو ہم نے جو روزی دی ہے اس کا ایک حصّہ بتوں کی نذر کر دیتے ہیں جبکہ انھیں ان سے کسی نفع و نقصان کی خبر تک نہیں (و یجعلون لما لا یعلمون نصیباً مما رزقنٰھم[۱])۔

جس حصّے کا یہاں ذکر ہے اُس میں کچھ اونٹ اور دیگر چوپایے شامل ہوتے ہیں اور کچھ حصّہ وہ زرعی پیداوار کا وقف کرتے ہیں اس کی طرف سورۂ انعام کی آیہ ۱۳۶ میں اشارہ ہوا ہے کہ مشرکین زمانہ جاہلیت میں اسے بتوں کے لیے مخصوص سمجھتے تھے اور ان کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ حالانکہ بتوں سے انھیں کوئی فائدہ پہنچتا تھا نہ ضرر کا خوف ہوتا تھا یہ نہایت احمقانہ کام تھا جو وہ انجام دیتے تھے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا: قسم بخدا! قیامت کی عدالت میں ان تہمتوں اور جھوٹوں کے بارے میں باز پُرس ہوگی (تاللہ لتسئلن عما کنتم تفترون)۔

اس باز پُرس پر ان کے لیے اعتراف کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔ اس اعتراف کے بعد انھیں سزا ملے گی لہٰذا تمھارے اس بُرے اور منحوس عمل کا دنیاوی نقصان بھی ہے اور اُخروی بھی۔

ان کی دوسری منحوس بدعت یہ تھی کہ وہ اس خدا کے لیے بیٹیوں کے قائل تھے کہ جو ہر قسم کی آلائشِ جسمانی سے پاک ہے وہ معتقد تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں (و یجعلون للہ البنات سبحٰنہ)۔ لیکن اپنی نوبت پر اپنے لیے وہ کچھ چاہتے

---

[۱] "لما لا یعلمون" کے معنی اور اس کی ضمیر کے بارے میں مفسرین نے دو تفسیریں بیان کی ہیں:

پہلی یہ کہ "لا یعلمون" کی ضمیر مشرکین کی طرف لوٹتی ہے یعنی مشرکین اپنے بتوں کے لیے ایک حصّہ وقف کر دیتے ہیں جبکہ ان سے کسی خیر و شر کی انھیں خبر نہیں۔ ہم نے یہی تفسیر انتخاب کی ہے۔

دوسری یہ کہ "لا یعلمون" کی ضمیر خود بتوں کی طرف لوٹتی ہے یعنی وہ بُت کہ جو علم، شعور اور عقل نہیں رکھتے؛ ان کے لیے ایک حصّہ نذر کرتے تھے۔

لیکن اس دوسری صورت میں آیت کی تعبیرات میں ایک تضاد سا محسوس ہوتا ہے کیونکہ "ما" عام طور پر غیر ذوی العقول موجودات کے لیے استعمال ہوتا ہے جبکہ "یعلمون" عموماً ذوی العقول کے لیے آتا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے۔

جبکہ پہلی تفسیر کی بناء پر "ما" بتوں کی طرف اشارہ ہے اور "لا یعلمون" عبادت کرنے والوں کی طرف۔

Marfat.com

جو انھیں پسند تھا (ولهم ما یشتهون) ۔

یعنی وہ کسی صورت تیار نہ تھی کہ انھی بیٹیوں کو اپنے لیے پسند کریں کہ جنھیں خدا کے لیے قرار دیتے تھے ۔ بیٹی تو ان کی نظر میں سخت ننگ و عار، رسوائی اور بدبختی کی علامت تھی ۔

اگلی آیت میں بات جاری رکھتے ہوئے ان کی تیسری بُری عادت کی نشاندہی کی گئی ہے فرمایا گیا ہے : جب ان میں سے کسی کو بشارت دی جاتی ہے کہ خدا نے تجھے بیٹی دی ہے تو غم اور غُصّے کے مارے ان کا رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے (واذا بشر احدهم بالانثیٰ ظل وجهه مسودًا) اور زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتا (وهو کظیم)[1]

معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اپنے خیالِ باطل کے باعث وہ جس ننگ و عار میں مبتلا ہے اس میں اس کی حالت یہ ہے کہ "یہ بُری خبر سن کر وہ اپنی قوم قبیلے سے چھپتا چھپاتا ہے" (یتواری من القوم من سوء ما بشر به) ۔

بات اس پر بھی بس نہیں ہوتی بلکہ وہ ہمیشہ اس فکر میں غوطہ زن رہتا ہے کہ کیا وہ اس ننگ و عار کو قبول کر لے اور اپنی بیٹی کو اپنے پاس رکھے یا اسے زندہ درگور کر دے (أیمسکه علی هون ام یدسه فی التراب) ۔

آیت کے آخر میں اس ظالمانہ شقاوت آمیز غیر انسانی فیصلے کی انتہائی صراحت سے مذمت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے : جان لو کہ وہ بہت بُرا اور قبیح فیصلہ کرتے ہیں (الا ساء ما یحکمون) ۔

آخر میں ان تمام برائیوں اور قباحتوں کو آخرت پر ایمان نہ ہونے کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے : جو دار آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انھی کی ایسی بُری صفات ہوتی ہیں (للذین لا یؤمنون بالاٰخرة مثل السوء) ۔

لیکن خدا کی صفات بہت عالی ہیں (ولله المثل الاعلیٰ) ۔ اور وہ زبردست حکمت والا ہے (وهو العزیز الحکیم) ۔

یہی سبب ہے کہ جو انسان اس عظیم و عزیز اور حکیم و دانا خدا کے نزدیک ہوتا ہے اس کے علم و قدرت و حکمت کی بلند صفات کی طاقت ور شعاعیں اس پر پڑتی ہیں اور وہ خرافات اور گھٹیا بدعات سے الگ ہو جاتا ہے ۔

لیکن انسان جس قدر اللہ سے دُور ہوتا ہے اسی قدر جہالت، زبُوں حالی اور ظلمتوں میں پھنستا چلا جاتا ہے ۔

اللہ اور اس کی عدالت کو بھول جانا تمام تر پستیوں، برائیوں اور بے راہ رویوں کا باعث ہے ۔

ان دونوں بنیادی اصولوں کو یاد رکھا جائے تو انسان میں احساسِ مسؤلیت زندہ رہتا ہے وہ جہالت و خرافات کے خلاف جنگ کے لیے توانائی و دانائی کے حقیقی سرچشمہ سے مدد حاصل کرتا رہتا ہے ۔

چند اہم نکات

۱۔ وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کیوں کہتے تھے ؟ قرآن کی متعدد آیات کے مطابق عرب کے مشرکین فرشتوں کو خدا کی

---

[1] "کظیم" اس شخص کو کہتے ہیں جو غم و اندوہ کے عالم میں اپنے تئیں سنبھالا دے رہا ہو یعنی زہر کے گھونٹ پی رہا ہو۔

Marfat.com

بیٹیاں خیال کرتے تھے یا خدا کی طرف منسوب کیے بغیر انھیں عورتوں کی صنف میں سے سمجھتے تھے۔

سورہ زخرف کی آیہ ۱۹ میں ہے:

وجعلوا الملائکۃ الذین ھم عباد الرحمٰن اناثاً

فرشتے کہ جو رحمٰن کے بندے ہیں انھیں وہ عورتیں قرار دیتے تھے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیہ ۴۰ میں ہے:

افاصفاکم ربکم بالبنین واتخذ من الملائکۃ اناثاً

کیا تمھیں خدا نے بیٹے دیے ہیں اور خود فرشتوں میں سے بیٹیاں بنا رکھی ہیں۔

ہو سکتا ہے یہ خیال گزشتہ اقوام کی خرافات میں سے زمانہ جاہلیت کے عربوں تک پہنچا ہو یہ بھی ممکن ہے کہ فرشتے چونکہ نظروں سے پوشیدہ ہیں اور پردے میں رہنے کی صفت عورتوں میں پائی جاتی ہے اس لیے وہ انھیں مؤنث سمجھتے ہوں یہی وجہ ہے کہ بعض کے بقول عرب سورج کو مؤنث مجازی اور چاند کو مذکر مجازی کہتے تھے کیونکہ سورج کا قرص اپنے خیرہ کن نور میں چھپا ہوتا ہے اور اس کی طرف نگاہ کرنا آسان نہیں ہے جبکہ چاند کی ٹکیہ پوری طرح نمایاں ہے۔

یہ بھی احتمال ہے کہ فرشتوں کے وجود کی لطافت اس توہم کا سبب بنی ہو کیونکہ عورت مرد کی نسبت زیادہ لطیف ہے۔

بہرحال یہ ایک پرانا، غلط اور فضول سا تصور ہے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس خیال باطل کی تلچھٹ ابھی تک بعض لوگوں کی فکر میں موجود ہے یہاں تک کہ مختلف زبانوں کے ادب میں بھی یہ بات دکھائی دیتی ہے کہ کسی خوبصورت عورت کی تعریف کے لیے اسے فرشتہ کہتے ہیں اسی طرح فرشتوں کی تصویر بناتے ہیں تو اسے عورتوں کی شکل دیتے ہیں حالانکہ اصولی طور پر فرشتے مادی جسم ہی نہیں رکھتے کہ ان کے بارے میں مذکر و مؤنث کی بحث میں پڑا جائے۔

۲۔ بیٹیوں کو زندہ درگور کیوں کیا جاتا تھا؟ واقعاً یہ بات بڑی وحشت انگیز ہے کہ انسان اپنے انسانی جذبات و احساسات کو مسل کر اتنا آگے بڑھ جائے کہ دوسرے انسان کو قتل کر دے ——— قتل بھی ایسا بدترین کہ پھر جس پر وہ فخر کرتا پھرے ——— پھر قتل بھی اسے کرے کہ جو اس کا اپنا جگر گوشہ ہو ——— کمزور اور ننھی سی جان ہو ——— اور پھر قتل بھی اس طرح سے کہ اس زندہ بولتی جاگتی جان کو اپنے ہاتھوں مٹی میں دفن کر دے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ انسان ایسا وحشت ناک جرم کرنے لگے چاہے وہ نیم وحشی ہی کیوں نہ ہو۔

اس کام کی یقیناً کچھ معاشرتی، نفسیاتی اور اقتصادی بنیادیں تھیں۔

مؤرخین کہتے ہیں کہ اس فعل کی ابتداء زمانہ جاہلیت میں یوں ہوئی کہ:

ایک مرتبہ دو گروہوں میں جنگ شروع ہوگئی۔ فاتح گروہ نے مغلوب گروہ کی بیٹیوں اور عورتوں کو قید کر لیا۔ ایک مدت بعد جب ان کے مابین صلح ہو گئی تو انھوں نے شکست کھانے والے گروہ کے قیدی واپس کرنا چاہے لیکن بعض قیدی لڑکیوں نے فتحمند گروہ کے مردوں سے شادی کر لی تھی انھوں نے یہی پسند کیا کہ دشمنوں کے ہاں ہی رہ جائیں اور پلٹ کر اپنے قبیلے میں نہ جائیں

Marfat.com

ان لڑکیوں کے والدوں پر یہ بات بہت گراں گذری۔ انھیں اس پر بہت شرمساری اٹھانا پڑی یہاں تک کہ ان میں سے بعض نے قسم کھائی کہ اگر آئندہ ان کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو وہ خود اسے اپنے ہاتھوں ختم کردیں گے تاکہ وہ دشمنوں کے ہاتھ نہ لگے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح وحشت ناک ترین جرائم اور مظالم ناموس و شرافت کی حفاظت اور خاندان کی عزت کے نام پر انجام دیئے گئے۔

بات یہاں تک جا پہنچی کہ اس قبیح اور شرمناک بدعت کو بعض لوگ سراہنے لگے اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا زمانہ جاہلیت کی ایک رسم بن گئی جس کی قرآن نے شدت کے ساتھ مذمت کی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

واذا الموءودة سئلت بأی ذنب قتلت ۰

وہ لڑکی جسے زندہ درگور کردیا گیا تھا جب اس سے پوچھا جائے گا کہ بتا تجھے کس جرم میں قتل کیا گیا۔

(تکویر ——— ۸، ۹)

لڑکے چونکہ تولید کنندہ ہوتے ہیں اور لڑکیاں مصرف کنندہ لہٰذا یہ احتمال بھی ہے کہ اس امر نے بھی اس ظلم میں مدد کی ہو لڑکے کو وہ لوگ بڑا سرمایہ سمجھتے تھے۔ لوٹ مار اور اونٹوں کی حفاظت وغیرہ میں اس سے کام لیتے تھے۔ جب کہ بیٹیاں ایسے کسی کام نہ آتی تھیں۔

دوسری طرف ان میں قبائلی جنگوں کا ایک دائمی سلسلہ تھا۔ جھگڑے فساد ہوتے رہتے تھے ان میں بہت سے جنگجو مرد اور لڑکے کام آجاتے تھے لہٰذا لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں توازن اور تناسب باقی نہیں رہتا تھا۔ لڑکوں کا وجود اس قدر نادر اور عزیز ہوچکا تھا کہ ایک بھی لڑکا پیدا ہوتا تو خاندان کے لیے بڑے فخر کی بات ہوتی جب کہ ایک لڑکی پیدا ہوجاتی تو پورا خاندان رنجیدہ ہوجاتا۔

بات یہاں تک جا پہنچی کہ بعض مفسرین کے بقول جب کسی عورت کے ہاں بچے کی پیدائش کا وقت ہوتا تو اس کا شوہر کہیں غائب ہوجاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکی پیدا ہوجائے اور وہ گھر پر موجود ہو اس کے بعد اگر اسے خبر ملتی کہ لڑکا پیدا ہوا ہے تو ناقابلِ توصیف خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اور شور مچاتے ہوئے گھر میں پلٹ آتا لیکن اگر اسے پتہ چلتا کہ بیٹی ہوئی ہے تو اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی[1]

بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کی داستان بڑی ہی دردناک ہے ان واقعات پر نظر پڑے تو حالت غیر ہوجاتی ہے۔

ایسے ہی ایک واقعے کے بارے میں لکھا ہے:

ایک شخص پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے اسلام قبول کرلیا، سچا اسلام۔

---

[1] تفسیر فخر الدین رازی جلد ۲۰ ص ۵۵۔

Marfat.com

ایک روز وہ آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور سوال کیا: اگر میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہو تو کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟

آپؐ نے فرمایا: خدا تواب و رحیم ہے۔

اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! میرا گناہ بہت ہی بڑا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: وائے ہو تجھ پر، تیرا گناہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو خدا کی بخشش سے بڑا تو نہیں؟

وہ کہنے لگا: اب جبکہ آپ یہ کہتے ہیں تو میں عرض کروں۔ زمانہ جاہلیت میں میں ایک دور دراز کے سفر پر گیا ہوا تھا ان دنوں میری بیوی حاملہ تھی میں چار سال بعد گھر واپس لوٹا۔ میری بیوی نے میرا استقبال کیا میں گھر آیا تو مجھے ایک بچی نظر پڑی۔ میں نے پوچھا یہ کس کی لڑکی ہے؟ اس نے کہا: ایک ہمسایہ کی لڑکی ہے۔ میں نے سوچا گھنٹے بھر تک اپنے گھر چلی جائے گی لیکن مجھے بڑا تعجب ہوا کہ وہ نہ گئی۔ مجھے علم نہ تھا کہ یہ میری لڑکی ہے اور اس کی ماں حقیقت کو چھپا رہی ہے کہ کہیں یہ میرے ہاتھوں قتل نہ ہو جائے۔

اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: آخر کار میں نے بیوی سے کہا: سچ بتاؤ یہ کس کی لڑکی ہے؟

بیوی نے جواب دیا: جب تم سفر پر گئے تھے تو میں امید سے تھی بعد میں یہ بیٹی پیدا ہوئی۔ یہ تمہاری ہی بیٹی ہے۔

اس شخص نے مزید کہا: میں نے وہ رات بڑی پریشانی کے عالم میں گزاری کبھی آنکھ لگ جاتی اور کبھی میں بیدار ہو جاتا۔ صبح قریب تھی، میں بستر سے اٹھا، لڑکی کے بستر کے پاس گیا وہ اپنی ماں کے پاس سو رہی تھی۔ میں نے اسے بستر سے نکالا، اسے جگایا۔ اس سے کہا: میرے ساتھ نخلستان کی طرف چلو۔

اس نے بات جاری رکھی: وہ میرے پیچھے پیچھے چل رہی تھی یہاں تک کہ ہم نخلستان میں پہنچ گئے میں نے گڑھا کھودنا شروع کیا وہ میری مدد کر رہی تھی میرے ساتھ مل کر مٹی باہر پھینکتی تھی گڑھا مکمل ہو گیا میں نے اسے بغل کے نیچے سے پکڑ کر اس گڑھے کے درمیان دے مارا۔

اتنا سننا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں بھر آئیں۔ ....

اس نے مزید بتایا: میں نے اپنا بایاں ہاتھ اس کے کندھے پر رکھا تاکہ وہ باہر نہ نکل سکے دائیں ہاتھ سے میں اس پر مٹی ڈالنے لگا اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے، بڑی مظلومانہ فریاد کی: وہ کہتی تھی ابو جان! آپ مجھ سے یہ سلوک کیوں کر رہے ہیں؟

اس نے بتایا: میں اس پر مٹی ڈال رہا تھا کہ کچھ مٹی میری داڑھی پر آ پڑی بیٹی نے ہاتھ بڑھایا اور

Marfat.com

میرے چہرے سے مٹی صاف کی لیکن میں اسی قساوت اور سنگدلی سے اس کے منہ پر مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ اس کے نالہ و فریاد کی آخری آواز تہِ خاک دم توڑ گئی ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے داستان بڑے غم کے عالم میں سُنی ۔ بہت دُکھی اور پریشان تھے اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے جا رہے تھے . . . . . .

آپؐ نے فرمایا : اگر رحمتِ خدا کو اس کے غضب پر سبقت نہ ہوتی تو ضروری تھا کہ جتنا جلدی ہوتا وہ تجھ سے انتقام لیتا۔[1]

قیس بن عاصم بنی تمیم کے سرداروں میں سے تھا ۔ ظہور رسالت مآب کے بعد وہ اسلام لے آیا تھا اس کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک روز وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ چاہتا تھا کہ جو سنگین بوجھ وہ اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتا ہے اسے کچھ ہلکا کرے ۔ اس نے رسول اکرمؐ کی خدمت میں عرض کیا :

گزشتہ زمانے میں بعض باپ ایسے بھی تھے جنھوں نے جہالت کے باعث اپنی بے گناہ بیٹیوں کو زندہ در گور کر دیا تھا میری بھی بارہ بیٹیاں ہوئیں میں نے سب کے ساتھ یہ گھناؤنا سلوک کیا لیکن جب میرے ہاں تیرہویں بیٹی ہوئی تو میری بیوی نے اسے مخفی طور پر جنم دیا اس نے بظاہر کیا کہ نومولود مردہ پیدا ہوئی ہے ۔ لیکن اسے چھپ چھپا کر اپنے قبیلے والوں کے ہاں بھیج دیا اس وقت تو میں مطمئن ہو گیا لیکن بعد میں مجھے اس ماجرے کا علم ہو گیا میں نے اسے حاصل کیا اور اپنے ساتھ ایک جگہ لے گیا ۔

اس نے بہت آہ و زاری کی ، میری منتیں کیں ، گریہ و بکا کی مگر میں نے پرواہ نہ کی اور اسے زندہ در گور کر دیا ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے یہ واقعہ سنا تو بہت ناراحت ہوئے ۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے کہ آپؐ نے فرمایا :۔

من لا یرحم لا یرحم

جو کسی پر رحم نہیں کھاتا اس پر رحم نہیں کیا جائے گا ۔

اس کے بعد آپؐ نے قیس کی طرف رُخ کیا اور یوں گویا ہوئے :

تمھیں سخت دن درپیش ہے ۔

قیس نے عرض کیا :

---

[1] القرآن یواکب الدھر جلد ۲ ص ۲۱۴ ۔

Marfat.com

میں کیا کروں کہ اس گناہ کا بوجھ میرے کندھے سے ہلکا ہوجائے؟

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

تو نے جتنی بیٹیوں کو قتل کیا ہے اتنے ہی غلام آزاد کر (کہ شاید تیرے گناہ کا بوجھ ہلکا ہو جائے[1])

نیز مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ بن ناجیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ حریت فکر رکھنے والا ایک شریف انسان تھا۔ زمانہ جاہلیت میں وہ لوگوں کی بہت سی بُری عادات کے خلاف جدوجہد کرتا تھا یہاں تک کہ اس نے ۳۶۰ لڑکیاں ان کے والدوں سے خرید کر انھیں موت سے نجات بخشی۔ ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ ایک باپ اپنی نومولود بیٹی کو قتل کرنے کا مصمم ارادہ کر چکا ہے۔ اس بچی کی نجات کے لیے اس نے اپنی سواری کا گھوڑا ایک اور دو اونٹ اس کے باپ کو دیئے اور اس بچی کو نجات دلائی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

تو نے بہت ہی بڑا کام انجام دیا ہے اور تیری جزا اللہ کے ہاں محفوظ ہے۔

فرزدق نے اپنے دادا کے اس کام پر فخر کرتے ہوئے کہا:

ومنا الذی منع الوائدات

فاحیا الوئید فلم توائد

اور وہ شخص ہمارے خاندان میں سے تھا جس نے بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے کے خلاف قیام کیا۔ اس نے لڑکیوں کو لے لیا اور انھیں زندگی عطا کی اور انھیں تہہ خاک دفن نہ ہونے دیا۔[2]

ابھی ہم اس مسئلے پر گفتگو تفصیلی کریں گے اور دیکھیں گے کہ اسلام نے کس طرح ان تمام قباحتوں، مظالم اور جرائم کو ختم کر دیا اور عورت کو ایک ایسا مقام بخشا کہ تاریخ میں جس کی نظیر نہیں ملتی۔

۲۔ عورت کے مقام کے احیاء میں اسلام کا کردار: عورت کی تحقیر و تذلیل اور اس کی حیثیت کی تباہی زمانۂ جاہلیت کے عربوں ہی میں نہ تھی بلکہ اس زمانے کی سب سے زیادہ متمدن قوموں کا بھی یہی حال تھا وہ عورت کو ایک حقیر وجود سمجھتے تھے اس سے زیادہ تر ایک متاع بازار کا سلوک کرتے تھے نہ کہ انسان کا سا۔ البتہ دور جاہلیت کے عربوں کے ہاں عورت کی تذلیل زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ وحشت ناک تھی یہاں تک کہ وہ نسب کو صرف مرد سے مربوط سمجھتے تھے اور عورت کو تو قبل پیدائش بچے کی پرورش کے لیے ایک ظرف شمار کرتے تھے۔ زمانہ جاہلیت کے اس شعر سے بھی ان کا یہ نظریہ ظاہر ہوتا ہے:

---

[1] جاہلیت و اسلام صفحہ ۶۳۲۔

[2] قاموس الرجال جلد ۵ ص ۱۲۵۔

Marfat.com

بنونا بنو ابناءنا و بناتنا

بنوھن ابناء الرجال الاباعد

ہمارے بیٹے توصرف ہمارے بیٹوں کے بیٹے ہیں۔ باقی رہے ہماری بیٹیوں کے بیٹے تو وہ تواور مردوں کے بیٹے ہیں۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ عورت کے لیے حق میراث کے قطعاً قائل نہ تھے اور تعدد ازواج کے لیے بھی کسی حد و حدود کے قائل نہ تھے وہ شادی اس آسانی سے کرلیتے جیسے پانی پیتے ہیں اور اسی آسانی سے طلاق دے دیتے تھے۔

اسلام نے ظہور کیا تو اس نے اس فضول اور بے ہودہ روش کے خلاف مختلف حوالوں اور طریقوں سے سخت جنگ کی۔ اسلام نے خاص طور پر بیٹی کی پیدائش کو ننگ و عار سمجھنے کے خلاف بہت جنگ کی ہے احادیثِ اسلامی میں کسی خاندان میں بیٹی کی پیدائش کو رحمتِ الٰہی کی آبشار جاری ہوجانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ رسولِ اسلامؐ خود اپنی بیٹی بانوئے اسلام فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا اس قدر احترام کرتے کہ لوگوں کو تعجب ہوتا آپ اپنے اس قدر بلند مقام و منزلت کے ہوتے ہوئے اپنی بیٹی کے ہاتھ چومتے، کسی سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے اپنی بیٹی فاطمہؑ سے ملنے جاتے اور اس کے برعکس جب کسی سفر کے لیے روانہ ہوتے تو آخری گھر جس میں خدا حافظ کہنے کے لیے آتے وہ فاطمہؑ ہی کا گھر ہوتا۔

ایک حدیث میں ہے:

جب رسول اللہؐ کو خبر دی گئی کہ خدا نے انھیں بیٹی عطا فرمائی ہے تو اچانک آپ نے اپنے اصحاب کے چہروں کی طرف دیکھا ان کے چہروں پر افسوس کے آثار نمایاں تھے (گویا زمانہ جاہلیت کی رسموں کے کچھ آثار ابھی ان کے دماغوں میں باقی تھے)۔

رسول اللہؐ نے فوراً فرمایا:

ما لکم ؟
ریحانة اشمھا ، و رزقھا علی اللہ عز وجل

تمھیں کیا ہوا؟
اللہ نے مجھے ایک مہکتا ہوا پھول دیا ہے میں جس کی خوشبو سونگھوں گا (رہی بات اس کی روزی کی تو) اس کا رزق خدا کے ذمہ ہے[1]

ایک اور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے، آپؐ نے فرمایا:

نعم الولد البنات ملطفات ، مجھزات مونسات مفلیات .

بیٹی کتنی اچھی ہوتی ہے، وہ محبت کرنے والی، مددگار، مونس و غم خوار اور پاک و پاک کنندہ

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۱۰۲۔

Marfat.com

ہوتی ہے [1]

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

من دخل السوق فاشتری تحفة فحملها الی عیاله کان کحامل الصدقة الی قوم محاویج و لیبدء بالاناث قبل الذکور، فانه من فرح ابنته فکانما اعتق رقبة من ولد اسمعیل.

جو شخص بازار جائے اور اپنے گھر والوں کے لیے کوئی تحفہ خریدے وہ اس شخص کی طرح ہے جو حاجت مندوں کی مدد کرے (اسے اس شخص کی سی جزا ملے گی) اور جب گھر آکر اسے بانٹنے لگے تو سب سے پہلے بیٹیوں کو دے اور پھر بیٹوں کو دے کیونکہ جو شخص اپنی بیٹی کو خوش کرے ایسے ہے گویا اس نے اولادِ اسماعیل میں سے کسی غلام کو آزاد کیا ہے [2]

درحقیقت عورت کو اسلام نے جو احترام عطا کیا ہے اسی کے سبب اسے معاشرے میں آزادی نصیب ہوئی اور اسی کے سبب عورتوں کی غلامی کا دور ختم ہوا۔

اس سلسلے میں اور بھی بہت سی کہنے کی باتیں ہیں جو متعلقہ آیات کی تفسیر میں بیان کی جائیں گی لیکن اس حقیقت کو یہاں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اب بھی اسلامی معاشروں میں دورِ جاہلیت کے آثار باقی ہیں ۔ اب بھی ایسے گھرانوں کی کمی نہیں جو لڑکے کی پیدائش پر تو خوش ہوتے ہیں لیکن لڑکی کی پیدائش پر افسردہ اور پریشان ہو جاتے ہیں یا کم از کم لڑکے کی پیدائش کو لڑکی پر ترجیح دیتے ہیں ۔

البتہ ہو سکتا ہے کہ معاشرے میں عورتوں کی کیفیت کے حوالے سے خاص قسم کے اقتصادی اور معاشرتی حالات ایسی غلط عادات و رسوم کا باعث ہوں لیکن کچھ بھی ہو تمام سچے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسے طرزِ فکر کو ختم کرنے کی جدوجہد کریں اور اس فکر کی معاشرتی اور اقتصادی بنیادوں کو اکھاڑ پھینکیں کیونکہ اسلام یہ بات پسند نہیں کرتا کہ چودہ صدیوں بعد اس کے پیروکار دورِ جاہلیت کے افکار و نظریات کی طرف پلٹ جائیں اور ایک نئے دورِ جاہلیت کا آغاز ہو جائے۔

حالت تو یہ ہے کہ مغرب کے معاشرے میں بھی جہاں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ عورت کے لیے اعلیٰ مقام کے قائل ہیں عملی طور پر اسے اس قدر ذلیل کیا گیا ہے کہ اس کی حیثیت ایک بے قیمت گڑیا، آتشِ شہوت کو خاموش کرنے والے وجود یا مال اسباب کے لیے ایک اشتہار سے زیادہ نہیں رہی [3]

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۵ ص ۱۰۰۔

[2] مکارم الاخلاق ص ۵۴۔

[3] یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ اتفاق سے یہ سطور ۲۰ جمادی الثانیہ سنہ ۱۴۰۴ھ کو لکھی جا رہی ہیں کہ جو بانوئے اسلام حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا روزِ ولادت ہے اور اسی دن کو اسلامی جمہوریہ ایران کی طرف سے "یوم خواتین" قرار دیا گیا ہے۔

Marfat.com

۶۱۔ وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ
وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○
۶۲۔ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ
لَهُمُ الْحُسْنٰى ۖ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ○
۶۳۔ تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ
اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○
۶۴۔ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ
وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

ترجمہ:

۶۱۔ اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے سزا دے تو مشیت زمین پر چلنے والا کوئی باقی نہ رہے لیکن وہ
ایک عرصے تک انھیں مؤخر کر دیتا ہے البتہ جب ان کی اجل آپہنچتی ہے تو پھر وہ نہ ساعت بھر تاخیر کرتے
ہیں اور نہ گھڑی بھر تقدیم کرتے ہیں۔
۶۲۔ وہ خدا کے لیے وہ کچھ قرار دیتے ہیں کہ جسے خود ناپسند کرتے ہیں (یعنی بیٹیاں) اس کے باوجود جھوٹ بولتے ہیں
کہ ان کا انجام نیک ہے۔ ناچار ان کے لیے آگ ہے اور وہ (آتش جہنم کی طرف) پیش قدمی
کرنے والے ہیں۔
۶۳۔ بخدا تجھ سے پہلے ہم نے امتوں کی طرف نبی بھیجے لیکن شیطان نے (ان امتوں کو) ان کے اعمال انھیں
سجا بنا کر دکھائے اور آج وہی ان کا ولی ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔
۶۴۔ ہم نے قرآن تجھ پر نازل نہیں کیا مگر اس لیے کہ جس امر میں وہ اختلاف کرتے ہیں تو ان سے بیان کردے

Marfat.com

اور یہ ان کے لیے ہدایت و رحمت ہے جو لوگ ایمان رکھتے ہیں۔

تفسیر :

خدا فوراً سزا کیوں نہیں دیتا ؟

گذشتہ آیات میں مشرکین عرب کے وحشت ناک جرائم اور قبیح بدعتوں کا ذکر ہے ان میں بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس موقع پر بعض ذہنوں میں یہ سوال ابھرے کہ ایسے ظالمانہ اقدامات پر خدا تعالیٰ فوری عذاب کیوں نہیں کرتا ؟

زیر نظر آیت اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہتی ہے ، اگر خدا لوگوں کو ان کے ظلم و گناہ پر سزا دے تو سطح زمین پر کوئی حرکت کرنے والا باقی نہ رہے (ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا من دابۃ[1])۔

"دابۃ" ہر قسم کے زندہ اور متحرک موجود کو کہتے ہیں یہاں ممکن ہے " علی ظلمھم " کے قرینے سے انسانوں کے لیے کنایہ ہو یعنی اگر خدا انسانوں کا ان ظلم کی وجہ سے مواخذہ کرے تو کوئی انسان سطح زمین پر باقی نہ رہے۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد زمین پر تمام حرکت کرنے والے اور چلنے پھرنے والے ہوں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ زمین پر چلنے والے جانور معمولاً انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں جیسا کہ قرآن کہتا ہے :

هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعًا

اللہ وہ ہے کہ جس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمھارے لیے پیدا کیا ہے۔

(بقرہ ـــــ ۲۹)

لہٰذا جب انسان ختم ہو جائیں تو دوسرے چلنے پھرنے والے جانداروں کے وجود کا فلسفہ بھی ختم ہو جائے گا ، اس لیے ان کی نسل بھی منقطع ہو جائے گی۔

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آیت کے مفہوم کی عمومیت اور وسعت کو دیکھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ زمین پر بسنے والے تمام انسان ظالم ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی ظلم کا مرتکب ہوا ہے اور اگر فوری سزا نافذ ہو تو کسی کا دامن نہیں بچے گا ـــــ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ نہ صرف انبیاء و مرسلین اس زمین پر موجود رہے ہیں کہ جو معصوم ہیں اور اس ظلم کے مصداق نہیں ہیں بلکہ ہر زمانے میں ایسے نیک پاک اور سچے مجاہدین رہے ہیں کہ جن کی نیکیاں یقیناً ان کی چھوٹی چھوٹی برائیوں سے زیادہ ہوتی ہیں اور جو ہرگز ایسی سزا کے مستحق نہیں ہوتے کہ جو نابود کر دے۔

---

[1] "علیھا" کی ضمیر " ارض " کی طرف لوٹتی ہے۔ اگرچہ پہلے اس کا ذکر نہیں آیا اور یہ مطلب کی وضاحت کے لیے ہے ، اس کی نظیر عربی ادب میں اور دیگر زبانوں کے ادب میں بہت ملتی ہے۔

Marfat.com

اس سوال کا جواب یوں دیا جا سکتا ہے ـــــــــــــ

آیت کا حکم نوعی ہے نہ کہ عمومی کہ جو سب کے لیے ہو۔

ایسے بیانات کی مثالیں عربی ادب میں اور دیگر زبانوں میں موجود ہیں یہ مشہور شعر ہم نے اکثر سنا ہے:

گر حکم شود کہ مست گیرند

در شہر ہر آنچہ ہست گیرند

اگر حکم ہو کہ جو بھی نشے میں ہو اسے پکڑ لیا جائے تو شہر میں کوئی بھی گرفتاری سے بچ نہ سکے۔

اسی طرح ایک اور شاعر کہتا ہے:

گفت باید حد زند ہشیار، مرد مست را

گفت ہشیاری بیار، اینجا کسی ہشیار نیست

اس نے کہا کہ جو ہوش میں ہے وہ اس مست شخص پر حد جاری کرے تو جواب ملا کہ پہلے کسی باہوش کو لے آؤ کیونکہ یہاں تو کوئی ہوش میں نہیں ہے۔

اس استثناء کی شاہد سورۂ فاطر کی آیہ ۳۲ ہے، اس میں ارشادِ الٰہی ہے:

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد و منھم سابق بالخیرات باذن اللہ ذٰلک ھو الفضل الکبیر۔

پھر ہم نے اپنے بندوں میں سے جنھیں چن لیا انھیں کتاب کا وارث بنایا اور انسانوں میں تین طرح کے لوگ ہیں ایک وہ جنھوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا، دوسرے وہ جو درمیانے سے ہیں اور تیسرے وہ کہ جو اذنِ الٰہی سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے والے ہیں اور یہ بڑے فضل کی بات ہے۔

یہ بات یقینی ہے کہ زیر بحث آیت میں جس عذاب کا ذکر ہے وہ سورۂ فاطر کی مذکورہ آیت کے بیان کردہ پہلے گروہ کے لیے ہے اور ایسے لوگوں کی چونکہ معاشروں میں کثرت ہوتی ہے لہٰذا آیت کے انداز میں عمومیت کوئی قابلِ تعجب بات نہیں ہے۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیت انبیاء کی عصمت کی نفی پر ہرگز دلالت نہیں کرتی اور جنھوں نے یہ خیال کیا ہے انھوں نے قرآن کی دیگر آیات اور کلام میں موجود قرائن کی طرف توجہ نہیں کی۔

اس کے بعد قرآن کہتا ہے: خدا سب ظالموں کو مہلت دیتا ہے اور اجل مسمّٰی (ایک معین زمانے) تک ان کی موت کو موخر کر دیتا ہے (ولکن یؤخرھم الی اجل مسمّٰی)۔

لیکن جب ان کی اجل آپہنچتی ہے تو پھر گھڑی بھر کی تاخیر ہوتی ہے نہ تقدیم (فاذا جاء اجلھم لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون)۔ بلکہ ٹھیک اسی لمحے موت انھیں دامن گیر ہو جاتی ہے اور لحظے کے لیے بھی آگے

Marfat.com

پیچھے نہیں ہوتی۔

اجل مسمّیٰ کیا ہے؟

"اجل مسمّیٰ" کے مفہوم کے بارے میں مفسّرین کی مختلف آراء ہیں البتہ قرآن حکیم کی دیگر آیات کہ جن میں سورۂ انعام کی آیت ۲ اور سورۂ اعراف کی آیہ ۳۴ شامل ہیں، پر نظر رکھی جائے تو اس سے مراد موت کا آنا ہی ہے یعنی خدا بندوں کو ان کی عمر کے آخر تک اتمام حجت کے لیے مہلت دیتا ہے کہ شاید ظالم اپنی اصلاح کی فکر کریں اور اپنے طرز عمل پر تجدید نظر کریں اور خدا، حق اور عدالت کی طرف پلٹ آئیں۔ جب مہلت کی یہ مدت ختم ہوجاتی ہے تو موت کا حکم جاری ہوجاتا ہے اور موت کے اسی لمحے سے سزا اور عذاب کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

"اجل مسمّیٰ" کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۵ ص ۱۳۲ (اردو ترجمہ) اور جلد ۶ ص ۱۴۲ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

اگلی آیت میں قرآن ایک مرتبہ پھر زمانہ جاہلیت کے عربوں کی بری رسموں کی مذمت کرتا ہے قبل ازیں بتایا جاچکا ہے کہ وہ خود بیٹیوں سے نفرت کرتے تھے جبکہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: ایک طرف تو وہ خود اپنے لیے بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں لیکن دوسری طرف خدا کے لیے ان کے قائل ہیں (و یجعلون للہ ما یکرھون)۔

یہ عجیب و غریب تناقض اور تضاد ہے سورۂ نجم کی آیہ ۲۲ میں ہے:

یہ ایک انتہائی ناپسندیدہ تقسیم ہے۔

فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ بیٹیاں اچھی چیز ہیں تو پھر تم کیوں بیٹی پیدا ہونے پر پریشان ہوجاتے ہو اور اگر یہ بری چیز ہے تو پھر خدا کے لیے اس کے قائل کیوں ہوتے ہو؟

اس کے باوجود ان کا غلط دعویٰ ہے کہ ان کا انجام نیک ہے اور جزائے خیر انھی کے لیے ہے (و تصف السنتھم الکذب ان لھم الحسنیٰ)۔

کس عمل کی وجہ سے وہ ایسی جزا کی توقع رکھتے ہیں کیا معصوم، بے گناہ بے چاری بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے پر یا پروردگار کی ساحت مقدس پر افتراء باندھنے پر؟

لفظ "حسنیٰ"، "احسن" کا مونث ہے اس کا معنی ہے نہایت عمدہ، بہت اچھا۔ یہاں بہترین جزا یا بہترین انجام کے معنی میں آیا ہے جس کی یہ مغرور اور گمراہ قوم اپنے تمام تر جرائم کے باوجود قائل تھی۔ اس صورت میں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب تو معاد اور قیامت پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے اس کے باوجود اس قسم کی باتیں کیوں کرتے تھے۔

اس سلسلے میں توجہ رہے کہ وہ سب کے سب مطلقاً معاد کے منکر نہیں تھے بلکہ معاد جسمانی کا انکار کرتے تھے۔ انھیں اس بات سے انکار تھا کہ انسان کو پھر سے مادی زندگی دی جائے گی وہ اس بات پر تعجب کرتے تھے علاوہ ازیں ممکن ہے یہ تعبیر "قضیۂ شرطیہ" کے طور پر ہو یعنی وہ کہتے تھے: بالفرض دوسرا جہان ہو تو ہمیں وہاں بہترین جزا ملے گی۔

Marfat.com

بہت سے ظالم وجابر، منحرف اور ہٹ دھرم افراد کی یہی طرزِ فکر ہے کہ خدا سے دُور ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو خدا سے بہت نزدیک سمجھتے ہیں اور انتہائی مضحکہ خیز دعوے کرتے ہیں۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "حسنیٰ" سے "نعمتِ حسنیٰ" یعنی بیٹے مراد ہیں کیونکہ وہ بیٹیوں کو بُرا اور منحوس سمجھتے تھے لیکن بیٹوں کو اچھا اور اعلیٰ نعمت جانتے تھے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ـــــــ اسی لیے بلا فاصلہ فرمایا گیا ہے: ناچاران کے لیے جہنم کی آگ ہے (لا جرم ان لهم النار) یعنی نہ صرف یہ کہ ان کی عاقبت بخیر نہیں بلکہ ان کا انجام کار جہنم کی آگ کے علاوہ کچھ نہیں اور وہ اسی آگ کی طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں۔ (وانهم مفرطون)۔

"مفرط" "فرط" (بروزن "فقط") کے مادہ سے آگے بڑھنے والے کے معنی میں ہے۔

ہوسکتا ہے زمانہ جاہلیت کے عربوں کی داستان سن کر بعض یہ سوال کریں کہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے جگر گوشہ کو اس بربریت کے ساتھ مٹی میں زندہ گاڑ دے۔ اس سلسلے میں اگلی آیت میں فرمایا گیا ہے: بخدا ہم نے تجھ سے پہلے امتوں کی طرف نبی بھیجے لیکن شیطان نے ان اُمتوں کے اعمال انھیں بہت بنا سنوار کر پیش کیے تھے (تالله لقد ارسلنا الی امم من قبلك فزين لهم الشيطان اعمالهم)۔

جی ہاں شیطان اپنے وسوسوں میں اتنا ماہر ہے کہ قبیح ترین اور بدترین جرائم کو بھی بعض اوقات انسان کے سامنے بہت خوبصورت بنا کر پیش کر دیتا ہے اور وہ اسے باعثِ فخر سمجھنے لگتا ہے جیسا کہ دورِ جاہلیت کے عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کو اپنے لیے سندِ افتخار جانتے تھے وہ اسے غیرت مندی کا مظاہرہ قرار دیتے اور قبیلے کی عزت و آبرو کی حفاظت کے نام پر اس فعل کی تعریف کرتے۔

بیٹی کو زندہ گاڑ دینے والا باپ کہتا:

> میں نے اپنی بیٹی کو اپنے ہاتھوں زیرِ خاک دفن کر دیا ہے تاکہ کل کو وہ کسی جنگ میں دشمن کے ہاتھ نہ لگے۔

ظاہر ہے ـــــــ جہاں ایسے شرمناک ترین اعمال شیطانی تزئین کے بعد ایسے پُرفریب ہو جائیں تو باقی کاموں کی حالت کیا ہوگی۔

آج بھی شیطانی تزئین کے ایسے نمونے بہت سے افراد کے اعمال میں نظر آتے ہیں۔ آج بھی چوری، غارت گری، تجاوز اور جرم کو مختلف پُرفریب نام دیے جاتے ہیں۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ دورِ حاضر کے مشرکین بھی ان گزشتہ امتوں کے انحرافی طرزِ عمل کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ شیطان نے جن کے اعمال کو خوبصورت بنا کر پیش کیا تھا آج بھی شیطان ان کا ولی، راہنما اور سرپرست ہے (فهو وليهم اليوم) اور یہ اسی کی راہنمائی میں قدم اٹھاتے ہیں۔ اسی بناء پر دردناک عذابِ الٰہی ان کے انتظار میں ہے (ولهم عذاب اليم)۔

Marfat.com

"فھو ولیھم الیوم" (آج شیطان ان کا ولی و سرپرست ہے) ——— اس جملے کی مفسرین نے مختلف پیرائے میں تفسیر کی ہے۔ شاید ان میں سے زیادہ واضح وہی ہے جو ہم کہہ چکے ہیں۔ یعنی یہ جملہ دور جاہلیت کے مشرکین عرب کی کیفیت واضح کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ انھوں نے بھی گزشتہ منحرف امتوں کے طرز عمل کی پیروی کی اور شیطان ان کا سرپرست ہے جیسے وہ گزشتہ گمراہوں کا سرپرست تھا۔[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ ابھی تک گزشتہ منحرف امتوں کے کچھ لوگ موجود ہیں اور وہ اپنے انحرافی طریقے کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور شیطان آج بھی پہلے کی طرح ان کا سرپرست ہے۔

زیر بحث آخری آیت میں بعثت انبیاء کا مقصد بیان کیا گیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ اگر قومیں اور ملتیں اپنی خود غرضیوں اور غلط طور طریقوں کو چھوڑ کر رہبری انبیاء سے وابستہ ہو جائیں تو ایسے خرافات، اختلافات اور عملی تضادات ختم ہو جائیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے قرآن تجھ پر صرف اس لیے نازل کیا ہے کہ وہ جس امر میں اختلاف رکھتے ہیں تو اسے ان پر واضح کر دے۔ (وما انزلنا علیک الکتٰب الا لتبین لھم الذی اختلفوا فیہ)۔ اور یہ قرآن ان لوگوں کے لیے باعث ہدایت و رحمت ہے جو ایمان رکھتے ہیں (وھدی ورحمة لقوم یؤمنون) شیطانی وسوسے ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے نفس امارہ اور شیطان صفت لوگوں کے پہنائے ہوئے پرفریب پردے حقائق کے چہرے سے ہٹا دیتا ہے۔ پس پردہ خرافات و جرائم کو واضح کر دیتا ہے خود غرضیوں نے جو اختلافات پیدا کر دیئے ہوتے ہیں انھیں ختم کر دیتا ہے۔ بربریتوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور ہر طرف ہدایت و رحمت کا نور پھیلا دیتا ہے۔

---

[1] لیکن اس تفسیر کا لازمی مطلب یہ ہے کہ "اعمالھم" اور "ولیھم" کی ضمیر میں معنی کے لحاظ سے فرق ہو پہلی ضمیر گزشتہ امتوں کے لیے ہو اور دوسری رسول اللہؐ کے زمانے کے مشرکین کی طرف اشارہ کرتی ہو۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے یہ جملہ مقدر مانا جا سکتا ہے۔

ھؤلاء یتبعون الامم الماضیة (غور کیجیے گا)

Marfat.com

۶۵۔ وَاللّٰہُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِہَا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّسْمَعُوْنَ ۝
۶۶۔ وَ اِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَۃً ؕ نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ۝
۶۷۔ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْہُ سَکَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

ترجمہ:

۶۵۔ اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا اور جب زمین مردہ ہو چکی تھی اسے پھر سے حیات بخشی اس میں اس قوم کے لیے واضح نشانی ہے جو سننے والے کان رکھتی ہے۔

۶۶۔ اور چوپایوں کے وجود میں تمھارے لیے عبرت (کے درس) ہیں۔ ان کے شکم کے اندر سے ہم تمھارے پینے کے لیے ہضم شدہ غذا اور خون میں سے خالص اور پسندیدہ دودھ فراہم کرتے ہیں۔

۶۷۔ کھجور اور انگور کے درختوں کے میووں سے شراب (ناپاک) اور اچھا رزق حاصل کرتے ہو۔ اس میں عقل و دانائی سے کام لینے والی قوم کے لیے روشن نشانی ہے۔

تفسیر:

پانی، پھل اور حیوانات

قرآن ایک مرتبہ پھر پروردگار کی گوناگوں نعمتوں کا تذکرہ کرتا ہے یہ دراصل توحید اور خداشناسی کے لیے ایک تاکید بھی ہے اور ساتھ ہی معاد کی طرف بھی اشارہ ہے۔ نیز ان نعمتوں کا تذکرہ بندوں کے احساسِ تشکر کو بیدار کرنے کے لیے بھی ہے اس طرح انھیں زیادہ قربِ الٰہی کے حصول کی طرف مائل کیا گیا ہے ان تینوں پہلوؤں پر نظر رکھی جائے تو ان آیات کا گذشتہ آیات سے تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف گذشتہ آیات میں سے آخری آیت قرآن کے نزول کے بارے میں تھی۔ وہ آیات کہ جو روحِ انسانی کے لیے

Marfat.com

حیات بخش ہیں اور زیرِ نظر پہلی آیت آسمان سے بارش کے نزول کے بارے میں ہے۔ اور بارش جسمِ انسانی کے لیے حیات بخش ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: خدا نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس طرح زمین کو جو مردہ ہو چکی تھی اسے حیاتِ تازہ بخشی (واللہ انزل من السماء ماءً فاحیابہ الارض بعد موتھا)۔

اس امر میں ان کے لیے عظمتِ الٰہی کی واضح نشانی ہے کہ جو سننے والے کان رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لآیۃ لقوم یسمعون)۔

آسمان سے بارش برسنے سے زمین کو جو حیاتِ نو ملتی ہے اس کا ذکر قرآن کی بہت سی آیات میں آیا ہے۔ بعض اوقات خشک سالی زمین کو اس طرح سے خشک، خاموش اور بے روح کر دیتی ہے کہ وہ بالکل بے کار اور بنجر ہو جاتی ہے یہاں تک کہ کسی کو یقین نہیں آتا کہ کبھی اس زمین پر بھی سرسبز کھیتیاں لہراتی رہی ہیں یا آئندہ کبھی اس کی کوکھ سے کوئی زندگی جنم لے گی ـــــ لیکن چند پے در پے بارشیں ہوتی ہیں اور پھر سورج کی حیات بخش شعاعیں اس میں حرکت پیدا کر دیتی ہیں گویا کوئی سو رہا تھا اور اب بیدار ہو گیا ہے یا زیادہ صحیح الفاظ میں کوئی مردہ تھا کہ جس میں بارش کے دمِ مسیحائی سے زندگی لوٹ آتی ہے اس میں طرح طرح کے پھل پھول اگنے لگتے ہیں۔ سبزے لہلہانا شروع کر دیتے ہیں۔ حشرات الارض اس پر رینگنے لگتے ہیں۔ پرندے اس میں چہچہانے لگتے ہیں اور جانور پھر سے اس کا رُخ کرنے لگتے ہیں اور اس طرح زمزمۂ حیات پھر سے گونج اٹھتا ہے۔

مختصر یہ کہ وہ زمین جو پہلے مردہ اور خاموش تھی اس میں ایسا غلغلہ جاگ اٹھتا ہے کہ انسان مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عالمِ آفرینش کا ایک شاہکار ہے یہ خالق کی قدرت و عظمت کی نشانی بھی ہے اور معاد و قیامت کے امکان کی دلیل بھی ہے اس سے کھلتا ہے کہ مُردے کس طرح دوبارہ لباسِ حیات زیبِ تن کرتے ہیں یہ خدا کی نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت بھی ہے ـــــ خصوصاً بارش ایک ایسی نعمت ہے کہ جس کے حصول کے لیے بندے کچھ بھی زحمت نہیں کرتے۔

پانی کہ جو پہلا رکنِ حیات ہے اس کے ذکر کے بعد چوپایوں کے وجود کی نعمت کی طرف اشارہ ہے اس سلسلے میں خصوصیت سے دودھ کا تذکرہ ہے کہ جو انتہائی مفید غذائی عنصر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اور چوپایوں کے وجود میں تمہارے لیے ایک بہت بڑا درسِ عبرت ہے (وان لکم فی الانعام لعبرۃ)۔

اس سے بڑھ کر عبرت کی بات کیا ہو گی کہ ہم تمہیں ان جانوروں کے شکم میں ہضم شدہ غذا اور خون کے درمیان میں سے تمہارے پینے کے لیے خالص اور عمدہ دودھ فراہم کرتے ہیں (نسقیکم مما فی بطونہ من بین فرث ودم لبناً خالصاً سائغاً للشّٰربین)۔

"فرث" لغت میں اس ہضم شدہ غذا کے معنی میں ہے کہ جو معدے کے اندر ہو اور جب وہ انتڑیوں تک پہنچتا ہے تو اس کا حیاتی مادہ بدن میں جذب ہو جاتا ہے اور اس کا پھوک اور فضلہ باہر نکل جاتا ہے اس فضلے کو "روث" (گوبر)

Marfat.com

کہتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ شکر کا کچھ مواد اور اسی طرح پانی وغیرہ کی کچھ مقدار معدے کی دیواروں کے ذریعے بدن میں جذب ہو جاتی ہے اور اس کا ایک اہم حصہ ہضم شدہ غذا کی صورت میں انتڑیوں کی طرف منتقل ہو کر خون میں داخل ہو جاتا ہے۔ نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ دودھ پستان کے اندر موجود خاص غدودوں سے نکلتا ہے اور اس کا اصلی مواد خون اور چربی ساز غدودوں سے لیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ سفید رنگ، صاف ستھرا اور خالص مادہ، یہ قوت بخش اور عمدہ غذا ہضم شدہ غذاؤں کے درمیان سے کہ جو فضلہ سے مخلوط ہیں اور خون کے بیچوں بیچ سے حاصل ہوتا ہے واقعاً یہ ایک عجیب و غریب چیز ہے۔ سرچشمہ اس طرح سے آلودہ اور تنفر آمیز لیکن ماحصل خالص، خوبصورت، دل انگیز اور عمدہ ——— دودھ۔

جانوروں اور ان کے دودھ کے ذکر کے بعد کچھ نباتات کی نعمت کا تذکرہ ہے ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے تمھیں کھجور اور انگور کی صورت میں پُر برکت غذا عطا کی ہے کبھی تم اسے نقصان دہ شکل میں ڈھال لیتے ہو اور اس سے شراب بناتے ہو اور کبھی اس سے پاک و پاکیزہ رزق حاصل کرتے ہو۔ (ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منه سکرًا ورزقًا حسنًا)

اس امر میں ان کے لیے قدرتِ پروردگار کی ایک اور نشانی ہے جو عقل و خرد رکھتے ہیں (ان فی ذلك لاٰیة لقوم یعقلون)۔

"سکر" کے اگرچہ لغت میں مختلف معانی ہیں۔ یہاں سکرات، مشروبات الکحل اور شراب کے معنی میں ہے اور یہی اس کا مشہور معنی ہے۔

واضح ہے اس آیت میں قرآن نے کھجور اور انگور سے شراب بنانے کی ہرگز اجازت نہیں دی بلکہ اس طرف توجہ کرتے ہوئے کہ "سکرًا" کو "رزقًا حسنًا" کے بالمقابل بیان کیا گیا ہے یہ دراصل شراب کی حرمت اور اس کے غیر مطلوب ہونے کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے لہٰذا اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم کہیں کہ یہ آیت حرمت شراب نازل ہونے سے پہلے کی ہے اور اس کے حلال ہونے کی طرف اشارہ ہے بلکہ اس کے برعکس آیت اس کے حرام ہونے کی طرف اشارہ کرتی ہے اور شاید یہ تحریم شراب کے لیے پہلا الارم ہے۔

درحقیقت ایک جملہ معترضہ کی صورت میں خدا چاہتا ہے کہ نعماتِ الٰہی سے سوءِ استفادہ کی طرف بھی اشارہ کرے۔

چند اہم نکات

۱۔ دُودھ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا ہے، قرآن مجید کہتا ہے: کہ دودھ "فرث" (معدے کے اندر ہضم شدہ غذا) اور "دم" (خون) کے درمیان سے نکلتا ہے۔

آج کی فزیالوجی (Physiology)[1] نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ جس وقت غذا معدے میں ہضم اور

---

[1] علم الاعضاء۔

Marfat.com

جذب کے لیے تیار ہوجاتی ہے تو معدے اور انتڑیوں کی سطح میں کئی ملین بالوں کی رگوں کے ساتھ ساتھ بہت پھیل جاتی ہے۔ مفید اور ضروری عناصر اُسے جذب کرکے اسے ایک جڑدار درخت تک پہنچاتے ہیں وہی جڑدار درخت کہ جس کی جڑیں پستان کی نوک میں جاکر جمع اور تمام ہوتی ہیں۔ ماں غذا کھاتی ہے تو اس کا نچوڑ خون میں داخل ہوجاتا ہے خون کی ان رگوں کی آخری شاخیں اور "جنین" کے گردشِ خون کا آخری مقام اور اس کی رگوں کی آخری شاخیں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہوتی ہیں جب تک بچہ شکمِ مادر میں ہوتا ہے اس طرح غذا ملتی رہتی ہے لیکن جب وہ ماں سے الگ ہوجاتا ہے تو غذا دینے والے قطب نما عقربہ کی نوک ماں کے پستان کی نوک کی طرف رُخ کرتی ہے اس حالت میں اب ماں کا خون نوزاد بچے کے خون تک نہیں پہنچ سکتا یہاں ایک تغیّر اور تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے اب ایک صاف شدہ محصول کی ضرورت ہوتی ہے جو بچے کے لیے گوارا اور مناسب ہو ایسے میں "فرث" اور "دم" کے درمیان میں سے دودھ پیدا ہوتا ہے ـــــ ماں جو کچھ کھاتی ہے اس سے "فرث" بنتا ہے اور پھر اس سے خون پیدا ہوتا ہے اور پھر ان دونوں کے درمیان میں سے دُودھ وجود میں آتا ہے۔

عجیب اتفاق ہے کہ دودھ کی ترکیب بھی "خون" اور "فرث" کی درمیانی سی ترکیب ہے یہ نہ صاف شدہ خون ہے نہ ہضم شدہ غذا۔ یہ "فرث" سے بالا اور خون سے پیچھے کی ایک چیز ہے۔ دودھ کے بعض عناصر خون میں نہیں ہوتے اور پستان کی غدود میں بنتے ہیں۔ مثلاً کازوئین ......

خون کے کچھ عناصر جو دودھ میں موجود ہیں وہ بغیر کسی تغیّر کے خون کے پلازما (Plasma) سے ترشح ہوکر دودھ میں داخل ہوتے ہیں مثلاً مختلف وٹامن، خوردنی نمک اور مختلف فاسفیٹ۔

کچھ اور مواد بھی خون سے حاصل ہوتا ہے مثلاً دودھ میں موجود شکر (Lactose) خون میں موجود شکر سے حاصل ہوتی ہے جو پستان کے عمل میں مددگار ہوتی ہے اور اس تغیر میں ایک اہم کردار کرتی ہے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں دودھ کی تولید نتیجہ ہے خون کے ذریعے جذب غذا کا اور خون کے پستانوں کی غدود سے براہِ راست تعلق کا، لیکن یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ "فرث" کی مخصوص بُو اور خون کا مخصوص رنگ دودھ میں منتقل نہیں ہوتے بلکہ یہ دودھ نئے رنگ اور نئی مہک کے ساتھ پستان کی نوک سے نکلتا ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ فزیالوجی کے ماہرین کہتے ہیں کہ پستان میں ایک لٹر دودھ پیدا ہونے کے لیے کم از کم پانچ سو لٹر خون کو اس حصے سے گزرنا چاہیے تاکہ ایک لٹر دودھ کے لیے درکار ضروری مواد خون سے حاصل کیا جاسکے جبکہ رگوں میں ایک لٹر خون پیدا ہونے کے لیے ضروری مقدار میں غذائی مواد کو انتڑیوں سے گزرنا پڑتا ہے یہ وہ مقام ہے کہ جہاں "من بین فرث و دم" (ہضم شدہ غذا اور خون کے درمیان میں سے) کا مفہوم پوری طرح واضح ہوتا ہے۔[1]

۲۔ دودھ ـــــ ایک اہم غذا۔ دودھ اہم حیاتین سے بھرپور ہے یہ اجزاء باہم مل کر ایک مکمل غذا بناتے ہیں۔

دودھ کے اجزاء یہ ہیں:۔

---

[1] کتاب "شیمی حیاتی و پزشکی" اور کتاب "اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر" جلد ۴ ص ۱، تا ص ۷۷۔

سوڈیم (Sodiam)، پوٹاشیم (Pot) کیلشیم (Calcium) میگنیشیم، کانسی، تانبا، آئرن، فاسفورس .....
آیوڈ (Iode) اور گندھک۔
اس کے علاوہ دودھ میں آکسیجن، ازاٹ (AzOTE) اور کاربانک ایسڈ کے اجزاء بھی موجود ہوتے ہیں۔ دودھ میں شکر کافی مقدار میں لکٹوز (Lactose) کی شکل میں ہوتی ہے۔
دودھ میں تحلیل شدہ وٹامن اے، بی، سی اور ڈی ہوتے ہیں۔ دورِ حاضر میں ثابت ہوچکا ہے کہ اگر جانور نے خوب چارہ چر لیا ہو تو اس کے دودھ میں ہر طرح کے وٹامن موجود ہوتے ہیں جن سب کی تفصیل اس کتاب میں نہیں آسکتی نیز اس مسئلے پر بھی تقریباً اتفاق ہے کہ دودھ ایک مکمل غذا ہے۔
شاید یہی وجہ ہے کہ ایک حدیث میں رسول اللہؐ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

لیس یجزی مکان الطعام والشراب الا اللبن
دودھ کے سوا کوئی چیز کھانے پینے کا مکمل نعم البدل نہیں ہے۔

نیز روایات میں ہے:

دودھ عقل انسانی کو بڑھاتا ہے، ذہنِ انسانی کو شفا بخشتا ہے، آنکھوں کی بینائی میں اضافے کا باعث بنتا ہے، نسیان کو ختم کرتا ہے، دل کو تقویت دیتا اور کمر کو مضبوط کرتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ آثار دودھ میں موجود حیاتین سے قریبی ربط رکھتے ہیں۔[1]

۳۔ **دودھ ایک خالص اور عمدہ غذا**:۔ زیرِ بحث آیات میں دودھ کو "خالص" اور "گوارا" غذا قرار دیا گیا ہے اور یہ بات پہلی نظر ہی میں ہر شخص کے لیے واضح ہے کہ دودھ کم حجم، پُرقوت اور اضافی مواد سے پاک ایک خالص غذا ہے اور ساتھ ہی یہ ہر سن و سال کے شخص کے لیے، بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے لیے نہایت گوارا، مفید اور مناسب ہے۔
انھی وجوہ کی بناء پر بہت سے بیمار اس غذا سے استفادہ کرتے ہیں خصوصاً ہڈیوں کی نشو و نما کے لیے اس کی بہت زیادہ تاثیر مانی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہڈی ٹوٹ جانے کی صورت میں اس کی سفارش کی گئی ہے۔
"خلوص" کا ایک معنی "پیوند" بھی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ اس قرآنی تعبیر کو ہڈی جوڑنے میں دودھ کے بہت مؤثر ہونے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں۔
یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ دودھ پلانے کے بارے میں جو اسلامی احکام وارد ہوئے ہیں ان میں یہ معنی وضاحت سے نظر آتا ہے۔
ہم دیکھتے ہیں کہ فقہا کہتے ہیں:

اگر بچہ کسی عورت کا اس قدر دودھ پیئے کہ اس کی ہڈی مضبوط ہوجائے اور گوشت اُگ آئے تو یہ اس عورت کا محرم اور رضاعی بیٹا ہوجائے گا۔

---

[1] کتاب "اولین دانش گاہ و آخرین پیامبر" جلد ۶ میں موجود دودھ کی بحث سے استفادہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

اسی طرح کا حکم اس عورت کے شوہر اور دیگر رشتہ داروں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔[1]

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ فقہاء کے نزدیک پندرہ مرتبہ پے در پے دودھ پینے سے یہاں تک کہ ایک شب و روز دودھ پینے پینے والا اس عورت کا محرم ہو جاتا ہے جس کا اس نے دُودھ پیا ہے۔

ان دونوں باتوں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو کیا اس کا یہ مفہوم نہیں ہو گا کہ چوبیس گھنٹے دودھ پینا بھی ہڈیوں کی تقویت اور گوشت لگنے کے لیے مؤثر ہے۔

اس نکتے کی یاد دہانی بھی ضروری ہے کہ اسلامی احکام میں پہلے دن کے دودھ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے یہاں تک کہ اسلام کی فقہی کتب میں بچے کی زندگی کو اس سے وابستہ سمجھا گیا ہے۔ اسی بناء پر بچے کو پہلا دودھ پلانا واجبات میں شمار کیا گیا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت موسٰی کے بارے میں سورۂ قصص کی آیہ ۷ میں ہے۔

وا وحینا الی ام موسٰی ان ارضعیہ فاذا خفت علیہ فالقیہ فی الیم

موسٰی کی ماں کو ہم نے وحی کی کہ اسے دودھ پلاؤ اور جب تمھیں اس کے بارے میں خوف لاحق ہو تو اسے دریا کی موجوں کے سپرد کر دو۔

---

[1] شرح لمعہ، کتاب نکاح احکام الاولاد و منہا الرضاع۔

Marfat.com

۶۸۔ وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ○

۶۹۔ ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ○

ترجمہ:

۶۸۔ تیرے پروردگار نے (نظامِ فطرت کے تحت) شہد کی مکھی کو وحی کی کہ پہاڑوں میں، درختوں میں اور جو عرشے لوگ بناتے ہیں ان میں گھر بنانا۔

۶۹۔ پھر تمام پھلوں میں سے کھا اور جو راستے تیرے پروردگار نے تیرے لیے معیّن کیے ہیں ان میں راحت سے چل پھر۔ ان کے بطن سے پینے کی ایک خاص چیز نکلتی ہے اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفاء ہے۔ اس امر میں اہلِ فکر و نظر کے لیے بڑی نشانی ہے۔

تفسیر:

شہد کی مکھی اور وحی الٰہی

یہاں قرآن کا لب و لہجہ بہت شگفت انگیز ہو گیا ہے نعماتِ الٰہی اور اسرارِ آفرینش کی بات جاری رکھتے ہوئے شہد کی مکھی اور پھر شہد کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے لیکن اس طرح سے کہ شہد کی مکھی خدا کی طرف سے مامور ہے ——— بتایا گیا ہے کہ رمز آمیز الہام و ہدایت کہ جسے "وحی" کا نام دیا گیا ہے کے تحت شہد کی مکھی مشغولِ کار ہے۔ ارشاد ہوتا ہے تیرے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ درختوں، پہاڑوں اور لوگوں کے بنائے ہوئے عرشوں اور مچانوں میں گھر بنا (واوحی ربك الی النحل ان اتخذی من الجبال بیوتاومن الشجر و مما یعرشون)۔

اس آیت میں چند قابلِ غور تعبیرات آئی ہیں:

۱۔ "وحی" کا مفہوم: جیسا کہ راغب مفردات میں کہتا ہے دراصل تیز اشارے کے معنی میں ہے بعد ازاں یہ لفظ مخفی طور پر کوئی بات القاء کرنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا لیکن قرآن مجید میں یہ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ان سب

Marfat.com

معانی کی بازگشت اسی اصل معنی کی طرف ہے قرآن کے مفاہیم میں ایک ——— وحی نبوت ——— سے زیادہ تر یہ لفظ قرآن میں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے، سورۂ شوریٰ کی آیت ۵۱ میں ہے:

وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیًا ......

انسان کے لیے ممکن نہیں کہ وہ طریقِ وحی کے سوا کسی طرح اللہ سے کلام کر سکے۔

نیز "وحی" الہام کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے یہ الہام خود آگاہ (انسانوں کے لیے) بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً

واوحینا الیٰ ام موسیٰ ان ارضعیه فاذا خفت علیه فالقیه فی الیم

اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی کی کہ اپنے نومولود کو دودھ پلا اور جب تجھے اس کے بارے میں دشمنوں کا خطرہ محسوس ہو تو اسے دریا کی لہروں کے سپرد کر دے (قصص ——— ۷)

اور یہ الہام ناآگاہ اور طبعی صورت میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ شہد کی مکھی کے بارے میں زیر بحث آیات میں مذکور ہے کیونکہ یہ بات مسلّم ہے کہ یہاں "وحی" حکم غریزہ یا طبیعت میں کوئی بات ڈال دینے کے معنی میں ہے اور یہ چیز خدا تعالیٰ نے مختلف جانوروں میں رکھی ہے۔

نیز "وحی" اشارے کے معنی میں بھی ہے جیسا کہ حضرت زکریاؑ کے واقعے میں ہے:

فاوحیٰ الیهم ان سبحوا بکرة و عشیًا

زکریا نے لوگوں کو اشارے سے کہا: صبح و شام اللہ کی تسبیح کرو۔ (مریم ——— ۱۱)

نیز مخفی طور پر خبر پہنچانے کے معنی میں بھی آیا ہے، جیسا کہ سورۂ انعام کی آیہ ۱۱۲ میں ہے:

یوحی بعضهم الی بعض زخرف القول غرورًا

انسانی اور غیر انسانی شیاطین مخفی طریقے سے پُرفریب اور گمراہ کن مطالب ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔

۲۔ **کیا طبعی الہام شہد کی مکھیوں سے مخصوص ہے؟** طبائع و غرائز یا طبعی الہام شہد کی مکھیوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ تمام جانوروں میں موجود ہے اس مقام پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر یہاں یہ تعبیر استعمال کیوں کی گئی ہے۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے وہ یہ کہ موجودہ زمانے میں جبکہ شہد کی مکھیوں کی زندگی کا سائنسدانوں نے نہایت دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے تو یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس عجیب و غریب جانور کا تمدن اور شگفت آمیز اجتماعی طرزِ حیات کئی حوالے سے انسان اور اس کی اجتماعی زندگی سے بڑھ کر ہے۔

گذشتہ زمانے میں اس کی عجیب و غریب زندگی کچھ تو واضح تھی لیکن عصرِ حاضر کی مانند اس کی زندگی کے ایک سے ایک بڑھ کر عجیب تر پہلو انسان کے سامنے نہ تھے۔ قرآن نے نہایت اعجاز آمیز انداز میں لفظ "وحی" کے ذریعے اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ یہ حقیقت واضح کرے کہ شہد کی مکھی کی زندگی کا ہرگز چوپایوں اور دیگر جانوروں کے ساتھ موازنہ نہیں کیا جا سکتا اس طرح سے قرآن چاہتا ہے کہ ہم اس عجیب جانور کی اسرار آمیز دنیا میں قدم رکھیں اس کے خالق کی عظمت و قدرت سے آشنا ہوں۔ اس آیت میں

Marfat.com

کلام کا لب و لہجہ بدلنے کا یہی راز ہے۔

۲۔ **شہد کی مکھی کا گھر:** آیت میں سب سے پہلے شہد کی مکھی کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اسے گھر بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے شاید پہلے اس بات کا ذکر اس لیے کیا گیا ہو کہ مناسب گھر زندگی کی پہلی ضرورت ہے باقی کاموں کی باری بعد میں آتی ہے یا ہوسکتا ہے یہ اس بناء پر ہو کہ مسدس کمروں کی شکل میں بنی ہوئی شہد کی مکھیوں کی عمارت جو شاید کئی ملین سالوں سے دنیا بھر میں یونہی بنتی چلی آرہی ہے، ان کی زندگی کی ایک عجیب ترین بات ہو[1] یہاں تک کہ یہ تعمیر خود شہد بنانے سے عجیب تر ہے۔ شہد کی مکھی کس طرح سے ایک خاص قسم کی موم تیار کرتی ہے اور کیسی عمدگی، نفاست اور صفائی سے پیمائش شدہ مسدسی کمرے بناتی ہے۔ بنیادی طور پر کسی ایک سطح سے اس طرح سے پورا استفادہ کرنا کہ اس کا کوئی حصّہ بےکار نہ رہ جائے یا اس کے زاویے اور کونے تنگ و تاریک نہ ہوں —— اس کے لیے مسدس شکل سے بہتر مساوی زاویوں کا کوئی اور انتخاب نہیں ہوسکتا علاوہ ازیں ایسے گھروں میں پائیداری بھی ہوتی ہے۔

۴۔ **گھر کا انتخاب:** جیسا کہ قرآن کہتا ہے ایسے گھر بعض اوقات پہاڑوں میں بنائے جاتے ہیں —— ناقابلِ عبور پتھروں کے درمیان ان کے ایسے خاص سوراخوں میں جو اس مقصد کے لیے بالکل مناسب ہوتے ہیں۔

کبھی شہد کی مکھیاں یہ گھر درختوں کی ٹہنیوں میں بناتی ہیں۔ اور گاہ ان گنبد نما جگہوں میں کہ جو لوگ ان کے لیے عرشوں کے اوپر بناتے ہیں۔

اس تعبیر سے ضمناً معلوم ہوتا ہے کہ شہد کا چھتہ پہاڑ، درخت اور عرشہ کی بلند جگہ پر ہونا چاہیے تاکہ وہ اس سے اچھی طرح فائدہ اٹھا سکیں۔

اس کے بعد شہد کی مکھی کی دوسری ذمہ داری بیان کی گئی ہے قرآن کہتا ہے: اس کے بعد ہم نے اسے یہ وحی کی کہ تو تمام قسم کے پھلوں میں سے کھا۔ (ثم کلی من کل الثمرات)۔ اور جو راستے تیرے رب نے تیرے لیے معیّن کیے ہیں ان میں بڑی راحت سے چل پھر۔ (فاسلکی سبل ربک ذللاً)۔

"ذلل" "ذلول" کی جمع ہے اس کا معنی ہے "ہموار" اور "تسلیم" یہ راستوں کی توصیف کے لیے آیا ہے اس لیے کہ یہ راستے اس باریک بینی کے ساتھ معیّن کیے گئے ہیں کہ شہد کی مکھیوں کے سامنے تسلیم اور ہموار ہیں اس سلسلے میں ہم بعد ازیں وضاحت کریں گے۔

آخر میں ایک نتیجے کی صورت میں ان کی ماموریت کا آخری مرحلہ بیان کیا گیا ہے: شہد کی مکھیوں کے اندر سے ایک خاص طرح کی پینے کی چیز نکلتی ہے کہ جو مختلف رنگ کی ہوتی ہے (یخرج من بطونها شراب مختلف الوانه)۔

---

[1] ابھی تک شہد کی مکھیوں کی ۴۵۰۰ اقسام دریافت ہوچکی ہیں لیکن یہ بات بڑی عجیب ہے کہ مہاجرت اختیار کرنے میں ان کا طرز عمل، شہد بنانا، پھولوں کا رس چوسنا اور کھانا سب کچھ ایک جیسا ہے۔ (اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر جلد ۵ ص ۵۵)

Marfat.com

یہ شراب حلال انسانوں کے لیے بڑی اہم شفابخش چیز ہے (فیہ شفاء للناس) ۔
شہد کی مکھیوں کی یہ زندگی انسان کے لیے غذا بھی مہیا کرتی ہے اور شفا بھی اور سبق آموز بھی ہے اس میں اہل فکر و نظر کے لیے عظمت و قدرت پروردگار کی واضح نشانی ہے (ان فی ذٰلک لاٰیۃ لقوم یتفکرون) ۔
اس آیت میں بھی چند پُر معنی اور قابلِ توجہ نکات ہیں ۔

چند قابلِ توجّہ نکات :

۱۔ شہد کس چیز سے بنتا ہے ؟ شہد کی مکھیاں عموماً شکر کا خاص مادہ جو پھولوں کی جڑوں اور ابتدائی حصّوں میں ہوتا ہے اسے چوستی ہیں اور اسے جمع کرتی ہیں لیکن ان مکھیوں کی شناخت رکھنے والے کہتے ہیں کہ مکھیاں پھولوں کے نیچے ابتدائی حصّوں میں موجود شکر سے ہی استفادہ نہیں کرتیں بلکہ بعض اوقات پھولوں کے تخمدانوں نیز توں اور پھلوں کے ابتدائی حصّوں سے بھی استفادہ کرتی ہیں، قرآن ان سب کو " من کل الثمرات " (سب پھلوں سے) تعبیر کرتا ہے ۔
ایک ماہر حیاتیات مسٹر مٹرلینگ اس سلسلے میں ایک عجیب بات کہتا ہے اس کی اس بات سے قرآنی تعبیر کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے وہ کہتا ہے :

> آج اگر شہد کی مکھی (پالتو ہو یا جنگلی جس قسم کی بھی ہو) ختم ہو جائے تو ہمارے ایک لاکھ قسم کے نباتات، پھول اور پھل نابود ہو جائیں اور کیا معلوم کہ اصلاً ہمارا تمدّن ہی ختم ہو جائے ۔[1]

اس نے یہ اس لیے کہا ہے کیونکہ نر پھولوں کے دانے بکھیرنے میں، مادہ پودوں کو حاملہ کرنے میں اور اس کے بعد پھلوں کی پرورش میں شہد کی مکھیوں کا کردار اس قدر عظیم ہے کہ بعض ماہرین کے نزدیک ان کا یہ کام شہد بنانے سے کہیں اہم ہے درحقیقت شہد کی مکھیاں جو کچھ ان سے کھاتی ہیں وہ بالقوہ طرح طرح کے پھل ہیں کہ جو ان کی مدد سے صورت پذیر ہوتے ہیں اس صورت میں دیکھا جائے تو " کل الثمرات " کی تعبیر کس قدر معنی خیز معلوم ہوتی ہے ۔
۲۔ ہموار اور مطیع راستے : مکھیوں کا علم رکھنے والے اپنی تحقیقات کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صبح کے وقت شہد کی مکھیوں کا ایک غول جو پھولوں کی پہچان پر مامور ہوتا ہے چھتے سے نکلتا ہے اور پھولوں سے بھری جگہوں کے بارے میں معلومات حاصل کر کے لوٹ آتا ہے اور دوسروں کو اطلاع فراہم کرتا ہے اس طرح سے ان کی سمت اور پروگرام کا تعین ہوتا ہے اور چھتے سے ان کا فاصلہ بھی دوسروں پر واضح ہو جاتا ہے ۔ شہد کی مکھیاں پھولوں کی جگہ تک پہنچنے کے لیے بعض اوقات اپنے راستے میں نشانیاں اور علامتیں مقرر کرتی ہیں وہ اپنے راستے میں مختلف قسم کی مہک پھیلا کر یا کسی اور طرح سے راستے کو معین کرتی ہیں اس کے باعث بہت کم امکان ہوتا ہے کہ کوئی مکھی راستے سے بھٹک جائے ۔
" فاسلکی سبل ربک ذللا " (اپنے رب کے راستوں پر چل پھر کہ جو تیرے لیے مطیع اور ہموار کیے گئے ہیں)۔

---

[1] اولین دانشگاہ و آخرین پیامبر جلد ۵ ص ۵۵۔

Marfat.com

یہ جملہ گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

۳۔ شہد کہاں بنتا ہے؟ شاید ابھی تک بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ شہد کی مکھیوں کا طریق کار یہ ہے کہ وہ پھولوں کا شیرہ چوس کر منہ میں جمع کر لیتی ہیں اور پھر چھتے میں سٹور کر دیتی ہیں حالانکہ معاملہ اس طرح نہیں ہے وہ پھولوں کا شیرہ اپنے بدن کے بعض خانوں میں بھیج دیتی ہیں ان خانوں کو مکھیوں کا علم رکھنے والے "پوٹ" کہتے ہیں۔ یہ جگہ دراصل ایک چھوٹے سے کیمیکل کارخانے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں پھولوں کے رس میں مختلف تغیرات اور تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور آخر کار یہ شہد کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پھر مکھی اس تیار شدہ شہد کو اپنے بدن سے باہر نکالتی ہے۔

یہ بات عجیب ہے کہ سورۂ نحل مکّی سورتوں میں سے ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مکّہ کے علاقے میں نہ پھل ہوتے ہیں نہ پھول اور نہ ہی شہد کی مکھیاں لیکن قرآن اس بارے میں اس عمدگی اور باریکی سے گفتگو کر رہا ہے اور انتہائی دلکش انداز میں شہد بنانے کی تفصیلات بیان کر رہا ہے۔ مثلاً

یخرج من بطونها شراب مختلف الوانه

شہد کی مکھیوں کے اندر سے مختلف رنگوں کا ایک مائع نکلتا ہے۔

۴۔ شہد کے مختلف رنگ: شہد کی مکھی جس رنگ کے پھل یا پھول پر بیٹھتی ہے اور اس کا رس چوستی ہے اس رنگ کے اعتبار سے شہد مختلف رنگوں کا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ شہد کبھی سیاہ قہووں کی طرح کا، کبھی چاندی کی سی سفیدی کے ساتھ، کبھی بے رنگ، کبھی زرد، کبھی شفاف، کبھی سیاہ، کبھی گولڈن، کبھی کھجور کی مانند یہاں تک کہ کبھی سیاہی مائل ہوتا ہے۔

رنگوں کا یہ تنوع شہد کے سرچشموں کے تنوع کو ظاہر کرنے کے علاوہ ذوق کے تنوع کا بھی غماز ہوتا ہے کیونکہ آج کے زمانے میں ثابت ہو چکا ہے کہ غذا کا رنگ انسان کی بھوک اور خواہش کو تحریک کرنے میں بہت ہی مؤثر ہوتا ہے۔ متقدمین بھی گویا اس نفسیاتی مسئلے کو پہچانتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی غذاؤں کو زعفران، ہلدی اور دوسرے رنگوں سے رنگین کرتے تھے تاکہ دیکھنے میں مہمانوں کو غذا اچھی لگے اور انھیں کھانے کے لیے تشویق پیدا ہو۔ غذا شناسی کی کتب میں اس ضمن میں بہت بحث کی گئی ہے کہ جسے تفسیر کی موجودہ حدود کے پیش نظر تمام تر نقل کرنا مناسب نہیں ہے۔

۵۔ شہد، غیر معمولی شفا بخش مادہ ہے: ہم جانتے ہیں کہ نباتات اور پھلوں میں حیات بخش دوائیں مخفی ہیں۔ آج بھی ہماری وسیع معلومات جڑی بوٹیوں اور نباتات میں دواؤں کی موجود صلاحیت کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں۔

یہ بات لائق توجہ ہے کہ سائنس دان تجربے کے ذریعے اس حقیقت تک پہنچے ہیں کہ شہد کی مکھیاں شہد بناتے وقت اس مہارت سے کام کرتی ہیں کہ نباتات میں موجود دواؤں کے خواص پوری طرح شہد میں منتقل کر دیتی ہیں جو اس میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہد اس زمین کے بہت سے نباتات اور پھولوں کے معالجاتی خواص کا زندہ ثبوت ہے۔

سائنس دانوں اور ڈاکٹروں نے شہد کے بہت زیادہ خواص بیان کیے ہیں۔ ان خواص کا تعلق علاج معالجے سے بھی ہے، احتیاطی تدابیر سے بھی اور حصولِ قوت سے بھی۔

شہد بہت جلد خون میں جذب ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ قوت بخش ہے اور خون بنانے میں نہایت مؤثر ہے۔

Marfat.com

شہد ــــــ معدے اور انتڑیوں میں بدبو پیدا ہونے سے بچاتا ہے۔
شہد ــــــ خشکی اور قبض کو دُور کرتا ہے۔
شہد ــــــ بے خوابی کے علاج کے لیے بہت مؤثر ہے۔ (بشرطیکہ تھوڑی مقدار میں پی جائے ورنہ اس کا زیادہ استعمال نیند کو کم کر دیتا ہے)۔
شہد ــــــ تھکان کو دُور کرنے اور پٹھوں کے کھنچاؤ کو دُور کرنے کے لیے اثر آفریں ہے۔
شہد ــــــ حاملہ عورتوں کو دیا جائے تو ان کے بچوں کے اعصاب قوی کر دیتا ہے۔
شہد ــــــ خون کے کیلشیم میں اضافہ کر دیتا ہے۔
شہد ــــــ کمزور ہاضمے کے لیے مفید ہے خصوصاً جن کے پیٹ میں ہوا بھر جاتی ہو اطباء ان کے لیے اسے تجویز کرتے ہیں۔
شہد ــــــ بدن کی تعمیر میں جلدی سے اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیتا ہے لہٰذا فوری طور پر انرجی پیدا کرتا ہے اور قوای پر اثر انداز ہوتا ہے۔
شہد ــــــ دل کو تقویت بخشتا ہے۔
شہد ــــــ جگر اور پھیپھڑوں کے علاج کے لیے ایک اچھی دوا ہے۔
شہد ــــــ جراثیم کش خاصیت کی بناء پر اسہال میں مبتلا افراد کے لیے مفید ہے۔
شہد ــــــ معدے اور انتڑیوں کے زخم کے علاج کے لیے مؤثر عامل شمار ہوتا ہے۔
شہد ــــــ گٹھیا (Rheumatism) پٹھوں کی بیماریوں اور عضلات کے نمو میں نقص کے علاج کے لیے مفید دوا ہے۔
شہد ــــــ کھانسی کے علاج کے لیے مؤثر ہے اور آواز کو صاف کرتا ہے۔
خلاصہ یہ کہ ــــــ شہد دوا کے طور پر اس قدر خواص رکھتا ہے کہ اس مختصر سی کتاب میں بیان نہیں کیے جا سکتے۔
علاوہ ازیں ــــــ
شہد ــــــ سے جلد کی لطافت، چہرے کی خوبصورتی، طول عمر کے لیے پُر تاثیر دوائیں بنتی ہیں۔
شہد ــــــ منہ زبان اور آنکھ کے ورم دور کرنے کے لیے فائدہ مند دوائیں تیار کرنے کے کام آتا ہے۔
شہد ــــــ جلد تھک جانے کے علاج کے لیے بننے والی دواؤں میں استعمال ہوتا ہے۔
شہد میں کئی ایک معدنیات اور وٹامن پائے جاتے ہیں مثلاً۔
آئرن (Iron)، فاسفورس (Phosphorout)، پوٹاشیم (Potasium)، میگنیشیم (Magnesium)، سیسہ (Lead)، تانبا (Copper)، سلفر (Sulpher)، نکل (Nickel)، کانسی (Bronze)، سوڈیم (Sodium) وغیرہ اس میں موجود ہیں۔
ان کے علاوہ اس میں گوند، پولن، لکٹک ایسڈ (Lactic Acid)، فارمک ایسڈ (Formic Acid)، سٹرک ایسڈ

Marfat.com

اور معطر روغن بھی اس میں موجود ہوتا ہے۔ Citric Acid ٹارٹارک ایسڈ Tartaric Acid

اس میں چھ طرح کے وٹامن پائے جاتے ہیں۔ اے، بی، سی، ڈی، کے اور ای۔ بعض کا خیال ہے کہ (پی۔ بی۔ وٹامن) بھی شہد میں ہوتے ہیں۔

شہد انسانوں کے علاج کے لیے بھی مفید ہے صحت کے استحکام کے لیے بھی اور خوبصورتی میں بھی خدمت گذار ہے۔

اسلامی روایات میں بھی دوا کی حیثیت سے شہد کی خاصیت کا بہت ذکر آیا ہے اس سلسلے میں حضرت امام علی علیہ السلام امام صادق علیہ السلام اور دیگر معصومینؑ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا:

ما استشفی الناس بمثل العسل

لوگوں کے لیے شہد کی سی شفا کسی چیز میں نہیں ہے [۱]

یہ بھی حدیث ہے۔

لم یستشف مریض بمثل شربة عسل

کسی مریض کے لیے شربتِ شہد سے بڑھ کر کوئی چیز شفا بخش نہیں ہے [۲]

کئی ایک روایات میں درد دل کے علاج کے لیے شہد کو تجویز کیا گیا ہے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:۔

من شرب العسل فی کل شهر مرة یرید ما جاء به القرآن عوفی من سبع و سبعین داء

جو شخص مہینے میں کم از کم ایک مرتبہ شربتِ شہد پئے اور خدا سے اس شفاء کا تقاضا کرے کہ جس کا قرآن میں ذکر ہے تو وہ اُسے ستر قسم کی بیماریوں سے شفا بخشے گا [۳]

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ہر حکم کے استثنائی مواقع بھی ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ چند ایک ایسے مواقع بھی ہیں کہ جن میں شہد کے استعمال سے منع کیا گیا ہے۔

۶۔ "للناس" یعنی انسانوں کے لیے: یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ مکھیوں کا علم رکھنے والے کہتے ہیں کہ شہد کی مکھی کی بھوک ختم کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ دو یا تین پھولوں کو چُوس لے جبکہ وہ ایک گھنٹے میں اوسطاً اڑھائی سو پھولوں پر بیٹھتی ہے اور کئی کلومیٹر کا سفر طے کرتی ہے اور اپنی مختصر سی عمر میں ڈھیر سارا شہد جمع کر لیتی ہے۔

بہرحال اس کی یہ تگ و تاز اور کارکردگی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ صرف اپنے لیے کام نہیں کرتی بلکہ جیسا کہ قرآن کہتا ہے

---

[۱]، [۲] وسائل الشیعہ جلد ۱۷ ص ۷۲ تا ص ۷۵۔

[۳] سفینۃ البحار، جلد ۲ ص ۱۹۰۔

Marfat.com

" للناس " (سب انسانوں کے لیے) کرتی ہے ۔

۷ ۔ شہد کے بارے میں دیگر اہم امور : موجودہ زمانے میں یہ نکتہ ثابت ہو چکا ہے کہ شہد کبھی بھی خراب نہیں ہوتا یعنی یہ ایسی غذا ہے جو ہمیشہ تازہ اور زندہ دستیاب رہتی ہے یہاں تک کہ اس میں موجود وٹامن کبھی ختم نہیں ہوتے ۔ ماہرین کے نزدیک اس کی وجہ اس میں پوٹاشیم کی فراواں موجودگی ہے ۔ کہ جو جراثیموں کو پیدا نہیں ہونے دیتی ۔ علاوہ ازیں اس میں ایسا مواد بھی موجود ہے جو بدبو پیدا ہونے سے روکتا ہے مثلاً اس میں فارمک ایسڈ (FORMIC ACID) موجود ہے لہٰذا شہد میں جراثیم کی پیدائش روکنے کی خاصیت بھی موجود ہے اور جراثیم کشی کی بھی ۔ قدیم مصری اسی بات کو جانتے ہوئے اپنے مُردوں کو مومیانے کے لیے اسے استعمال کرتے تھے ۔

شہد کو معدنیات سے بنے ہوئے برتنوں میں ذخیرہ نہیں کرنا چاہیے یہ وہ بات ہے جو ماہرین بتاتے ہیں اور جاذب نظر یہ ہے کہ قرآن شہد کی مکھیوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے :۔

من الجبال بیوتا و من الشجر و مما یعرشون

یعنی شہد کی مکھیوں کے گھر صرف پتھروں اور لکڑیوں میں ہوتے ہیں ۔

ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ شہد کو بطور دوا استعمال کرنے کے لیے اور صحت کے لیے اس کے خواص سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے ہرگز حرارت نہ پہنچائی جائے اور دوسری غذاؤں میں پکا کر اس سے استفادہ نہ کیا جائے ۔

بعض کا نظریہ ہے کہ قرآن نے شہد کے لیے جو " شراب " (پینے کی چیز) کی تعبیر استعمال کی ہے یہ اسی نکتے کی طرف اشارہ ہے کہ اسے پیا جائے ۔

نیز یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ شہد کی مکھی کا ڈنگ بھی معالجانہ خاصیت رکھتا ہے البتہ شہد کی مکھی اپنے لطیف مزاج کے باعث کسی کو ڈنگ نہیں مارتی ۔ یہ تو ہم ہیں جو اسے ڈنگ مارنے پر ابھارتے ہیں ۔

ایک عجیب بات یہ بھی ہے کہ شہد کی مکھی بدبو سے پریشان ہو جاتی ہے اگر کوئی شہد حاصل کرنے والا بدبودار ہاتھ، بدبودار لباس کے ساتھ چھتے کے قریب جائے تو اسے ضرور ڈستی ہے اگر اس نے پہلے کسی چھتے میں ہاتھ ڈالا ہوا اور غیر چھتے کی بُو اس کے ہاتھ میں لگی ہو تو دوسرے چھتے میں ہاتھ ڈالنے پر مکھیاں اس پر حملہ کر دیں گی ۔ لہٰذا ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے ہاتھ کو اچھی طرح دھولے ۔

البتہ شہد کی مکھی جب ڈنگ مارتی ہے تو خود مر جاتی ہے اس بناء پر ڈنگ مارنا اس کی ایک طرح کی خودکشی ہے ۔

مختلف بیماریوں کے علاج کے لیے شہد کی مکھی کے ڈنگ سے استفادہ کیا جاتا ہے مثلاً گٹھیا (RHEUMATISM)، ملیریا، درد اعصاب وغیرہ ۔ البتہ اس کے لیے اطباء کی راہنمائی کے مطابق استفادہ کرنا چاہیے ورنہ شہد کی مکھی کا ڈنگ خطرناک بھی ہو سکتا ہے چند ایک مکھیاں ڈس لیں تو عموماً قابلِ برداشت ہوتا ہے لیکن دو سو سے لیکر تین سو تک مکھیاں ڈس لیں تو بہت زہر پیدا ہو جاتا ہے اور دل کی تکلیف کا باعث بنتا ہے اور اگر پانچ سو کی تعداد تک مکھیاں ڈس لیں تو عملِ تنفس مفلوج ہو جانے اور موت کا احتمال بھی ہوتا ہے ۔

Marfat.com

۸۔ شہد کی مکھیوں کی عجیب و غریب زندگی: گزشتہ زمانے میں کم موجودہ زمانے میں بہت سے علماء و محققین کے پیہم مطالعات سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ شہد کی مکھیوں کی زندگی بہت ہی منظم ہوتی ہے ان کے ہاں بڑے سلیقے سے کام تقسیم ہوتا ہے بہت دقیق نظام کے تحت ذمہ داریاں بانٹی ہوئی ہوتی ہیں۔

شہد کی مکھیوں کا شہر بہت زیادہ پاک وصاف اور متحرک زندگی سے بھرپور ہوتا ہے ان کا شہر عام شہروں سے بہت مختلف ہوتا ہے یہ روشن اور درخشاں تمدن کا حامل ہوتا ہے۔ اس شہر میں خلاف ورزی کرنے والے اور کاہل افراد بہت کم نظر آتے ہیں اگر کبھی چھتے کے باہر کچھ مکھیاں سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بدبودار اور نقصان دہ پھولوں کا رس چوس آئیں تو چھتے کے دروازے پر ہی اس سے باز پرس ہوتی ہے۔ پھر ایک کھلی عدالت لگتی ہے اور اس مقدمے کے ضمن میں ان کے قتل کا حکم صادر ہوتا ہے۔

بلجیم کے ماہر حیاتیات مٹرلینگ نے شہد کی مکھیوں کے بارے میں بہت زیادہ مطالعہ اور تحقیق کی ہے اس نے ان کے شہر پر حکم فرما عجیب وغریب نظام کا گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

> ملکہ (یا زیادہ صحیح الفاظ میں چھتہ کی ماں) مکھیوں کے شہر کی ایسی حکمران نہیں جیسا ہم تصور کرتے ہیں بلکہ وہ بھی اس شہر کے دیگر باسیوں کی طرح یہاں کے نظام اور قوانین کی فرمانبردار ہوتی ہے۔
>
> ہمیں یہ علم نہیں کہ یہ نظام اور قوانین کہاں پر وضع ہوتے ہیں ہمیں انتظار ہے کہ شاید کسی دن اس بات کا ہمیں سراغ مل جائے اور ان قوانین کے بنانے والے کو ہم پہچان لیں لیکن فی الحال ہم اس قانون ساز کو "چھتے کی روح" کے نام سے پکارتے ہیں۔
>
> ہمیں معلوم نہیں کہ "چھتے کی روح" کہاں ہے اور شہر میں رہنے والے کس فرد میں حلول کیے ہوئے ہیں لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ چھتے کی روح پرندوں کے مزاج اور طبیعت سے مشابہ نہیں ہے نیز ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ چھتے کی روح شہد کی مکھیوں کا اندھا ارادہ اور عادت نہیں ہے "چھتے کی روح" شہر میں رہنے والے ہر فرد کو اس کی استعداد کے مطابق ذمہ داری سونپتی ہے اور ہر کسی کو کسی نہ کسی کام پر لگاتی ہے۔ "چھتے کی روح" "ماہر تعمیرات اور کاریگر مکھیوں کو حکم دیتی ہے کہ وہ گھر بنائیں" چھتے کی روح" معین دن اور معین لحظے میں شہر کے تمام باسیوں کو حکم دیتی ہے کہ شہر سے ہجرت کر جائیں اور نیا مسکن تلاش کرنے کے لیے اپنے آپ کو ان دیکھے حوادث اور مشقتوں کے حوالے کر دیں۔
>
> ہمیں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شہد کے قوانین جو "چھتے کی روح" کے ذریعے وضع ہوئے ہیں کس پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے ہیں کہ جس نے انھیں جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور کون ہے جو ایک معین دن چل پڑنے کا حکم صادر کرتا ہے۔

جی ہاں! چھتے میں مہاجرت کے یہ مقدمات اطاعتِ خدا میں فراہم ہوتے ہیں ——— وہی خدا کہ جس کے ہاتھ میں شہد کی مکھی کی تقدیر ہے[1]

[1] کتاب زنبور عسل (شہد کی مکھی) تالیف مٹرلینگ ص ۳۵، ص ۳۶۔

Marfat.com

مذکورہ دانش مند اپنی فکر و نظر میں موجود مکتب مادیت کے پرانے خیالات کی وجہ سے اس مسئلے پر اگر ابہام کے ساتھ گفتگو کرتا ہے تو ہماری نظر تو قرآن کی راہنمائی پر ہے ہم تو یہ بات اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ یہ آوازیں کہاں سے آتی ہیں یہ نظام کہاں تربیت پاتا ہے۔ یہ پروگرام کہاں بنتا ہے انھیں منظم کرنے والا کون ہے اور کون ان کے لیے حکم جاری کرتا ہے۔ قرآن کتنی خوبصورت تعبیر کہتا ہے۔

واوحی ربك الی النحل ......

تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی والہام کیا ......

کیا اس سے زیادہ رسا، جامع، منہ بولتی اور ناطق تعبیر کا تصور ہو سکتا ہے۔

شہد کی مکھیوں کے بارے میں جو کچھ بیان نہیں کیا جاسکا اگرچہ وہ بیان کیے جانے والے کی نسبت بہت زیادہ ہے لیکن ہماری طرز تفسیر اجازت نہیں دیتی کہ اس موضوع پر اس سے زیادہ گفتگو کریں[1]

لیکن جو کچھ ہم نے کہا ہے کیا یہی اہل فکر و نظر کے لیے عظمت پروردگار کا اندازہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے جی ہاں ضرور ہے۔

ان فی ذلك لاٰیۃ لقوم یتفکرون

بے شک اس میں صاحبانِ فکر کے لیے عظمت پروردگار کی نشانی ہے۔

---

[1] مندرجہ بالا مباحث میں شہد کی مکھیوں اور شہد کے خواص کے بارے میں ان کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ اولیں دانش گاہ و آخریں پیامبر

۲۔ زنبور عسل۔ تالیف مٹرلینگ

۳۔ شگفت ہائے عالم حیوانات

(دیگر ایرانی مصنفین کی کتابوں کے فارسی ترجمے سے استفادہ کیا گیا ہے وغیرہ اور ترجمے ہی کا نام یہاں دیا گیا ہے۔ مترجم)

Marfat.com

۷۰۔ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰکُمْ ۙ وَمِنْکُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰٓی اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِکَیْ
لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ۝

۷۱۔ وَاللّٰہُ فَضَّلَ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِیْنَ فُضِّلُوْا
بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰی مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَهُمْ فِیْهِ سَوَآءٌ ؕ
اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ ۝

۷۲۔ وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ
بَنِیْنَ وَحَفَدَةً وَّرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَ
بِنِعْمَتِ اللّٰہِ هُمْ یَکْفُرُوْنَ ۝

ترجمہ:

۷۰۔ اللہ نے تمھیں پیدا کیا پھر وہی تمھیں مارے گا تم میں سے بعض سخت بڑھاپے کو جا پہنچتے ہیں کہ علم و آگاہی کے بعد (ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ) کچھ نہیں جانتے (اور سب کچھ بھول جاتے ہیں) بلاشک خدا علیم و قدیر ہے۔

۷۱۔ خدا نے تم میں سے بعض کو بعض دوسروں پر رزق میں برتری دی ہے (کیونکہ تمھاری استعداد اور کوشش میں فرق ہے) لیکن جنھیں برتری دی گئی ہے وہ اس بات پر تیار ہیں کہ اپنی روزی میں سے اپنے غلاموں کو دیں تاکہ سب کے سب برابر ہو جائیں کیا وہ نعمتِ خدا کا انکار کرتے ہیں۔

۷۲۔ اور اللہ نے تمھارے لیے تمھاری ہم جنس بیویاں بنائیں اور ان بیویوں سے تمھیں پوتے نواسے اور بیٹے عطا کیے اور تمھارے لیے طیبات میں روزی قرار دی کیا پھر یہ باطل پر ایمان لے آتے ہیں اور نعمتِ خدا کا انکار کرتے ہیں۔

Marfat.com

تفسیر:

رزق میں اختلاف کا سبب

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی کچھ اہم نعمتوں اور عنایات کا تذکرہ تھا کچھ نباتات اور حیوانات کی تخلیق کا بیان تھا تاکہ لوگ ان پر نظر کرتے ہوئے ان سب نعمتوں اور اس دقیق نظام کے خالق سے آشنا ہوں۔

زیر بحث آیات بھی ایک اور حوالے سے خالق یکتا کے اثبات کے مسئلہ پر گفتگو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ آیات نعمتوں کے تغیرات کے حوالے سے بات کرتی ہیں۔ ایسے تغیرات کا ذکر ہے کہ جو انسانی اختیار سے باہر ہیں اور ان کا فیصلہ کسی اور کی جانب سے ہوا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اللہ نے تمھیں پیدا کیا (و اللہ خلقکم) اس کے بعد وہ تمھاری روح کو لے گا (ثم یتوفّٰکم)۔

زندگی بھی اسی کی طرف سے ہے اور موت بھی تاکہ تم جان لو کہ موت و حیات پیدا کرنے والے تم نہیں ہو لمبی عمر کا ہونا بھی تمھارے اختیار میں نہیں ہے بعض جوانی میں یا بڑھاپے کی سرحد پر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں لیکن "تم میں سے بعض لمبی عمر پاتے ہیں۔ عمر کے بدترین دور یعنی انتہائی بڑھاپے تک جا پہنچتے ہیں (و منکم من یرد الی ارذل العمر)۔[1]

اور اس طولانی عمر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم و آگاہی کے بغیر انھیں کچھ معلوم نہیں ہوتا اور وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں (لکی لا یعلم بعد علم شیئًا)۔[2]

بعینہٖ اس کی حالت بچپن کی سی ہو جاتی ہے کہ جب وہ بھول جاتا ہے اور نا آگاہ بھی تھا جی ہاں! "خدا آگاہ اور قادر ہے" (ان اللہ علیم قدیر)۔

---

[1] "ارذل" "رذل" کے مادہ سے پست، ناچیز اور حقیر شے کے معنی میں ہے "ارذل العمر" سے مراد بڑھاپے کا وہ دور ہے کہ جب ناتوانی اور نسیان انسان کو اس طرح سے آلے کہ وہ اپنی ابتدائی ضروریات بھی پورا نہ کر سکے اسی بنا پر قرآن اس مدت کو عمر کا غیر مطلوب حصہ قرار دیتا ہے بعض مفسرین اسے ۷۵ سال کی عمر سمجھتے ہیں۔ بعض ۹۰ اور بعض ۹۵ شمار کرتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ یہ کوئی معین عمر نہیں ہے بلکہ شخص شخص میں فرق ہوتا ہے۔

[2] لکی لا یعلم بعد علم شیئًا ——— ہو سکتا ہے عمر کے بالائی سالوں تک پہنچنے کا نتیجہ ہو۔ اس طرح اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ان سالوں میں انسان کے اعصاب اور دماغ تمرکز اور حافظے کی طاقت گنوا بیٹھتے ہیں اور انسان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ فراموشی اور بے خبری میں گھرا ہوتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ جملہ علت و سبب کے معنی میں ہو یعنی اللہ انھیں ان بالائی سالوں کی طرف لے جاتا ہے اس کی علت یہ ہے کہ ان پر حالتِ نسیان طاری کرے تاکہ یہ انسان جان لیں کہ ان کے پاس جو کچھ ہے کچھ بھی ان کی اپنی طرف سے نہیں ہے۔

Marfat.com

تمام قدرتیں اسی کے اختیار میں ہیں وہ جس قدر مصلحت سمجھتا ہے عطا کرتا ہے اور جس موقع پر ضروری سمجھتا ہے لے لیتا ہے۔

اگلی آیت میں یہی بات جاری ہے اور فرمایا گیا کہ تمھاری روزی تک تمھارے اختیار میں نہیں ہے۔ "یہ خدا ہے جو تم میں سے بعض کو رزق کے اعتبار سے دوسروں پر برتری دیتا ہے۔ (واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق)۔

لیکن جنھیں یہ برتری دی گئی ہے ان کی تنگ نظری کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ان کے اختیار میں ہے وہ اپنے غلاموں کو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور انھیں اپنے اموال میں شریک نہیں کرتے کہ وہ بھی ان کے برابر ہو جائیں (فما الذین فضلوا برادی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم فھم فیہ سواء)۔

بعض مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ یہ جملہ مشرکین کے بعض احمقانہ افعال کی طرف اشارہ ہے کہ جو اپنے بتوں اور خداؤں کے لیے اپنے چوپاؤں اور زرعی پیداوار کا ایک حصہ مختص کر دیتے تھے حالانکہ یہ بے وقعت پتھر اور لکڑیاں ان کی زندگی پر ذرہ بھر اثر نہیں رکھتے تھے لیکن وہ اس بات پر تیار نہ تھے کہ اس دولت میں سے کچھ اپنے بے چارے غلاموں کو دیں کہ جو رات دن ان کی خدمت کرتے تھے۔

کیا رزق کی تفریق عدالت پر مبنی ہے؟

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا لوگوں میں تقسیم رزق میں اختلاف پیدا کرنا اللہ کے اصولِ عدالت و مساوات کے مطابق ہے جبکہ اصولِ عدالت و مساوات کو انسانی معاشروں پر حاکم ہونا چاہیے۔

اس سوال کے جواب میں دو نکتوں کی طرف توجہ رکھنا چاہیے:

۱۔ اس میں شک نہیں کہ انسانوں میں موجود مادی فوائد وسائل اور آمدنی میں اختلاف کا ایک اہم حصہ ان کی استعداد اور صلاحیتوں میں اختلاف سے مربوط ہے۔ جسمانی اور روحانی صلاحیتوں کا فرق اقتصادی کارکردگی کی کمیت و کیفیت کا سرچشمہ ہے اسی سے بعض کا حصۂ رزق کم اور بعض کا زیادہ ہو جاتا ہے۔

البتہ اس میں بھی شک نہیں کہ بعض اوقات ایسے حوادث پیش آتے ہیں کہ جو ہمارے نزدیک اتفاقات ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے بعض لوگوں کو زیادہ نعمات میسر آجاتی ہیں لیکن انھیں استثنائی امور شمار کرنا چاہیے لیکن اکثر امور کی بنیاد وہی سعی و کوشش کی کمیت و کیفیت کا فرق ہے۔

البتہ ہماری مراد ایسے معاشرے سے ہے جو صحیح نہج پر قائم ہو جو ظالمانہ لوٹ کھسوٹ سے پاک ہو نہ کہ ایسا معاشرہ جو منحرف اور کج رو ہو اور جو قوانینِ آفرینش اور انسانی بنیادوں پر قائم نظام سے ہٹ گیا ہو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم بعض لوگوں کو بے وقعت اور بے دست و پا سمجھتے ہیں لیکن ان کے پاس بہت وسائل اور مال و دولت ہوتی ہے ہم اس پر تعجب کرتے ہیں لیکن اگر ہم ان کے جسم، روح اور اخلاق پر زیادہ غور و خوض کریں اور سطحی مطالعے پر مبنی فیصلہ ایک طرف کر دیں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی قوت رکھتے ہیں کہ جس کی وجہ سے وہ اس مقام پر پہنچے ہیں۔

ہم پھر یہ بات دہراتے ہیں کہ ہمارا موضوع بحث وہ صحیح و سالم معاشرہ ہے کہ جو ظالمانہ لوٹ کھسوٹ سے پاک ہو۔

Marfat.com

بہر حال آمدن اور وسائل کا یہ فرق صلاحیتوں کے فرق پر مبنی ہے اور یہ صلاحیتیں نعمات الٰہی ہیں البتہ ہو سکتا ہے کہ چند مواقع پر یہ اکتسابی ہوں۔

لیکن بعض مواقع یقیناً غیر اکتسابی ہوتے ہیں اور اس بناء پر ایک صحیح و سالم معاشرے میں بھی اقتصادی لحاظ سے آمدن کا فرق قابل انکار نہیں ہے سوائے اس کے کہ ہم سب لوگوں کو ہم شکل، ہم رنگ، ہم استعداد اور ہم قالب بنا سکیں۔ سب لوگ ایسے ہو جائیں کہ ان میں کسی قسم کا کوئی فرق باقی نہ رہے لیکن ایسا ممکن نہیں ہے۔

۲۔ انسان۔ درخت یا پھول کے کسی پودے کو دیکھیے کیا ممکن ہے کہ ان کے بدن کی متناسب عمارت اعضاء کے لحاظ سے مساوی ہو۔ کیا پودے کی جڑیں اس کے پھولوں کی نازک پتیوں جیسی ہو سکتی ہیں؟ کیا انسان کی ایڑی کی ہڈی اس کی آنکھ کی لطیف پتلی کے ہر لحاظ سے مساوی ہو سکتی ہے اور اگر ہم انھیں یکساں کر سکیں تو کیا آپ سمجھیں گے کہ ہم نے صحیح کام انجام دیا ہے۔

پُر فریب اور شعور سے عاری نعروں سے قطع نظر کر کے فرض کیجیے کہ ایک دن ہم ہر لحاظ سے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے خیالی انسان بنالیں پوری دنیا کو پانچ ہزار ملین (۵ ارب) ایسے انسان سے بھر دیں جو ہم شکل، ہم لباس، ہم ذوق، ہم فکر اور ہر لحاظ سے یکساں ہیں۔ کسی کارخانے سے نکلنے والے ایک ہی برانڈ کے سگرٹوں کی طرح۔ تو ذرا سوچیں کہ کیا اس روز انسانوں کو اچھی زندگی نصیب ہو جائے گی۔ مسلّم ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ دنیا ایک جہنم بن جائے گی۔ سب کے سب ایک مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ سب کے سب ایک ہی طرف چل پڑیں گے سب کے سب ایک ہی چیز چاہیں گے سب ایک ہی پوسٹ کے خواہش مند ہوں گے۔ سب ایک ہی قسم کی غذا چاہیں گے اور سب ایک ہی کام کرنا چاہیں گے۔ ظاہر ہے اس قسم کی زندگی بہت ہی جلد ختم ہو جائے گی اور فرض کریں کہ وہ باقی رہ جائے تو ایک تھکا دینے والی بے روح، بے کیف اور ایک ہی طرز کی زندگی ہو گی۔ ایسی زندگی جو موت سے زیادہ مختلف نہ ہوگی۔

لہٰذا صلاحیتوں کا اختلاف اور اس کے لوازم معاشرتی نظام کی بقا کے لیے ناگزیر ہے بلکہ ایسا ہونا استعداد و صلاحیت کی نشو و نما کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ پُر فریب نعروں سے اس حقیقت کو بدلا نہیں جا سکتا۔

لیکن ایسا نہ ہو کہ کوئی ہماری اس گفتگو کا یہ مطلب سمجھنے لگے کہ ہم طبقاتی معاشرے اور لوٹ کھسوٹ اور استعماری نظام کو قبول کرتے ہیں ——— نہیں ہرگز نہیں ——— ہماری مراد طبعی اور فطری اختلاف ہے نہ کہ مصنوعی ——— ہماری مراد وہ تفاوت اور فرق ہیں کہ جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہیں نہ کہ ایک دوسرے کی ترقی میں سدِ راہ اور ایک دوسرے پر تجاوز و ظلم کرنے والے۔

طبقاتی فرق (توجہ رہے کہ یہاں طبقاتی فرق سے مراد اس کا وہی اصطلاحی مفہوم ہے یعنی ایک لوٹ کھسوٹ کرنے والا طبقہ اور دوسرا جسے لوٹا جا رہا ہے) ہرگز نظام آفرینش سے مطابقت نہیں رکھتا۔ نظام خلقت سے ہم آہنگ استعداد اور کوشش کا فرق ہے اور ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ (غور کیجیے گا)

دوسرے لفظوں میں استعداد کے اختلاف کو اصلاح و تعمیر کے لیے استعمال ہونا چاہیے جیسے ایک بدن کے اعضاء کا اختلاف ہوتا ہے جیسے ایک پھول کے پودے میں مختلف حصّوں کا اختلاف ہوتا ہے ——— وہ اختلاف کہ جو ایک دوسرے کے

Marfat.com

مزاحم نہیں ہوتا بلکہ ایک دوسرے کا معاون ہوتا ہے۔ [1]

مختصر یہ کہ استعداد اور آمدن کے اختلاف سے طبقاتی معاشرہ پیدا کرنے کے لیے سوءِ استفادہ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی بناء پر زیر بحث آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ نعمتِ خدا کا انکار کرتے ہیں (افبنعمة الله یجحدون)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ یہ اختلافات فطرت کی صورت میں ہوں نہ کہ مصنوعی اور ظالمانہ صورت میں تو خدا کی نعمت ہیں اور انسان کے نظامِ معاشرہ کی حفاظت کے لیے ہیں۔

زیر بحث آخری آیت گزشتہ دو آیات کی طرح لفظ "الله" سے شروع ہوتی ہے اس میں نعماتِ الٰہی کا ذکر ہے اس میں انسان کی انفرادی قوت، انسان کے معاونین اور مددگاروں اور اسی طرح پاکیزہ رزق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس طرح ان تین آیتوں میں جن نعمتوں کا ذکر شروع ہوا ہے اس کی تکمیل ہو جاتی ہے یعنی بات زندگی اور موت کے نظام سے شروع کی گئی ہے پھر رزق اور استعداد میں فرق کا ذکر ہے کہ جو زندگی میں تنوّع کا باعث ہے اور آخری آیت میں نسل انسانی کے زیادہ ہونے اور پاکیزہ رزق کی طرف اشارہ ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے تمھاری نوع میں سے تمھارے لیے بیویاں بنائی ہیں (والله جعل لکم من انفسکم ازواجًا)۔ ——— وہ بیویاں کہ جو تسکینِ جسم و روح کی باعث بھی ہیں بقاءِ نسل کا ذریعہ بھی ——— اسی لیے ساتھ ہی اضافہ کیا گیا ہے: اور تمھاری بیویوں کے ذریعے تمھیں بیٹے، پوتے اور نواسے عطا کیے ہیں (وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدة)۔

"حفدة" "حافد" کی جمع ہے۔ دراصل اس کا معنی ہے وہ شخص جو کسی جزا کی توقع کے بغیر تعاون کرے لیکن زیر نظر آیت میں بہت سے مفسرین کے نظریے کے مطابق "حفدة" اس سے مراد پوتے اور نواسے ہیں، بعض اس سے مراد صرف نواسے لیتے ہیں اور بعض نے "بنین" سے چھوٹے بیٹے مراد لیا ہے اور "حفدة" سے بڑے بیٹے کہ جو مدد اور ہمکاری کر سکتے ہیں بعض نے "حفدة" سے مراد ہر طرح کے معاون و مددگار لیے ہیں چاہے وہ بیٹے ہوں یا کوئی اور۔ [2]

بہرحال اس میں شک نہیں کہ ہر شخص کے اردگرد بیٹوں، پوتوں اور نواسوں اور بیویوں کی صورت میں انسانی قوتوں کا وجود اس کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے ——— یہ روحانی لحاظ سے بھی مدد کرتے ہیں اور مادی لحاظ سے بھی۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: اللہ نے تمھیں پاکیزہ چیزوں میں سے رزق دیا ہے (ورزقکم من الطیبت)۔

"طیبات" کا یہاں وسیع مفہوم ہے اس میں ہر قسم کا پاکیزہ رزق شامل ہے چاہے وہ مادی پہلو سے ہو یا روحانی پہلو سے، انفرادی حوالے سے ہو یا اجتماعی حوالے سے۔

آخر میں اس بحث سے نتیجہ نکالتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کیا وہ خدا کی عظمت و قدرت کے یہ سب آثار دیکھنے کے

---

[2] اس صورت میں "حفدة" کا عطف "بنین" پر نہیں ہونا چاہیے بلکہ "ازواج" پر ہونا چاہیے یہ خلافِ ظاہر ہے۔ جبکہ ظاہر یہ ہے کہ یہ "بنین" پر ہی عطف ہے (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

باوجود اور اس کی جانب سے اپنے اوپر ہونے والی ان تمام نعمتوں کے باوجود بتوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں" کیا وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں (افبالباطل یؤمنون وبنعمت اللہ ھم یکفرون)۔ یہ ان کا کیسا غلط فیصلہ ہے اور کس قدر غلط طرزِ عمل ہے کہ وہ نعمتوں کے سرچشمے کو فراموش کر کے اس کے پیچھے جاتے ہیں کہ جو ان کی زندگی پر کچھ بھی اثر نہیں رکھتا اور ہر لحاظ سے "باطل" کا مصداق ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ **رزق کے اسباب اور سرچشمے:** جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اس میں شک نہیں کہ خداداد صلاحیتوں اور نعمتوں کے لحاظ سے انسان مختلف ہیں لیکن کامیابیوں کی اصل بنیاد انسان کی سعی و کوشش اور جدوجہد ہی ہے۔ زیادہ کوشش کرنے والے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور سست و کم کوش محروم رہتے ہیں۔

اسی بنا پر قرآن انسان کے نصیب کو اس کی سعی و کوشش سے مربوط قرار دیتا ہے اور صراحت سے کہتا ہے:

وان لیس للانسان الا ماسعٰی

یقیناً انسان کے لیے بس وہی کچھ ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے (نجم ــــــ ۳۹)

نیز اس کے ساتھ ساتھ تقویٰ، درست راستے کا انتخاب، امانتداری، نظام و قوانینِ الٰہی کی پاسداری اور عدل و انصاف کے اصولوں کے مطابق عمل بھی اس میں غیر معمولی اثر رکھتا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

ولو ان اھل القریٰ اٰمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض

اگر شہروں اور قصبوں کے باسی ایمان لے آئیں اور تقویٰ اختیار کریں تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیں۔ (اعراف ــــــ ۹۶)

نیز وہ فرماتا ہے:

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجًا ویرزقہ من حیث لا یحتسب

جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اسے رزق کی فراوانی عطا کرتا ہے اور جہاں سے اسے گمان نہیں ہوتا وہاں سے عطا کرتا ہے۔ (طارق ــــــ ۲،۲)

اسی بنا پر انفاق اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کو وسعتِ رزق کا وسیلہ قرار دیتے ہوئے خدا تعالیٰ فرماتا ہے:۔

ان تقرضوا اللہ قرضًا حسنًا یضاعفہ لکم

اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو یعنی اس کی راہ میں خرچ کرو تو وہ اسے کئی گنا کر دے گا۔
(تغابن ــــــ ۱۷)

شاید یاددہانی کی ضرورت نہ ہو کہ اجتماعی زندگی میں سے ایک فرد یا ایک گروہ کے چلے جانے سے سارے معاشرے کو نقصان پہنچتا ہے۔ اسی لیے فرد کی نگہداری اور مدد کرنا سارے معاشرے کے لیے فائدہ مند ہے (اس مسئلے کے معنوی اور

Marfat.com

انسانی پہلوؤں سے قطع نظر بھی بے فائدہ ہے)۔

خلاصہ یہ کہ معاشرے کے اقتصادی نظام پر تقویٰ، درست روی، پاکیزگی، امداد باہمی ایک دوسرے سے تعاون اور اتفاق کے اصول کارفرما ہوں تو وہ طاقت ور اور سربلند ہوگا۔

لیکن اس کے برعکس معاشرے میں لوٹ کھسوٹ، دھوکا دہی، غارتگری، تجاوز اور دوسروں کو نظرانداز کر دینے کا عمل جاری ہو تو وہ اقتصادی لحاظ سے پس ماندہ رہے گا اور اس کی مادی زندگی بھی پراگندگی اور انتشار کا شکار ہو جائے گی۔

اسلامی روایات میں حصولِ رزق کے لیے سعی و کوشش پر زور دیتے ہوئے اسے تقویٰ کے ساتھ ہونے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے یہاں تک کہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: ۔ لاتکسلوا فی طلب معایشکم فان آبائنا کانو یرکضون فیہا ویطلبونہا

حصولِ رزق میں سستی سے کام نہ لو۔ کیونکہ ہمارے آباؤ اجداد اس راہ میں دوڑتے تھے اور اسے طلب کرتے تھے[1]

ان ہی امامِ بزرگوار سے منقول ہے:

الکاد علی عیالہ کالمجاھد فی سبیل اللہ

جو شخص اپنے اہل و عیال کے تلاش رزق کو نکلتا ہے وہ مجاہدِ راہِ خدا کی طرح ہے[2]

یہاں تک کہ حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان صبح سویرے جتنی جلدی ہو سکے اپنے گھروں سے نکلیں اور اپنی زندگی کے لیے سعی و کوشش کریں[3]

وہ اشخاص کہ جن کی دعا قبول نہیں ہوتی ان میں وہ افراد بھی شامل ہیں جن کا جسم صحیح و سالم ہو مگر وہ گھر میں پڑے رہتے ہوں اور کشائشِ رزق کے لیے صرف دعا کرتے رہتے ہوں۔

یہاں یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پھر بہت سی روایات میں یہ کیوں کہا گیا ہے کہ روزی خدا کے ہاتھ میں ہے اس کے حصول کے لیے کوشش کرنے کی مذمت کی گئی ہے۔

اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل دو نکات کی طرف توجہ کرنا چاہیے:

۱۔ اسلامی مصادر میں غور و خوض کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ ہو یا کوئی اور، جو آیات و روایات ابتدائی نظر میں ایک دوسرے سے متضاد نظر آتی ہے دراصل ان میں سے ہر ایک مسئلے کے ایک پہلو کے بارے میں ہوتی ہے جبکہ دوسرے پہلوؤں سے غفلت کے باعث تضاد کا شک گذرتا ہے۔

وہ مقام کہ جہاں لوگ دنیا پر ریجھ جاتے ہیں ان کا حرص بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ مادی دنیا کی زرق برق زندگی کے

---

[1] وسائل جلد ۱۲ ص ۴۸۔

[2] وسائل جلد ۱۲ ص ۴۳۔

[3] وسائل جلد ۱۲ ص ۵۰۔

Marfat.com

پیچھے لگ جاتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے کسی جُرم اور زیادتی سے نہیں چوکتے وہاں پیہم تاکیدی احکام کے ذریعے انھیں اس دنیا کی ناپائیداری اور دنیاوی مال وجاہ کی بے وقعتی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جبکہ وہ مقام کہ جہاں کچھ لوگ زہد و تقویٰ کے بہانہ سے کام اور سعی و کوشش سے ہاتھ کھینچ لیتے ہیں وہاں انھیں محنت، کام کاج اور کوشش کی اہمیت یاد دلائی گئی ہے۔

دراصل سچے رہبروں کا یہی طرزِ عمل ہونا چاہیے کہ وہ افراط سے بھی مناسب طریقے سے روکیں اور تفریط سے بھی۔

جن آیات و روایات میں تاکید کی گئی ہے کہ رزق خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس نے ہر شخص کا حصّہ معین کیا ہوا ہے ——— درحقیقت یہ حرص وطمع، دنیا پرستی اور بے اصول و بے حد دولت سمیٹنے سے روکنے کے لیے ہے اور ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان کے نشاطِ کار کے ولولوں کو ختم کر دیا جائے۔ اور ایک آبرومندانہ، خود کفایت اور اپنے قدموں پر کھڑی زندگی کی جدوجہد کو ختم کر دیا جائے۔

اس حقیقت کی طرف توجہ کرتے ہوئے ان روایات کی تعبیر واضح ہو جاتی ہے کہ جن میں کہا گیا ہے کہ بہت سی روزیاں ایسی ہیں کہ اگر تم ان کے پیچھے نہ جاؤ تو وہ تمھارے پیچھے آئیں گی۔

۲۔ توحیدی نقطۂ نگاہ سے کائنات کو دیکھا جائے تو ہر چیز خدا کی طرف منتہی ہوتی ہے اور ایک خدا پرست سچا موحد کسی چیز کو اپنی طرف سے نہیں سمجھتا بلکہ اس تک جو بھی نعمت پہنچتی ہے اس کا سرچشمہ خدا ہی کو جانتا ہے وہ کہتا ہے۔

بیدك الخیر انك علی کل شیءٍ قدیر

ہر طرح کی نیکی اور خیر کی کلید تیرے ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قادر اور توانا ہے

(آلِ عمران ——— ۲۶)

اس لحاظ سے ایک حقیقی توحید پرست کو ہر موقع پر اس حقیقت کی طرف متوجہ رہنا چاہیے یہاں تک کہ اس کی سعی و کاوش، فکر اور آلات و اسباب پیداوار بھی دراصل خدا ہی کی طرف سے ہیں۔ اس کی نگاہِ لطف لمحہ بھر کے لیے پھر جائے تو سب کچھ ختم ہو جائے۔

خدا پر ایمان رکھنے والا ایک شخص جب کسی سواری پر سوار ہوتا ہے تو کہتا ہے:

سبحان الذی سخر لنا ھٰذا

پاک ہے وہ خدا کہ جس نے اسے ہمارے لیے مسخر کیا ہے۔

وہ جب کوئی نعمت پاتا ہے تو زمزمۂ توحید اس کے ہونٹوں سے نکلتا ہے:

و ما بنا من نعمۃ فمنك

ہمارے پاس جو بھی نعمت ہے بار الٰہا! تیری طرف سے ہے۔

یہاں تک کہ انسانوں کی نجات کے لیے جب کوئی قدم اٹھاتا ہے تو پیروئ انبیاء میں کہتا ہے:

و ما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت و الیہ انیب

میری توفیق صرف اللہ کی طرف سے ہے، میں نے اسی پر توکّل کیا ہے اور میں اسی کی طرف پلٹتا ہوں (ہود ۸۸)

Marfat.com

لیکن ان تمام مباحث میں جو چیز مسلّم ہے وہ یہ ہے کہ تلاشِ رزق کو نکلنا چاہیے۔ سعی و کوشش کرنا چاہیے اور اس کے لیے مثبت اور اصلاحی راستہ اختیار کرنا چاہیے ـــــــ وہ راستہ کہ جو ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہو۔

رہی اس روزی کی بات کہ جو انسان کو بغیر کوشش کے مل جاتی ہے تو وہ فرعی مسئلہ ہے نہ کہ اساسی اور بنیادی۔ شاید اسی بناء پر حضرت علی علیہ السلام نے اپنے کلمات قصار میں پہلے درجے میں اس رزق کا ذکر فرمایا ہے کہ انسان جس کے لیے نکلتا ہے اور اس کے بعد اس رزق کا جو خود انسان کے پیچھے آتا ہے۔

یا بن آدم! الرزق رزقان، رزق تطلبہ و رزق یطلبک

اے ابن آدم! رزق دو قسم کا ہوتا ہے ایک وہ کہ جس کی تلاش میں تو نکلتا ہے اور دوسرا وہ کہ جو تیری تلاش میں آتا ہے۔[2]

۲۔ **دوسروں سے برابری کا سلوک:** زیر نظر آیات میں بہت سے انسانوں کی تنگ نظری اور بخل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: فرمایا گیا ہے کہ وہ اس بات کے لیے تیار نہیں کہ ان کے اختیار میں جو بہت سی نعمتیں دی گئی ہیں وہ اپنے زیردست افراد کو بخشیں البتہ وہی لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو انبیاء اور ہادیان الٰہی کے تربیتی مکتب کے تربیت یافتہ ہیں۔

ان آیات کے ضمن میں کئی ایک روایات میں مساوات اور مواسات کی تاکید کی گئی ہے۔ تفسیر علی بن ابراہیم میں اس سلسلے میں ہے:

لا یجوز للرجل ان یخص نفسہ بشیء من المأکول دون عیالہ

کسی انسان کے لیے جائز نہیں کہ اپنے لیے گھر میں مخصوص غذا رکھے اور وہ کچھ کھائے کہ جس سے اس کے گھر والے محروم رہیں۔[3]

نیز حضرت ابوذرؓ سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے سنا:

انما ہم اخوانکم فاکسوہم مما تکسون، و اطعموہم مما تطعمون، فما رُؤی عبدہ بعد ذٰلک الا و ردائہ ردائہ، و ازارہ ازارہ، من غیر تفاوت

جو افراد تمہارے زیردست اور ماتحت ہیں وہ تمہارے بھائی ہیں جو کچھ خود پہنتے ہو انھیں پہناؤ اور جو کچھ خود کھاتے ہو انھیں کھلاؤ۔

رسول اللہؐ کی اس وصیت کے بعد ابوذر کا طرزِ عمل اپنے ماتحت افراد سے یہ تھا کہ ان کا لباس ان کے اپنے لباس سے بالکل مختلف نہ ہوتا تھا۔[4]

---

[1] کتبِ دعا میں اس جملے کا ذکر نماز عصر کی تعقیبات میں کیا گیا ہے۔

[2] نہج البلاغہ، کلمات قصار ص ۳۷۹۔

[3] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۶۸۔

[4] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۶۸۔

Marfat.com

مذکورہ روایات اور اسی طرح خود زیر بحث آیت کہ جو کہتی ہے " فھم فیہ سوآءٌ " (بس وہ اس میں مساوی ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نصیحت کرتا ہے کہ تمام مسلمان اسلامی اخلاق کے طرز عمل کے طور پر اپنے گھر کے تمام افراد اور اپنے ماتحت افراد سے حتی الامکان مساوات کریں اور برابری کا سلوک کریں گھریلو ماحول اور اپنے ماتحت افراد میں اپنے لیے کوئی امتیاز نہ برتیں ۔

Marfat.com

۷۳۔ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۚ○

۷۴۔ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

ترجمہ:

۷۳۔ وہ خدا کو چھوڑ کر کچھ ایسے موجودات کی پرستش کرتے ہیں کہ جو آسمانوں اور زمین میں سے ان کے رزق کے مالک نہیں ہیں اور یہ کام جن کے بس کا نہیں۔

۷۴۔ لہٰذا اللہ کے لیے امثال (اور شبیہ) کا عقیدہ نہ رکھو کیونکہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تفسیر:

خدا کے لیے شبیہ کا عقیدہ نہ رکھو:

گذشتہ آیات میں توحید کے بارے میں گفتگو تھی اب زیر بحث آیات میں مسئلہ شرک کے بارے میں بات کی گئی ہے سرزنش وملامت کے لہجے میں فرمایا گیا ہے: وہ خدا کو چھوڑ کر ایسے موجودات کی پرستش کرتے ہیں کہ جو آسمان وزمین میں سے ان کی روزی کے مالک نہیں ہیں اور اس سلسلے میں ان کا ذرہ بھر بھی کوئی اثر نہیں (ويعبدون من دون الله ما لا يملك لهم رزقًا من السمٰوٰت والارض شيئًا)۔

نہ صرف یہ کہ اس سلسلے میں وہ کسی چیز کے مالک نہیں بلکہ خلق وایجاد اور ان پر دسترسی کی طاقت نہیں رکھتے (ولا يستطيعون)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ مشرکین اس لیے بتوں کی پوجا پاٹ کرتے تھے کہ ان کا خیال تھا کہ یہ ان کی زندگی اور نفع ونقصان میں کوئی اہم کردار ادا کرتے ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں رزق کا مسئلہ انسانی زندگی کے اہم ترین مسائل میں سے ہے چاہے وہ آسمان سے (بارش کے حیات بخش قطروں اور سورج سے زندگی بخش شعاعوں کی صورت میں) ہو یا وہ زمین سے نکلنے والا ہو اس میں سے کچھ بھی بتوں کے اختیار میں نہیں وہ تو بے اہمیت اور بے قیمت موجودات ہیں کہ جن کا اپنا کوئی ارادہ نہیں ہوتا یہ تو صرف خرافات اور جہالت پر مبنی تعصبات ہیں کہ جنھوں نے انھیں اہمیت دے رکھی ہے۔

Marfat.com

درحقیقت "لایستطیعون" "لا یملکون" (وہ کسی چیز کے مالک نہیں) کی دلیل ہے اس لیے کہ وہ ان کی خلقت یا حفاظت کی ذرہ بھر قدرت بھی نہیں رکھتے۔

اگلی آیت میں نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اب جبکہ ایسا ہے تو پھر تم خدا کی کسی مثل، شبیہ اور نظیر کے قائل نہ ہو (فلا تضربوا للہ الامثال) کیونکہ خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (ان اللہ یعلم و انتم لا تعلمون)۔

بعض مفسرین کا کہنا ہے کہ "فلا تضربوا للہ الامثال" زمانہ جاہلیت کے مشرکین کی ایک منطق کی طرف اشارہ ہے (ہمارے زمانے کے بعض مشرکین بھی یہ بات کرتے ہیں) وہ کہتے تھے کہ اگر ہم بتوں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس لائق نہیں کہ خدا کی پرستش کریں لہٰذا ہمیں بتوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے کہ جو اس کے مقرب بارگاہ ہیں۔ خدا ایک عظیم شہنشاہ کی طرح ہے کہ وزراء اور خواص ہی اس سے رابطہ کر سکتے ہیں اور عام لوگ جن کی اس بادشاہ تک رسائی نہیں وہ بادشاہ کے قریبی خواص اور مقربین کے پیچھے ہی لگیں گے۔

اس قسم کی قبیح اور غلط منطق بہت خطرناک ہے بعض اوقات بڑے انحرافی انداز میں اسے خوب صورت بنا کر پیش کیا جاتا ہے قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے:

خدا کے لیے مثالیں بیان نہ کرو۔

یعنی ایسی مثال اس کے لیے پیش نہ کرو جو محدود افکار اور ممکن موجودات کے حوالے سے ہو اور نقائص سے معمور ہو کیونکہ ایسی مثال اس سے مناسبت نہیں رکھتی تم اگر اس امر کی طرف توجہ رکھتے کہ تمام موجودات اللہ کے احاطہ وجودی میں ہیں اور اس کے غیر متناہی لطف و رحمت کے سایے میں ہیں اور وہ خود تم سے تمہاری نسبت زیادہ نزدیک ہے تو کبھی بھی وسائط و وسائل کی طرف متوجہ نہ ہوتے۔

وہ خدا جو براہِ راست اپنے سے راز و نیاز اور گفت گو کی دعوت دیتا ہے اور جس نے اپنے گھر کے دروازے شب و روز تمہارے لیے کھول رکھے ہیں اسے کسی جابر و متکبر بادشاہ سے تشبیہ نہیں دینا چاہیے کیونکہ یہ بادشاہ تو محل نشین رہتے ہیں اور گنتی کے چند افراد کے سوا کوئی ان کے محل میں نہیں جا سکتا (فلا تضربوا للہ الامثال)۔

صفاتِ خدا کی بحثوں میں ہم اس نکتے کی طرف خصوصی طور پر متوجہ ہوتے ہیں کہ صفاتِ الٰہی کی شناخت کی راہ میں تشبیہ کا مسئلہ نہایت خطرناک ہے یعنی اس کی صفات کو بندوں پر قیاس کرنا اور ان سے مشابہ قرار دینا کیونکہ خدا ہر لحاظ سے ایک لامتناہی وجود ہے اور دوسرے ہر لحاظ سے محدود وجود ہیں لہٰذا ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل ہمیں اس کی ذات سے دور لے جائے گی۔ یہاں تک کہ جہاں ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اس کی ذاتِ مقدس کو نور یا اس قسم کی چیز کے ساتھ تشبیہ دیں وہاں بھی ہمیں متوجہ رہنا چاہیے کہ ایسی تشبیہات بہر حال ناقص اور نارسا ہیں اور صرف کسی ایک پہلو سے قابلِ قبول ہیں نہ کہ ہر پہلو سے (غور کیجیے گا)۔ جبکہ بہت سے لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور زیادہ تر تشبیہ و قیاس کی گمراہ کن وادیوں میں گھر جاتے ہیں، اور حقیقتِ توحید سے بہت دور جا پڑتے ہیں لہٰذا قرآن بار بار بیدار کرتا ہے اور تنبیہ کرتا ہے کبھی کہتا ہے:

Marfat.com

ولم یکن له کفوًا احد

کوئی چیز اس کے ہم پلہ اور اس کی مثل نہیں۔ (اخلاص ۴)

کبھی کہتا ہے:

لیس کمثله شیء

کوئی شے اس کی مانند و مثل نہیں ہے۔ (شوریٰ ۱۱)

کبھی فرماتا ہے:

فلا تضربوا لله الامثال

یہ دراصل اسی حقیقت کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ہے اور شاید "ان الله یعلم وانتم لا تعلمون" (خدا جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) اسی مسئلے کی طرف اشارہ کر رہا ہو کہ عام طور پر لوگ صفاتِ الٰہی کے اسرار سے بے خبر ہیں۔

Marfat.com

۷۵۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ
مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۭ هَلْ يَسْتَوٗنَ ۭ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○
۷۶۔ وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ
عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ
بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ
عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ع
۷۷۔ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ
اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

ترجمہ:

۷۵۔ خدا نے مثال بیان کی ہے اس مملوک غلام کی جس کی قدرت میں کوئی چیز نہیں اور اس (باایمان) انسان کی جسے اچھا رزق بخشا گیا ہے اور وہ چھپ کر اور آشکارا اس عطائے خدا میں خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں برابر ہیں۔ حمد و شکر خدا کے لیے ہے لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

۷۶۔ اور اللہ نے دو افراد کی (ایک اور) مثال بیان کی ہے کہ جن میں سے ایک مادر زاد گونگا ہے کہ جو کچھ نہیں کر سکتا اور اپنے ساتھی پر بوجھ ہے اسے جس کام کے لیے بھی بھیجا جائے اچھا عمل انجام نہیں دیتا کیا ایسا شخص اس انسان کے برابر ہے جو عدل و انصاف سے فیصلہ کرتا ہے اور راہِ مستقیم پر قائم ہے۔

۷۷۔ آسمانوں اور زمین کا غیب اللہ کے لیے ہے (اور وہی سب کچھ جانتا ہے) اور قیامت کا معاملہ اس کے لیے بالکل پلک جھپکنے یا اس سے بھی معمولی کام کی طرح ہے (کیونکہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)۔

Marfat.com

تفسیر:

مومن اور کافر کے لیے مثالیں:

گذشتہ آیات میں ایمان و کفر اور مومنین و مشرکین کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر نظر آیات میں دو زندہ اور روشن مثالوں کے ذریعے ان کی حالت کو واضح کیا گیا ہے۔

پہلی مثال میں مشرکین کو اس غلام مملوک سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا اور مومنین کو غنی و بے نیاز انسان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو اپنے وسائل سے سب کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ غلام مملوک کا ذکر بطور مثال کرتا ہے کہ جس کے بس میں کچھ بھی نہیں (ضرب الله مثلاً عبداً مملوكاً لایقدر علی شیء)۔ نہ تکوین میں اس کی کوئی قدرت ہے اور نہ تشریع میں۔ کیونکہ ایک طرف وہ ہمیشہ اپنے آقا کی قید میں ہوتا ہے اور ہر لحاظ سے محدود ہوتا ہے اور دوسری طرف اسے اپنے مال میں (وہ بھی اگر ہو تو) کوئی حق تصرف نہیں ہوتا اور اسی طرح اپنی ذات سے متعلق دیگر امور میں بھی وہ آزاد نہیں ہوتا۔

جی ہاں ــــــــ بندوں کا غلام اور بندہ ہونے کا نتیجہ قید اور ہر لحاظ سے محدودیت کے سوا کچھ نہیں۔

جبکہ اس کے مقابلے میں آزاد انسان کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے رزقِ حسن اور طرح طرح کی روزی اور پاکیزہ نعمتیں میسر ہوں (ومن رزقنٰه منا رزقاً حسناً)۔

ان آزاد انسانوں کے پاس بہت سے وسائل ہیں کہ جن سے وہ چھپ چھپا کر بھی اور اعلانیہ بھی خرچ کرتے ہیں اور انفاق کرتے ہیں (فھو ینفق منه سراً و جھراً)۔

کیا یہ دونوں افراد برابر ہیں (ھل یستوٗن)۔

مسلّم ہے کہ ایسا نہیں ہے لہٰذا" تمام حمد اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ (الحمد لله)۔

وہ اللہ کہ جس کا بندۂ آزاد قدرت مند بھی ہے اور عطا کرنے والا بھی ــــــــ جبکہ بتوں کے بندے ناتواں، محدود، بے قدرت اور قیدی ہیں" لیکن ان (مشرکین) میں سے اکثر نہیں جانتے (بل اکثرھم لایعلمون)[1]

اس کے بعد ایک اور مثال بتوں کے بندوں اور سچے مومنین کے بارے میں بیان کی گئی ہے بتوں کے بندوں کو مادر زاد گونگوں سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو غلام اور ناتواں بھی ہیں اور سچے مومنین کو اس آزاد انسان سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جو قوتِ گویائی رکھتا ہے

---

[1] جو تفسیر ہم نے بیان کی ہے اس کے مطابق مذکورہ بالا مثال مومن اور کافر کے لیے ہے لیکن بعض مفسرین نے اس تشبیہ کے لیے ایک اور احتمال ذکر کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ بتوں کو مملوک غلام سے خدا کو اس آزاد مومن سے تشبیہ دی جائے کہ جو صاحب نعمات ہے اور اس میں سے خرچ کرتا ہے۔
لیکن یہ بات بہت بعید معلوم ہوتی ہے۔

Marfat.com

ہمیشہ عدل وانصاف کی دعوت دیتا ہے اور صراطِ مستقیم پر قائم ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے دو اشخاص کی مثال دی ہے ان میں سے ایک مادر زاد گونگا ہے اور کچھ اس کے بس میں نہیں (و ضرب اللہ مثلاً رجلین احدھما ابکم لا یقدر علی شیء)[1] وہ غلام ہونے کے باوجود اپنے مولا و آقا کے لیے بوجھ ہے (و ھو کل علی مولٰہ)۔ یہی وجہ ہے کہ "اسے جس کام کے لیے بھی بھیجا جائے وہ اچھا کام انجام نہیں دے سکتا (اینما یوجھہ لا یأت بخیر)۔

گویا اس میں چار منفی صفات ہیں:

۱۔ وہ مادرزاد گونگا ہے۔

۲۔ بالکل ناتواں ہے۔

۳۔ اپنے مالک کے لیے بوجھ ہے اور

۴۔ جب اسے کسی کام کے لیے بھیجا جائے تو کوئی مثبت اقدام نہیں کر پاتا۔

یہ چار صفات اگرچہ ایک دوسرے کی علت و معلول ہیں مگر ایک انسان کی منفی حالت کی سو فی صد تصویر کشی کرتی ہیں کہ جس کے وجود سے کوئی خیر و برکت حاصل نہیں ہوتی اور جو معاشرے اور اپنے خاندان پر بوجھ ہے۔

کیا ایسا شخص اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے کہ جو فصیح و گویا زبان رکھتا ہے اور ہمیشہ عدل و انصاف کی دعوت دیتا رہتا ہے اور صاف راستے اور سیدھی راہ پر قائم ہے۔ (ھل یستوی ھو ومن یأمر بالعدل وھو علی صراط مستقیم)۔

یہاں اگرچہ دو ہی صفات بیان ہوئی ہیں ——

ایک مسلسل عدل و انصاف کی صورت اور

دوسری طرزِ مستقیم اور صحیح راستہ کہ جو ہر قسم کے انحراف سے پاک ہو۔

لیکن —— یہ دونوں صفات دوسری صفات کو واضح کرتی ہیں وہ شخص کہ جو ہمیشہ عدل و انصاف کی دعوت دیتا ہے، کیا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک گونگا، بزدل اور بے وقعت انسان ہو۔ ہرگز نہیں ایسا شخص —— زبان گویا، منطق محکم ارادہ قوی اور شجاعت و شہامت کا حامل ہوگا۔

وہ شخص کہ جو راہِ مستقیم پر گامزن ہو —— کیا وہ بے دست و پا، ناتواں، بے ہوش اور کم عقل انسان ہو سکتا ہے؟ —— ہرگز نہیں —— مسلّم ہے کہ وہ ایک صاحبِ فکر و نظر، صاحبِ کاوش و جستجو، باہوش، باتدبیر اور بااستقامت

---

[1] راغب مفردات میں کہتا ہے کہ "ابکم" اس شخص کے معنی میں ہے جو مادر زاد گونگا ہو جبکہ "اخرس" ہر طرح کے گونگے کو کہتے ہیں۔ لہذا

کل ابکم اخرس ولیس کل اخرس ابکم

ہر "ابکم" "اخرس" ہوگا جبکہ ہر "اخرس" "ابکم" نہیں ہوگا۔

اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ کبھی یہ لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو عقلی کمزوری کی وجہ سے بات کرنے سے عاجز ہو۔

Marfat.com

شخص ہوگا ۔

ان دونوں کا موازنہ کیا جائے تو بُت پرستی اور خدا پرستی میں وسیع فرق واضح ہوجاتا ہے اور ان دونوں نقطہ ہائے نظر اور مکاتبِ فکر کے تحت تربیت پانے والوں کا فرق بھی واضح ہوجاتا ہے ۔

عام طور پر ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن توحید کے بیان اور شرک کے خلاف گفتگو کو معاد اور قیامت کی عظیم عدالت کے مسائل سے مربوط کر دیتا ہے یہاں بھی ایسی ہی صورتِ حال ہے گزشتہ اور زیر بحث آیات شرک کی نفی اور اثباتِ توحید کے بارے میں ہیں اب گفتگو کا رُخ معاد کی طرف ہو رہا ہے اور مشرکین کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے ۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے : اللہ آسمانوں اور زمین کے غیبی امور سے آگاہ ہے ۔ (و للہ غیب السمٰوٰت و الارض) ۔

گویا یہ اس اعتراض کا جواب ہے کہ جو معادِ جسمانی کے منکر کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم جس وقت مر جائیں گے اور ہماری خاک کے ذرّے اِدھر اُدھر بکھر جائیں گے تو کیسے ان کا علم ہوگا کہ وہ ہمیں جمع کر سکے ۔ علاوہ ازیں ، وہ کہتے ، اگر فرض کریں ہمارے جسموں کے بکھرے ہوئے ذرات جمع بھی ہو جائیں اور ہمیں پھر سے زندگی بھی مل جائے ان جسموں کے بھولے بسرے ہوئے اعمال سے کون آگاہ ہوگا اور کون ان کے نامۂ اعمال کی پڑتال کرے گا ۔

زیر بحث آیت ایک ہی جملے میں اس سوال کے تمام پہلوؤں کا جواب دیتی ہے کہ خدا آسمانوں اور زمین کے غیب کو جانتا ہے ، وہ ہر جگہ ہمیشہ حاضر ہے لہٰذا اصولی طور پر غیب و پنہاں کا اس کے لیے کوئی مفہوم ہی نہیں ۔ اس کے لیے تمام چیزیں شہود ہیں

یہ مختلف تعبیرات تو ہمارے وجود کے حساب سے ہیں اور ہماری منطق سے ہم آہنگ ہیں ۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے : قیامت کا معاملہ تو پلک جھپکنے یا اس سے بھی کم تر سطح پر آسان ہے (وما امر الساعۃ الا کلمح البصر او ھو اقرب)[۱]

یہ درحقیقت منکرینِ معاد کے دوسرے اعتراض کی طرف اشارہ ہے وہ کہتے تھے کہ یہ کام تو انتہائی مشکل ہے ، کون اسے انجام دینے کی قدرت رکھتا ہے ؟

قرآن ان کے جواب میں کہتا ہے : تمھاری طاقت بہت کم ہے اس لیے تمھیں یہ کام مشکل دکھائی دیتا ہے لیکن خدا کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں اس کے لیے یہ کام آسان سا ہے جیسے تمھارا پلک جھپکنا آسان سا بھی ہے اور تیزی سے انجام بھی پا جاتا ہے

یہ بات جاذبِ نظر ہے کہ قیامِ قیامت کو پلک جھپکنے یا جلدی سے کسی چیز کو دیکھنے سے تشبیہ دے کر مزید فرمایا گیا ہے او ھو اقرب (یا اس سے بھی نزدیک تر) یعنی نظر بھر دیکھنے اور پلک جھپکنے کی تشبیہ بھی تنگیٔ بیان کی وجہ سے ہے یعنی قیامت اس تیزی سے برپا ہوگی کہ اس کے لیے مدت اور زمانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو یہ " کلمح البصر " کہا گیا ہے یہ بھی اس لیے ہے

---

[۱] " لمح " (بروزن " مسح ") اصل میں بجلی چمکنے کے معنی میں ہے بعد ازاں ایک اچٹتی نگاہ ڈالنے کے معنی میں استعمال ہونے لگا ۔ ضمناً توجہ رہے کہ یہاں " او " " بل " کے معنی میں ہے ۔

Marfat.com

کہ تمھاری منطق میں اس سے مختصر تر کوئی زمانہ نہیں ہے ۔
بہر حال یہ دو چھوٹے چھوٹے جملے اللہ کی بے انتہا قدرت پر ـــــــ خصوصاً معاد اور انسانوں کے قبروں سے جی اٹھنے میں اس کی قدرت پر ـــــــ زندہ ناطق اور منہ بولتے اشارے ہیں ۔ اسی لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے کیونکہ خدا ہر چیز پر توانا و قادر ہے (ان اللہ علی کل شیءٍ قدیر) ۔

چند اہم نکات :

۱۔ آزاد اور قیدی انسان : بعض لوگوں کے نظریے کے برخلاف توحید اور شرک کا مسئلہ صرف ایک اعتقادی اور ذہنی مسئلہ نہیں ہے بلکہ انسان کی ساری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور ہر چیز کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے توحید کا پودا جس دل میں لگ جاتا ہے اس دل کی زندگی اور رشد و نمو کا عامل بن جاتا ہے کیونکہ توحید انسانی نگاہ کو اس قدر وسیع کر دیتی ہے کہ اس کا رشتہ لامتناہی ذات سے جوڑ دیتی ہے ۔
لیکن اس کے برعکس شرک انسان کو پتھر، لکڑی کے بتوں کی انتہائی محدود دنیا میں محصور کر دیتا ہے انسانوں کو بتوں کی طرح کمتر کر دیتا ہے اور انسان کی فکر، نظر، ہمت، سعی اور توانائی کو اسی رنگ میں رنگ دیتا ہے ۔
زیر بحث آیت میں یہ حقیقت مثال کے پیرائے میں اس خوبصورتی سے بیان ہوئی ہے کہ اس سے عمدہ اور رسا انداز ممکن نہیں ہے۔ مشرک " ابکم " (گونگا ہے) مادرزاد گونگا کہ جس کا عمل اس کی فکری کمزوری اور عاری از منطق ہونے کا ترجمان ہے اور وہ شرک کے جنگل میں گرفتار ہونے کی وجہ سے کوئی مثبت کام نہیں کر سکتا (لا یقدر علی شیءٍ) ۔
وہ ایک آزاد انسان نہیں ہے بلکہ خرافات و موہومات کا قیدی ہے ۔ اپنی انھی صفات کی بناء پر وہ معاشرے پر ایک بوجھ ہے کیونکہ اس نے اپنی تقدیر کی مہار بتوں یا استعمار گر انسانوں کے ہاتھ میں دے رکھی ہے وہ ہمیشہ بندھا ہوا اور کسی پر انحصار کیے ہوئے ہوتا ہے جبکہ توحید آزادی اور استقلال کا آئینہ ہے ، جب تک وہ توحید کا ذائقہ نہ چکھے اس بندھن سے آزاد نہیں ہو سکتا " وھو کل علی مولاہ "
اپنی یہ طرز فکر لیے ہوئے وہ جس راستے پر بھی قدم رکھے گا ، ناکام رہے گا اور کسی طرف اسے خیر و سعادت نصیب نہیں ہوگی " اینما یوجھہ لا یأت بخیر "
کوتاہ فکری کے اس اسیر اور عاجز و ناتواں شخص کی زندگی کا کوئی ہدف اور پروگرام نہیں ہے یہ اس مرد آزاد و شجاع سے کس قدر مختلف ہے جو نہ صرف خود عدل و داد پر کاربند ہے بلکہ ہمیشہ اپنے معاشرے میں عدل و داد کی حکمرانی کا پرچم بلند کیے رہتا ہے ۔ علاوہ ازیں ایک آزاد انسان منطقی فکر اور توحید کے فطری نظام سے ہم آہنگ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ راہ مستقیم پر گامزن رہتا ہے وہی راہ مستقیم جو منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے نزدیک ترین راستہ ہے اس راستے سے انسان تیزی سے منزل تک جا پہنچتا ہے ایک آزاد انسان کج راستوں پر اپنا سرمایہ وجود ضائع نہیں کرتا ہے ۔
خلاصہ یہ کہ توحید و شرک صرف عقیدہ نہیں ہے بلکہ پوری زندگی سے ان کا تعلق ہے سیاسی ، اقتصادی ، ثقافتی اور تمدنی زندگی

Marfat.com

ان سے مربوط ہے۔ اگر ہم زمانہ جاہلیت کے مشرک عربوں اور ابتدائے اسلام کے موحد مسلمانوں کی زندگی کا مطالعہ کریں تو ان دونوں راستوں کا واضح فرق معلوم ہو جائے گا۔

وہی افراد جو کل تک جہالت، تفرقہ، انحطاط اور بدبختی میں ایسے گرفتار تھے کہ انھیں فقر و فساد سے آلودہ اپنے ماحول کے سوا کچھ خبر نہ تھی لیکن جب انھوں نے وادی توحید میں قدم رکھا تو انھیں ایسی وحدت، آگہی اور توانائی میسر آئی کہ اس زمانے کی ساری متمدن دنیا ان کے زیر نگیں ہو گئی۔

۲۔ **انسانی زندگی پر عدالت اور سچائی کا اثر:** یہ بات جاذب نظر ہے کہ زیر بحث آیات میں موحدین کے کاموں میں سے صرف دعوت عدل اور صراط مستقیم پر گامزن ہونے کا ذکر کیا گیا ہے یہ امر نشاندہی کرتا ہے کہ کسی فرد یا معاشرے کی حقیقی سعادت انھی دو چیزوں میں مضمر ہے انسان کا طرز عمل صحیح ہو اس کی زندگی کا پروگرام نہ شرقی ہو نہ غربی وہ نہ دائیں طرف منحرف ہو اور نہ بائیں طرف اور پھر قیام عدل کی دعوت۔ وہ بھی وقتی نہیں بلکہ " یأمر بالعدل " کے مفہوم کے مطابق دائمی اور مسلسل (کیونکہ " یأمر " مضارع کا صیغہ ہے جو دوام کا مفہوم دیتا ہے)۔

۳۔ **ایک روایت پر نظر:** طرق اہل بیت سے ایک روایت مندرجہ بالا آیات کی تفسیر کے ضمن میں آئی ہے روایت میں ہے

الذی یأمر بالعدل امیر المؤمنین والائمة (صلوٰة الله علیهم)

عدل و انصاف کی دعوت دینے والے امیر المومنین علی اور آئمہ اہل بیت (صلوٰة اللہ علیہم) ہیں [1]

بعض مفسرین نے " من یأمر بالعدل " سے حضرت حمزہ، عثمان بن مظعون یا عمار یاسر مراد لیے ہیں اور " ابکم " سے ابی بن خلف اور ابو جہل وغیرہ۔

واضح ہے کہ یہ سب ان کے لیے واضح مصداق ہیں اور ان روایات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کا مفہوم انھی افراد میں منحصر ہے۔
ضمنی طور پر ان تفاسیر سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ آیات کی تشبیہ بتوں اور خدا کی طرف اشارہ نہیں کرتی بلکہ مشرکین اور مومنین کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

---

[1] نور الثقلین، جلد ۲ ص ۷۰۔

Marfat.com

۷۸۔ وَ اللّٰهُ اَخۡرَجَكُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا ۙ وَّجَعَلَ
لَـكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصٰرَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ○

۷۹۔ اَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىۡ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمۡسِكُهُنَّ اِلَّا
اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ○

۸۰۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَـكُمۡ مِّنۡۢ بُيُوۡتِكُمۡ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَـكُمۡ مِّنۡ جُلُوۡدِ
الۡاَنۡعَامِ بُيُوۡتًا تَسۡتَخِفُّوۡنَهَا يَوۡمَ ظَعۡنِكُمۡ وَيَوۡمَ اِقَامَتِكُمۡ ۙ
وَمِنۡ اَصۡوَافِهَا وَاَوۡبَارِهَا وَاَشۡعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّ
مَتَاعًا اِلٰى حِيۡنٍ ○

۸۱۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَـكُمۡ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَـكُمۡ مِّنَ الۡجِبَالِ
اَكۡنَانًا وَّجَعَلَ لَـكُمۡ سَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمُ الۡحَـرَّ وَ
سَرَابِيۡلَ تَقِيۡكُمۡ بَاۡسَكُمۡ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ
لَعَلَّكُمۡ تُسۡلِمُوۡنَ ○

۸۲۔ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَيۡكَ الۡبَلٰغُ الۡمُبِيۡنُ ○

۸۳۔ يَعۡرِفُوۡنَ نِعۡمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنۡكِرُوۡنَهَا وَاَكۡثَرُهُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ○ ع

ترجمہ:

۷۸۔ اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے شکم سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے لیکن اس نے تمھیں کان، آنکھ اور عقل عطا کی تاکہ اس کی نعمت کا شکر ادا کرو۔

۷۹۔ کیا انھوں نے ان پرندوں پر نظر نہیں ڈالی کہ جو فضائے آسمانی میں مسخر ہیں انھیں خدا کے سوا کس نے

Marfat.com

تھام رکھا ہے اس میں (عظمت و قدرتِ خدا) کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے کہ جو ایمان رکھتے ہیں۔

۸۰۔ اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں میں سے آرام و قیام کی جگہ قرار دی اور اسی نے تمھارے لیے چوپایوں کی کھالوں سے یہ خیمے بنائے جنھیں تم سبک پاکر اپنے سفر و حضر میں کام میں لاتے ہو اور ان سے حاصل ہونے والی اُون، روئی اور بالوں سے تمھارے لیے ایک معیّن وقت تک کے لیے بہت سے اسباب اور کارآمد چیزیں پیدا کی ہیں۔

۸۱۔ اس نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں سے تمھارے لیے سایے کا انتظام کیا۔ پہاڑوں میں تمھارے لیے پناہ گاہیں بنائیں اور تمھارے لیے ایسے لباس بنائے کہ جو گرمی (اور سردی) سے بچاتے ہیں، اور جنگ میں تمھاری حفاظت کرنے والے لباس بھی بنائے ہیں اس طرح وہ تم پر اپنی نعمتوں کی تکمیل کرتا ہے تاکہ تم اس کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرو۔

۸۲۔ (ان سب چیزوں کے باوجود) اگر وہ روگردانی کریں (تو تم پریشان نہ ہو جاؤ) تیرے ذمّے تو صرف واضح ابلاغ کرنا ہے۔

۸۳۔ (لیکن) وہ اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر کافر ہیں

تفسیر:

طرح طرح کی مادّی اور روحانی نعمتیں:

قرآن حکیم ایک درسِ توحید اور خداشناسی کے لیے ایک مرتبہ پھر پروردگار کی گوناگوں نعمتوں کا ذکر کرتا ہے اس میں سب سے پہلے علم و دانش اور معرفت و شناخت کے آلات کی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے اللہ نے تمھیں تمھاری ماؤں کے شکم سے اس حالت میں نکالا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے (واللہ اخرجکم من بطون امھاتکم لا تعلمون شیئًا)۔

البتہ اس محدود، تاریک، وابستہ اور بندھے ہوئے ماحول میں یہ جہالت اور بے خبری گوارا تھی لیکن جب تم نے اس وسیع دنیا میں قدم رکھا اب ممکن نہ تھا یہ جہالت یونہی جاری رہے۔ لہٰذا ادراکِ حقائق اور شناختِ موجودات کے لیے کان، آنکھ اور عقل جیسے وسائل تمھیں عطا کیے گئے (وجعل لکم السمع والابصار والافئدۃ) تاکہ تم ان عظیم نعمتوں کو سمجھ سکو اور انھیں عطا کرنے والے کے لیے تمھارے اندر احساسِ تشکر پیدا ہو "شاید تم اس کا شکرادا کرو" (لعلکم تشکرون)۔

Marfat.com

چند قابلِ توجہ نکات:

۱۔ ابتداء میں انسان کچھ نہیں جانتا ہوتا: یہ آیت صراحت کے ساتھ کہتی ہے کہ پیدائش کے وقت انسان بالکل کوئی علم نہیں رکھتا ہوتا لہذا وہ جو کچھ حاصل کرتا ہے وہ ولادت کے بعد اللہ کے عطا کردہ وسائل سے حاصل کرتا ہے۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے وہ یہ کہ قرآن کہتا ہے بچہ جب حالتِ جنین سے نکلتا ہے اس وقت کچھ بھی نہیں جانتا ہوتا حالانکہ ہم کئی طرح کے فطری چیزوں کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً خدا شناسی اور اسی طرح کئی واضح مسائل (جیسے متضاد چیزوں کا جمع نہ ہو سکنا۔ یا کل جزء سے بڑا ہوتا ہے) یا کئی اجتماعی اور اخلاقی مسائل (جیسے عدل اچھا ہے اور ظلم بُرا ہے) اور اس طرح کے کئی اور مسائل سے انسان فطری طور پر آگاہ ہوتا ہے کیونکہ یہ آگاہی تو ہماری فطرت میں رکھ دی گئی ہے تو پھر قرآن کیوں کہتا ہے کہ پیدائش کے وقت تم کچھ نہیں جانتے تھے۔

کیا ہمیں اپنے وجود کا علم بھی نہیں تھا کہ جو علمِ حضوری شمار ہوتا ہے اور وہ بھی کان، آنکھ اور عقل کے ذریعے ہمیں حاصل ہوتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں یہ بدیہی ضروری اور فطری علوم بھی اس لمحے عملی طور پر انسان میں نہیں تھے صرف ان کی استعداد اور قوت انسان کے اندر موجود تھی۔ دوسرے لفظوں میں ولادت کے وقت ہم ہر چیز سے غافل تھے یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی۔ البتہ استعداد کے اعتبار سے بہت سے حقائق کا ادراک ہمارے اندر مخفی تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری آنکھ میں قوتِ بینائی پیدا ہوئی۔ کان میں طاقتِ شنوائی پیدا ہوئی اور عقل نے ادراک، تجزیہ اور تحلیل کی قدرت حاصل کی اور ہم خدا کی ان تینوں نعمتوں سے بہرہ مند ہوئے پہلے پہل قوتِ حس کے ذریعے بہت سی چیزوں کے تصورات پیدا ہوئے وہ تصوراتِ عقل کی طرف منتقل ہوئے۔ پھر اُن سے کامل اور کامل تر مفاہیم بننے لگے اور تعمیم و تجرید کے ذریعے عملی حقائق تک ہماری رسائی ہوئی اس سفر سے گذرتی ہوئی ہماری قوتِ فکر اس مقام تک آ پہنچتی ہے کہ ہم علمِ حضوری کے طور پر اپنے آپ سے آگاہ ہوتے ہیں پھر وہ علوم جو استعداد کے طور پر ہمارے اندر موجود ہیں ان میں جان پیدا ہوتی ہے اور وہ عملی شکل اختیار کرتے ہیں ان بدیہی اور ضروری علوم کی بنیاد پر ہم نظری اور غیر بدیہی علوم تک پہنچتے ہیں لہذا آیت میں جو عمومیت پائی جاتی ہے اس میں تخصیص اور استثناء کی گنجائش نہیں اور اس بات کا مفہوم کلی ہے کہ "جب تمھیں پیدا کیا گیا تم کچھ نہ جانتے تھے"۔

۲۔ آلاتِ شناخت کی نعمت: اس میں شک نہیں کہ عالمِ خارج کے لیے ہمارے وجود کی داخلی دنیا کے لیے کوئی راستہ نہیں البتہ ہماری روح میں موجود مختلف آلات و وسائل کے ذریعے اس کی تصویر اور شکل نقش ہوتی ہے اس طرح خارجی دنیا سے ہماری شناخت آلات کے ذریعے ہوتی ہے اور ان آلات میں سے سب سے اہم کان اور آنکھ ہیں۔

بیرونی دنیا سے یہ آلات جو کچھ حاصل کرتے ہیں ہمارے ذہن اور فکر کی طرف منتقل کرتے ہیں اور ہم عقل و فکر کی قوت سے انھیں حاصل کرتے ہیں اور اس کا تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں۔

اسی بناء پر زیرِ بحث آیت میں یہ بتانے کے بعد کہ انسان جب اس جہان میں قدم رکھتا ہے تو اسے مطلقاً کسی چیز کا علم نہیں ہوتا قرآن مزید فرماتا ہے:۔

Marfat.com

"اللہ نے تمھیں آنکھ، کان اور دل عطا کیے ہیں (تاکہ تم حقائقِ ہستی تک پہنچ سکو)"۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے کان کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر آنکھ کا۔ حالانکہ ظاہراً آنکھ کی کارکردگی کا دائرہ زیادہ وسیع ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ نوزائیدہ بچے میں پہلے کان کارکردگی کا آغاز کرتا ہے اور آنکھیں کچھ مدت بعد دیکھنے لگتی ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ رحمِ مادر کی دنیا تو بالکل تاریک ہوتی ہے۔ ابتدائے تولد میں آنکھیں روشنی کی شعاعیں قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں یہی وجہ ہے کہ ولادت کے بعد عام طور پر آنکھیں بند ہوتی ہیں اور رفتہ رفتہ روشنی کی عادی ہوتی ہیں اور ان میں دیکھنے کی قوت زیادہ ہوتی ہے جبکہ کان کے بارے میں بعض کا نظریہ ہے کہ وہ عالمِ جنین میں بھی تھوڑا بہت سن لیتے ہیں اور بچہ ماں کے پیٹ میں اس کے دل کی دھڑکن سنتا ہے اور اس کا عادی ہوتا ہے۔

ان سب چیزوں سے قطع نظر انسان آنکھ کے ساتھ صرف حسی امور کو دیکھتا ہے جبکہ کان تمام پہلوؤں سے تعلیم و تربیت کا ذریعہ ہے۔ کان الفاظ سننے کے ذریعے تمام حقائق سے آشنا ہو جاتا ہے چاہے وہ حسی ہوں یا قوتِ حس کے دائرے سے باہر جبکہ آنکھ یہ وسعتِ عمل نہیں رکھتی یہ ٹھیک ہے کہ انسان آنکھ کے ذریعے الفاظ پڑھ کر ان مسائل سے آگاہ ہو جاتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ سب لوگ نہیں پڑھ سکتے۔ جبکہ الفاظ سُن تو سبھی سکتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ "سمع" مفرد شکل میں اور "ابصار" (جو "بصر" کی جمع ہے) جمع کی شکل میں کیوں آیا ہے تو اس کی وجہ ہم پہلی جلد میں سورۂ بقرہ کی آیہ، کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ "فؤاد" اگرچہ "قلب" "(عقل) کے معنی میں آیا ہے لیکن "قلب" سے اس کا فرق یہ ہے کہ "فؤاد" کے مفہوم میں جوش، جذبہ اور ولولہ پیدا ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے یعنی تجزیہ و تحلیل اور تخلیق و ایجاد کا معنی بھی اس میں پنہاں ہیں۔

راغب مفردات میں کہتا ہے:

الفؤاد کالقلب لکن یقال له فؤاد اذا اعتبر فیه معنی التفؤد ای التوقد

"فؤاد" "قلب" کی طرح ہے لیکن یہ لفظ وہاں بولا جاتا ہے جہاں اس سے روشنی دینا اور دل ختگی مراد ہو۔

یہ بات مسلّم ہے کہ یہ چیز کافی تجربے کے بعد انسان کے ہاتھ آتی ہے بہرحال شناخت کے آلات اگرچہ ان دو یا تین میں منحصر نہیں ہیں تاہم یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ اہم ترین آلات شناخت یہی ہیں کیونکہ انسان کا علم تجربے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے یا عقلی استدلال کے ذریعے۔ ظاہر ہے کہ تجربہ آنکھ اور کان کے بغیر ممکن نہیں ہے رہے عقلی استدلالات تو وہ "فؤاد" یعنی عقل کے ذریعے صورت پذیر ہوتے ہیں۔

۲۔ **تاکہ اس کا شکر بجالاؤ:** آلات شناخت بہت بلند اور عظیم نعمت ہے کہ جو انسان کو عطا کی گئی ہے کیونکہ آنکھ اور کان سے انسان نہ صرف وسیع عالمِ ہستی میں آثارِ الٰہی دیکھتا ہے اور رہبرانِ الٰہی کی باتیں سنتا ہے اور دل کے ذریعے ادراک اور

Marfat.com

تجزیہ وتحلیل کرتا ہے بلکہ اس کی مادی زندگی میں بھی ہر قسم کی ترقی وتکامل انہی تین وسائل کا مرہونِ منت ہے اسی لیے ان کے ذکر کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے: "لعلکم تشکرون"

یہ جملہ ان تین چیزوں کی اہمیت یاد دلاتا ہے یعنی یہ وسائل تمھیں عطا کیے گئے ہیں تاکہ تم عالم اور آگاہ ہو اور اس کے بعد اس آگہی وعلم پر شکر بجالاؤ کہ جو حیوانوں سے تمھیں بہت ممتاز کرتا ہے اس میں شک نہیں کہ کوئی انسان ان عظیم نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا سوائے اس کے کہ بارگاہِ ایزدی میں عذر کوتاہی پیش کرے۔

اس کے بعد کی آیت میں بھی وسیع عالم ہستی میں پھیلے ہوئے عظمت الٰہی کے اسرار کا ذکر جاری ہے ارشاد ہوتا ہے: کیا وہ ان پرندوں کو نہیں دیکھتے کہ جو وسعت آسمان میں پرواز کرتے ہیں (الم یروا الی الطیر مسخرات فی جو السماء)۔

"جو" لغت میں فضا کے معنی میں ہے (جیسا کہ مفردات میں راغب نے بیان کیا ہے) اور یا پھر یہ ہوا کا وہ حصہ ہے جو زمین سے دور ہے (جیسا کہ تفسیر مجمع البیان، المیزان اور آلوسی میں بیان کیا گیا ہے)۔

اجسام کی فطرت یہ ہے کہ وہ زمین کی طرف کھنچتے ہیں لہٰذا زمین سے اوپر پرندوں کی پرواز اور آمد ورفت کو "مسخرات" (تسخیر شدہ) کہا گیا ہے یعنی اللہ نے ان کے پر وبال کو یہ قوت دی ہے اور ہوا میں ایک خاصیت پیدا کی ہے کہ جو ان کے لیے اسے ممکن بناتی ہے کہ کشش ثقل کے باوجود وہ فضا میں پرواز کرتے ہیں۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: خدا کے سوا کوئی انھیں فضا میں اس طرح روکے نہیں رکھ سکتا (ما یمسکھن الا اللہ)۔

یہ ٹھیک ہے کہ پر وبال کی طبعی خاصیت ان میں پیدا کئے گئے عضلات، پرندوں کی مخصوص شکل اور ہوا میں موجود خصوصیات نے باہم مل کر پرندوں کی پرواز کو ممکن بنایا ہے لیکن یہ شکل وصورت اور ان خواص کو کس نے پیدا کیا ہے اور اس گہرے حساب شدہ نظام کو کس نے مقرر کیا ہے کیا اندھی گونگی طبیعت نے یا اس ذات نے کہ جو اجسام کے تمام طبیعاتی خواص سے آگاہ ہے اور جس کا لامتناہی علم ان سب پر محیط ہے۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ان تمام امور کی خدا کی طرف نسبت دی جاتی ہے تو اس کی یہی وجہ ہے کہ وہی ان سب کا سرچشمہ ہے ایسی تعبیرات کہ جن میں اسباب وعلل اور خواص کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے قرآن حکیم میں بہت ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اس امر میں اللہ کی عظمت وقدرت کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں (ان فی ذٰلک لاٰیٰت لقوم یؤمنون)۔

یعنی جو متلاشیانِ حق ان امور کو چشم بصیرت سے دیکھتے ہیں اور ان کا تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں ان کا ایمان ان سے زیادہ قوی اور راسخ تر ہے۔

چند قابلِ غور نکات:

۱۔ فضائے آسمانی میں پرندوں کی پرواز کے اسرار:۔ اس بات کو سمجھنا آسان ہے کہ جہانِ ہستی کی بہت سی

Marfat.com

چیزیں ہمیں زیادہ حیرت میں کیوں نہیں ڈالتیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم انھیں دیکھتے رہتے ہیں اور ان کے عادی ہو چکے ہیں اس عادت نے درحقیقت ان طرح طرح کی حیران کن چیزوں کے درمیان ایک پردہ سا حائل کر دیا ہے۔

اگر ہم اپنے ذہن کو اس عادی زندگی سے نکال لیں تو ہمیں اپنے گرداگرد بہت سی حیران کن چیزیں دکھائی دیں۔

پرندوں کی پرواز کا مسئلہ بھی ایسے ہی امور میں سے ہے۔ بھاری جسم کشش ثقل کے قانون کے برخلاف آسانی سے چلتے پھرتے ہیں کتنی جلدی سے وہ بلند جا پہنچتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ یہ بات کوئی سیدھی سادی نہیں ہے۔

اگر ہم پرندوں کی ساخت اور ان کے جسم کو ہر حوالے سے غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان کا پورا جسم پرواز کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔

ان کے جسم کی مخروطی شکل کہ جو ان کے بدن پر ہوا کا دباؤ بہت کم کر دیتی ہے ہلکے پھلکے پر اور اس کے ساتھ ساتھ نچلی طرف ان کا چوڑا سینہ سب مل کر انھیں امواجِ ہوا پر سوار ہونے کے قابل بناتے ہیں اور ان کے پروں کی خصوصی ساخت کہ جو ان کو اوپر اٹھنے کی طاقت بخشتے ہیں [1]

نیز ان کی دُم کی مخصوص ساخت کہ جو ان کے دائیں بائیں اور اوپر نیچے تیزی سے حرکت کے لیے (ہوائی جہاز کی دُم کی طرح) مدد کرتی ہے۔ ان کی قوتِ نظر اور دیگر حواس ایسے ہم آہنگ ہیں کہ جو ان کی تیز اور سریع پرواز کو ممکن بناتے ہیں۔

ان سب چیزوں کے علاوہ ان کے بچوں کی پرورش ان کے وجود سے الگ ہوتی ہے کہ جو انڈوں میں سے نکلتے ہیں ظاہر ہے انھیں اٹھائے پھرنا پرواز کے لیے رکاوٹ ہوتا۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے امور ہیں کہ جن میں سے ہر ایک فزکس کے اصول کے تحت پرواز کے لیے بہت مؤثر ہے ان سب کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ انھیں پیدا کرنے والے نے کس قدر وسیع علم و قدرت سے کام لیا ہے قرآن کے بقول :-

ان فی ذٰلک لاٰیات لقوم یؤمنون

---

[1] اوپر اٹھنے کی طاقت .... یہ فزکس میں نئی اصطلاح ہے کہ جو ہوائی جہازوں کے امور میں استعمال ہوتی ہے۔ مختصراً اس کے بارے میں یہ ہے کہ ایک جسم کی اگر وہ مختلف سطحیں ہوں (جیسے ہوائی جہاز کی ہوتی ہیں کہ جس کی نچلی سطح سیدھی ہوتی ہے اور بالائی سطح اوپر کو اٹھی ہوئی خمدار ہوتی ہے) تو ایسا جسم اگر افقی حرکت کرے تو اس کے اندر ایک خاص قسم کی قوت (ENERGY) پیدا ہوتی ہے جو اسے بلند سطح کی طرف لے جاتی ہے یہ قوت اس لیے ہوتی ہے کہ ہوا کا دباؤ بالائی سطح کی نسبت نچلی سطح پر زیادہ ہوتا ہے کیونکہ نیچے والی سطح چھوٹی ہوتی ہے اور اوپر والی سطح زیادہ لمبی ہوتی ہے۔ یہ بات بہت اہم ہے کہ ہوائی جہازوں کی حرکت کا دارومدار اسی پر ہے اگر ہم پرندوں پر توجہ کریں تو ان میں یہ امر بہت وضاحت سے دیکھا جا سکتا ہے۔

اصولی طور پر ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہوائی جہاز کی ساخت میں پرندوں کی ساخت کی تقلید کی گئی ہے۔

Marfat.com

بے شک اس میں اہلِ ایمان کے لیے اللہ کی عظمت وقدرت کی نشانیاں ہیں۔

پرندوں کی دنیا کے عجائبات اس سے کہیں زیادہ ہیں کہ ایک یا چند کتب میں سما سکیں دورِ حاضر میں بہت سے پرندوں کو ہم مہاجر پرندوں کے نام سے پہچانتے ہیں یہ پرندے اپنی زندگی کی بقاء کے لیے دنیا کے مختلف علاقوں کا سفر کرتے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات شمال سے جنوب تک کا بہت ہی طولانی فاصلہ طے کرتے ہیں اور دور دراز کے اس سفر میں انتہائی رمز آمیز وسائل سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں ان کی مدد سے پہاڑوں، صحراؤں، بیابانوں، دروں اور دریاؤں میں اپنا راستہ ڈھونڈھ لیتے ہیں یہاں تک کہ ابر آلود دنوں میں اور کبھی تاریک راتوں میں بھی راہ تلاش کر لیتے ہیں کہ جن میں کوئی انسان اپنا راستہ تلاش کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔

بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ وہ آسمان کی پہنائیوں میں محوِ خواب بھی ہوتے ہیں اور محوِ پرواز بھی۔ بعض اوقات بغیر کسی لمحہ بھر توقف کے کئی کئی ہفتے رات دن محوِ پرواز رہتے ہیں یہاں تک کہ انھیں کھانے پینے کی احتیاج بھی نہیں ہوتی کیونکہ وہ پرواز سے پہلے ایک اندرونی راہنمائی کے ذریعے خوب کھا پی لیتے ہیں یہ غذا بھی چربی کی شکل میں ان کے جسم میں اسٹور ہو جاتی ہے اور راستے میں انھیں ضرورت نہیں پڑتی۔

اسی طرح گھر بنانے، اولاد کی تربیت کرنے، دشمن کا مقابلہ کرنے اور ضروری غذا مہیا کرنے میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے بلکہ اپنی نوع کے علاوہ غیر سے تعاون اور اکٹھے زندگی گذارنے اور اس قسم کے دیگر بہت سے امور میں پرندوں کی زندگی کے ایسے ایسے اسرار ہیں کہ ان میں ہر ایک، ایک طویل داستان ہے۔

جی ہاں! جیسا کہ ہم نے مندرجہ بالا آیت میں پڑھا ہے:

ان میں سے ہر ایک میں عظمت پروردگار اور اس کے لامتناہی علم وقدرت کی نشانیاں ہیں۔

۲۔ آیات کا باہمی ربط: اس میں شک نہیں کہ پرندوں کے پرواز کے بارے میں زیرِ بحث آیت اور اس سے آگے پیچھے کی آیات میں یہ تعلق ہے کہ سب کی سب جہانِ خلقت میں نعماتِ الٰہی کے مختلف پہلوؤں اور اس کی قدرت وعظمت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں لیکن یہ احتمال بھی زیادہ بعید نہیں کہ آلاتِ شناخت کے ذکر کے بعد پرندوں کی پرواز کا ذکر یہ لطیف نکتہ ہو کہ عالمِ محسوس میں ان پرندوں کی پرواز کو عالمِ غیر محسوس میں افکار و خیالات کی پرواز سے تشبیہ دی گئی ہو۔ یعنی ان میں سے ہر ایک اپنے آلات کے ساتھ اپنی اپنی مخصوص فضا میں پرواز کرتے ہیں۔

خطبہ شقشقیہ میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

ینحدر عنی السیل ولا یرقی الی الطیر

علم ودانش کی آبشار میرے وجود کے کوہسار سے گرتی ہے اور بلند افکار اس کی چوٹی تک نہیں پہنچ پاتیں۔

آپ کے کلماتِ قصار میں ہے کہ آپ نے مالک اشتر جیسے جانباز افسر کی فضیلت میں فرمایا:

لا یرتقیہ الحافر ولا یوفی علیہ الطائر

کوئی رہوار اس کے کوہسارِ وجود سے اوپر نہیں جا سکتا اور کوئی طائرِ فکر اس کی بلندی

Marfat.com

چھو نہیں سکتا ہے[1]

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی ابتداء میں کہا تھا کہ اس کا ایک نام "نعمتوں کی سورت" ہے کیونکہ اس میں پروردگار کی کوئی بیچاس روحانی اور مادی نعمتوں کا ذکر ہے یہ نعمتیں اس کی ذات پاک کی شناسائی کی دلیل بھی ہیں اور ان کا ذکر اس کی شکر گزاری کا سبب بھی ہے۔

زیر بحث تیسری آیت میں بھی اس مسئلے پر گفتگو جاری ہے، ارشاد ہوتا ہے: اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے بعض گھروں میں سے آرام و قیام کی جگہ قرار دیا ہے (واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا)۔

حقیقت یہ ہے کہ گھر اور مسکن ایک ایسی عظیم نعمت ہے کہ جب تک یہ میسر نہ ہو باقی نعمتوں کا کوئی لطف نہیں۔

لفظ "بیوت" "بیت" کی جمع ہے یہ کمرے یا گھر کے معنی میں ہے یہ "بیتوتہ" کے مادہ سے ہے کہ جو در اصل رات میں توقف کرنے کے معنی میں ہے اور چونکہ انسان اپنے کمرے اور گھر سے زیادہ تر رات کو آرام کرنے کے لیے استفادہ کرتا ہے لہٰذا اس پر لفظ "بیت" کا اطلاق ہوا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ میں نے تمھارے گھروں کو تمھارے لیے مقام سکونت قرار دیا ہے بلکہ لفظ "من" کہ جو تبعیض یعنی بعض کے لیے آتا ہے استعمال ہوا ہے یعنی تمھارے کمروں اور گھروں میں مقام سکونت قرار دیا ہے۔ یہ تعبیر بہت معنی خیز ہے کیونکہ پورے گھر کے تو اور بھی بہت سے فائدے ہوتے ہیں اس میں مقام سکونت بھی ہوتا ہے سواری کے ٹھہرانے کی جگہ بھی، ضروریات زندگی رکھنے کے لیے بھی وغیرہ بھی۔

ثابت اور ٹھہرے ہوئے گھروں کے ذکر کے بعد سیار اور چلتے پھرتے گھروں کا ذکر آتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: اللہ نے ہی جانوروں کی کھالوں سے تمھارے لیے خیمے بنائے (وجعل لکم من جلود الانعام بیوتا)[2] اور یہ ایسے گھر ہیں کہ جو بہت ہلکے پھلکے ہیں۔ کوچ اور قیام کے وقت انھیں آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا سکتا ہے (تستخفونھا یوم ظعنکم و یوم اقامتکم)۔

علاوہ ازیں ان سے حاصل ہونے والی اُون، روئی اور بالوں سے تمھارے لیے ایک معین وقت تک کے لیے بہت سے اسباب، وسائل زندگی اور کارآمد چیزیں پیدا کی ہیں (ومن اصوافھا واوبارھا واشعارھا اثاثا ومتاعا الی حین)۔

ہم جانتے ہیں کہ چوپایوں کے بدن پر جو بال اگتے ہیں ان میں سے بعض بہت سخت اور موٹے ہوتے ہیں مثلاً بکری کے بال کہ جنھیں عرب "شعر" کہتے ہیں ("اشعار" اس کی جمع ہے) اور کبھی کچھ نرم ہوتے ہیں جنھیں پشم یا اون کہتے ہیں عرب انھیں صوف

---

[1] نہج البلاغہ کلمات قصار، ص ۴۴۳۔

[2] اگرچہ ہمارے زمانے میں چمڑے سے بہت کم خیمے بنائے جاتے ہیں لیکن زیر نظر آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں چمڑے کے خیموں کو بہترین سمجھا جاتا تھا اسی لیے قرآن نے اس انداز سے ان کا ذکر کیا ہے۔ شاید خیمے سے چمڑے اس لیے بنائے جاتے تھے کہ حجاز کے بیابانوں کی نہایت گرم ہواؤں سے بچنے کے لیے ایسے خیمے زیادہ مفید تھے۔

Marfat.com

کہتے ہیں (" اصواف" اس کی جمع ہے) اور کبھی بہت ہی نرم ہوتے ہیں فارسی میں انھیں "کرک" کہتے ہیں۔ عرب انھیں "وبر"[1] (بروزن "ظفر") کہتے ہیں، (اوبار اس کی جمع ہے)۔

واضح ہے کہ مختلف ساخت اور نوعیت کے ہونے کی وجہ سے ان بالوں کو مختلف کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے کسی سے قالین بنتے ہیں کسی سے لباس اور کسی سے خیمے وغیرہ۔

اس بارے میں کہ آیت میں "اثاث" اور "متاع" سے کیا مراد ہے مفسرین نے مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں مجموعی طور پر "اثاث" گھر کے ساز وسامان کو کہا جاتا ہے اس کا مادہ "اث" ہے اور یہ کثرت اور ایک دوسرے میں خلط ملط ہونے سے لیا گیا ہے گھر کا سامان چونکہ عموماً زیادہ ہوتا ہے لہذا اسے "اثاث" کہتے ہیں۔

"متاع" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان "متمتع" ہو اور فائدہ اٹھائے۔ لہذا یہ دونوں تعبیریں دو مختلف زاویوں سے ایک ہی مطلب کی نشاندہی کرتی ہیں۔

جو کچھ کہا جا چکا ہے اسے ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان دو تعبیروں کا یکے بعد دیگرے آنا ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ تم چوپایوں کی اون، روئی کے سے نرم اور دوسرے بالوں سے اپنے گھر کے لیے درکار بہت سا ساز وسامان تیار کر سکتے ہو اور اس طرح ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔

فخر الدین رازی اور بعض اور مفسرین نے یہ احتمال ظاہر کیا ہے کہ "اثاث" سے مراد لباس ہے اور "متاع" سے زمین پر بچھانے والی چیز ہے لیکن انھوں نے اس کے لیے کوئی دلیل پیش نہیں کی۔

"روح المعانی" میں آلوسی نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ "اثاث" گھر کے سامان کی طرف اشارہ ہے اور "متاع" مالِ تجارت کی طرف اشارہ ہے۔

البتہ ہم جو شروع میں کہہ چکے ہیں وہ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

"الیٰ حین" کے مفہوم کے بارے میں بھی مختلف تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ لیکن ظاہراً اس سے مراد یہ ہے کہ تم اس دنیا اور زندگی کے اختتام تک ان چیزوں سے فائدہ اٹھاؤ گے یہ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی اور اسباب جاودانی نہیں ہیں اور یہاں کی ہر چیز محدود ہے۔

سائے، گھر اور لباس:

اس کے بعد ایک اور نعمتِ الٰہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے: خدا نے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں تمھارے لیے سائے بھی بنائے ہیں (و اللہ جعل لکم مما خلق ظللا)۔ اور پہاڑوں میں تمھارے لیے پناہ گاہیں بنائی ہیں

---

[1] یہ لفظ "روئی" کے گالوں کی طرح کے نرم بالوں کے لیے آیا ہے۔ (ش۔ ن)

Marfat.com

(وجعل لکم من الجبال اکناناً)۔

"اکنان" "کِن" (بروزن "جن") کی جمع ہے یہ لفظ کسی ایسی چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ڈھانپنے اور حفاظت کے لیے استعمال ہوتی ہو۔ پہاڑوں کے اندر موجود مخفی جگہوں، غاروں اور پناہ گاہوں کو اسی لیے "اکنان" کہا جاتا ہے۔

یہاں ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں کہ درختوں کے سائے ہوں یا پہاڑوں کے . . . سائے کا مجموعی طور پر ایک اہم نعمت کے عنوان سے ذکر کیا جارہا ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ انسان کو جس طرح زندگی میں روشنی کی چمک کی ضرورت ہے بہت سے اوقات میں سائے کی بھی احتیاج ہے اس لیے کہ روشنی اگر ایک ہی طرح چمکتی رہے تو زندگی ناممکن ہوجائے اور ہم جانتے ہیں ہم زمین کے باسیوں کے لیے سب سے بڑا سایہ کرۂ زمین کا سایہ ہے کہ جسے "رات" کہتے ہیں۔ یہ سایہ سطح زمین کے نصف حصے کو چھپا دیتا ہے۔ انسانی زندگی پر اس عظیم سایے کی تاثیر کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اسی طرح دن کے اوقات میں مختلف چیزوں کے چھوٹے بڑے سایوں کے اثرات اور فوائد بھی ہمارے سامنے واضح ہیں۔

گھروں اور خیموں کی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد سایوں اور پہاڑی پناہ گاہوں کی نعمت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ گویا یہ اس طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کے تین ہی گروہ ہو سکتے ہیں۔ ایک بستیوں اور آبادیوں میں رہنے والا۔ دوسرا کہ جو سفر میں اور خیمے اس کے ساتھ ہوں اور تیسرا ان مسافروں کا گروہ کہ جن کے پاس خیمے نہ ہوں۔ خدا نے انھیں بھی محروم نہیں کیا بلکہ انھیں راہوں میں پناہ گاہیں مہیا کی ہیں۔

ہو سکتا ہے شہروں میں آرام کی زندگی گزارنے والوں پر غاروں اور کوہستانی پناہ گاہوں کی اہمیت بالکل واضح نہ ہو لیکن بیابانوں میں پھرنے والے بے اماں مسافروں اور چرواہوں کو ان کی قدر معلوم ہے وہ تمام لوگ کہ جن کے پاس نہ ثابت گھر ہوں اور نہ سیار اور سورج کی تیز دھوپ یا سردیوں کی شدید لہر سے دوچار ہوں وہ جانتے ہیں کہ ایک کوہستانی پناہ گاہ کا وجود زندگی کے لیے کتنا اہم ہے کہ بعض اوقات بہت سے انسانوں اور حیوانوں کو یقینی موت سے بچا لیتا ہے جبکہ عام طور پر ایسی پناہ گاہیں سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد ہوتی ہیں۔

ان فطری اور مصنوعی سائبانوں کے ذکر کے بعد انسان کے لباس کا ذکر کیا گیا۔ ہے ارشاد ہوتا ہے: خدا نے تمھیں لباس عطا کیے ہیں کہ جو گرمی سے تمھیں بچاتے ہیں (وجعل لکم سرابیل تقیکم الحر)۔

اور اسی طرح ایسے خاص دفاعی لباس بھی عطا کیے ہیں کہ جو جنگ کے موقع پر تمھاری حفاظت کرتے ہیں (وسرابیل تقیکم بأسکم)۔

"سرابیل" "سربال" (بروزن "مثقال") کی جمع ہے۔ مفردات میں راغب نے اس کا معنی پیراہن اور قمیص بیان کیا ہے چاہے وہ کسی چیز کی بھی بنی ہو۔ دیگر مفسرین نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے البتہ بعض مفسرین نے اسے ہر طرح کے لباس کے معنی میں لیا ہے لیکن پہلا معنی ہی مشہور ہے۔

البتہ لباس کا صرف یہی فائدہ نہیں کہ وہ گرمی اور سردی میں انسان کی حفاظت کرتا ہے بلکہ یہ انسان کے وقار کا بھی باعث ہے اور جسم انسانی کو بہت سے خطرات سے بچائے رکھتا ہے۔ کیونکہ انسان برہنہ ہو تو شاید اس کے بدن کا کوئی نہ کوئی حصہ

Marfat.com

ہر روز زخمی ہو جائے لیکن مندرجہ بالا آیت میں لباس کا جو فائدہ بیان کیا گیا ہے وہ اہمیت کے لحاظ سے ہے۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ آیت میں صرف گرمی سے بچانے کا ذکر کیا گیا ہے شاید یہ اس لیے ہو کہ بہت سے مواقع پر عرب اختصار کے طور پر دو ضدوں میں سے ایک کا ذکر کرتے ہیں اور دوسری پہلی کے قرینے سے واضح ہو جاتی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اس بناء پر ہو کہ قرآن جن علاقوں میں نازل ہوا تھا وہاں گرمی سے بچانے کا مسئلہ زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ گرمی لگنے اور سورج کی تیز حدت کے خطرات زیادہ سریع اور زیادہ خطرناک ہوتے ہیں دوسرے لفظوں میں شدید گرمی اور سورج کی شدید تپش کے سامنے انسان کی قوتِ برداشت سردی کے مقابلے میں قوتِ برداشت کی نسبت بہت کم ہوتی ہے کیونکہ سردی میں انسان کی اندرونی حرارت بہت حد تک اس کی حفاظت کر سکتی ہے جبکہ گرمی کے مقابلے میں اس کی قوتِ مدافعت بہت کم ہوتی ہے۔

آیت کے آخر میں یاد دہانی اور تنبیہ کے طور پر فرمایا گیا ہے: اس طرح سے اللہ تم سب پر اپنی نعمت کو پورا کرتا ہے کہ شاید تم اس کے فرمان کے سامنے سرِتسلیم خم کر دو (کذلك یتم نعمته علیکم لعلکم تسلمون)۔

یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان جب دیکھتا ہے کہ بہت سی نعمتیں اس کے وجود کو گھیرے ہوئے ہیں تو بے اختیار اس کا خیال ان نعمتوں کو بخشنے والے کی طرف لوٹ جاتا ہے اور اگر اس طرح اس کے اندر قدردانی اور شکر گذاری کا کچھ بھی احساس پیدا ہو جائے تو وہ معطیِ نعمت کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لفظ "نعمت" کہ جو مذکورہ بالا آیت میں آیا ہے بعض مفسرین نے اسے نعمتِ خلقت، نعمتِ کمال، نعمتِ عقل، نعمتِ توحید شناسی یا نعمتِ وجودِ پیغمبر اسلام میں محدود سمجھا ہے لیکن واضح ہے کہ یہاں یہ لفظ ایک وسیع معنی کا حامل ہے کہ جس میں یہ تمام مذکورہ نعمتیں اور ان کے علاوہ دیگر نعمتیں بھی شامل ہیں۔ محدودیت والی یہ تفاسیر دراصل نعمت کے واضح مصادیق کی طرف اشارہ سمجھی جانا چاہییں۔

ان ظاہر و مخفی نعمتوں کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے: ان تمام امور کے باوجود اگر وہ روگردانی کریں اور دعوتِ حق کے سامنے سرِتسلیم خم نہ کریں تو تم پریشان نہ ہونا۔ کیونکہ تمہاری ذمہ داری تو بس یہ ہے کہ واضح طور پر ابلاغ کر دو (فان تولوا فانما علیك البلاغ المبین)۔

کہنے والے کی بات کتنی ہی استدلالی، مؤثر اور جاذب کیوں نہ ہو جب تک سننے والا مائل نہ ہو، اثر نہیں کر سکتی۔ دوسرے لفظوں میں اہلیتِ مقام بھی شرط ہے اور ہر بات اس کے اہل پر ہی اثر انداز ہوتی ہے لہٰذا اگر کور دل، ہٹ دھرم تیری دعوت تسلیم نہیں کرتے تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے اہم بات یہ ہے کہ تو بلاغِ مبین میں کسر نہ چھوڑے اور سب کے سامنے اپنی دعوت کھلے بندوں پیش کرے۔

یہ جملہ درحقیقت رسولِ اکرمؐ کی دلجوئی اور تسلیِ خاطر کے لیے ہے۔

بات پوری کرنے کے لیے مزید فرمایا گیا ہے: وہ نعمتِ الٰہی کو پہچانتے ہیں اس کے پہلوؤں اور وسعت سے آشنا

Marfat.com

ہیں اور اس کی گہرائی کو جان چکے ہیں لیکن اس کے باوجود اس کا انکار کرتے ہیں (یعرفون نعمت اللہ ثم ینکرو نہا)۔
لہٰذا ان کے کفر کا سبب نا آگاہی اور بے علمی میں تلاش نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ وہ کافی حد تک آگاہ ہو چکے ہیں اس کفر کا باعث ان کی کوئی اور پست صفات ہیں کہ جو ان کے ایمان میں سدِ راہ بنی ہوئی ہیں اور وہ ہیں اندھا تعصب، ہٹ دھرمی، حق دشمنی، مادی زندگی کے تھوڑے سے مفادات کو ہر چیز پر مقدم کرنا، طرح طرح کی خواہشات میں اسیری اور تکبر۔
شاید اسی بناء پر آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: اور ان میں سے اکثر کافر ہیں (و اکثرھم الکافرون)۔
لفظ "اکثرھم" نے بہت سے مفسرین کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے اور انھوں نے سوچا ہے کہ یہاں "اکثر" کا لفظ کیوں آیا ہے ہر مفسر نے اس کی کوئی نہ کوئی تفسیر بیان کی ہے لیکن ان میں سے ہمیں جو زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے وہ وہی ہے جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہے یعنی ان کفار کی اکثریت ہٹ دھرم، معاند اور متعصب ہے اور ان میں سے جو غلط فہمی کا شکار ہیں۔ وہ اقلیت میں ہیں۔
وہ کفر جو تکبر کی بنیاد پر کیا جاتا ہے اس کا ذکر قرآن حکیم کی دیگر آیات میں بھی دکھائی دیتا ہے مثلاً شیطان کے بارے میں ہے:۔

ابی واستکبر و کان من الکافرین

ابلیس نے حکم ماننے سے انکار کر دیا اور تکبر انکار کیا اور وہ کافروں میں سے تھا (بقرہ ۳۴)

کچھ مفسرین نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ "اکثر" سے مراد وہ افراد ہیں کہ جن پر اتمام حجت ہو چکا تھا جبکہ جن پر ابھی تک اتمام حجت نہیں ہوا وہ اقلیت میں تھے اس معنی کو بھی پہلے معنی کے ذیل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

چند اہم نکات:

"نعمت اللہ" سے مراد: اس سلسلے میں مفسرین کی مختلف تفسیریں ہیں کہ آیت میں "نعمت اللہ" سے کیا مراد ہے ان میں سے زیادہ تر کوئی ایک مصداق بیان کرتی ہیں حالانکہ "نعمت اللہ" کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ تمام مادی و معنوی نعمتیں اس میں شامل ہیں یہاں تک کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی بھی اس مفہوم میں شامل ہے روایات اہل بیتؑ میں بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد آئمہ اور معصوم رہبروں کے وجود کی نعمت ہے۔
ایک روایت میں امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے:

نحن واللہ نعمۃ اللہ التی انعم بہا علی عبادہ وبنا فاز من فاز

قسم بخدا کہ جس نعمت کی وجہ سے اللہ نے بندوں پر اپنا لطف و کرم کیا ہے وہ ہم ہی ہیں اور ہمارے سبب سے سعادت مند سعید و کامیاب ہیں[1]

---

[1] نور الثقلین جلد ۳ ص ۷۰۔

Marfat.com

یہ بات واضح ہے کہ سچے رہبروں کی رہبری سے استفادہ کیے بغیر سعادت و کامیابی ممکن نہیں اور ان ہادیانِ حق کا وجود اللہ کی سب سے واضح نعمت ہے اور یہاں اس کا ذکر ایک آشکار مصداق کے طور پر کیا گیا ہے۔

۲۔ **حق و باطل میں کشمکش:** بعض مفسرین نے زیرِ بحث آیات میں "یعرفون نعمت اللہ ثم ینکرونھا" میں لفظ "ثُمَّ" پر غور و خوض کیا ہے۔ یہ لفظ عموماً، عام فاصلے کے ساتھ آنے والے عطف کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ نشاندہی کرتا ہے کہ نعماتِ الٰہی کی اس آگہی و علم اور پھر ان کے انکار کے درمیان فاصلہ تھا۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ تعبیر یہ نکتہ بیان کر رہی ہے کہ مناسب تو یہ تھا کہ وہ نعمتِ الٰہی کو پہچان لینے کے ساتھ ہی صمیم قلب سے اعتراف کرتے اور اس کی طرف آتے لیکن انھوں نے انکار کا راستہ اختیار کر لیا قرآن نے ان کے اس عمل کو دور کی بات شمار کیا ہے، اور اسے "ثُمَّ" سے تعبیر کیا ہے۔

لیکن ہم یہ احتمال پیش کرتے ہیں کہ یہاں "ثُمَّ" ایک زیادہ ظریف اور عمدہ نکتے کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ کہ جس وقت دعوتِ حق اپنے منطقی اصول کی بناء پر انسان کی روح پر پر تو ڈالے تو وہ ان منفی عوامل کے خلاف برسرِ پیکار ہو جاتی ہے کہ جو کبھی کبھی اس میں موجود ہوتے ہیں یہ پیکار ایک عرصے تک جاری رہتی ہے اور یہ عرصہ منفی عوامل کی قوت یا ضعف کے تناسب سے ہوتا ہے اگر منفی عوامل زیادہ قوی ہوں تو کچھ عرصے بعد انھیں غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے "ثُمَّ" کی تعبیر بالکل مناسب ہے۔

سورۂ انبیاء کی آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں بتایا گیا ہے کہ جب آپ نے بتوں کو توڑنے کے بعد بُت پرستوں کے سامنے اپنی قوی منطق پیش کی تو چند لمحے تو وہ سوچ میں پڑ گئے اور اپنے آپ کو ملامت کرنے لگے قریب تھا کہ وہ حق کی طرف جھکتے اور بیداری کی یہ لہر ان کے پورے وجود کو روشن کر دیتی لیکن منفی عوامل یعنی تعصب تکبر اور ہٹ دھرمی دعوتِ حق کے آڑے آ گئی...... یہ لمحات جاتے رہے اور وہ پھر سے انکار کرنے لگ پڑے۔ یہاں بھی لفظ "ثُمَّ" استعمال ہوا ہے۔

فرجعوا الی انفسھم فقالوا انکم انتم الظالمون ۝ ثم نکسوا علی رءوسھم لقد علمت ما ھؤلاء ینطقون ۝

پس وہ اپنی ضمیر کی طرف متوجہ ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگے تم تو خود ظالم ہو پھر ان کی گردنیں اسی گمراہی کی طرف مڑ گئیں اور وہ کہنے لگے کہ تم تو جانتے ہی ہو کہ یہ بُت بولا نہیں کرتے۔ (انبیاء ۶۴، ۶۵)

ضمناً کافروں کے بارے میں جو کچھ ہم نے کہا ہے اس بیان سے اس کی "ثُمَّ" کے ساتھ ہم آہنگی زیادہ واضح ہو گئی ہے۔

Marfat.com

۸۴۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا
وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ○
۸۵۔ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ
وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ○
۸۶۔ وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ
شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِنْ دُونِكَ ۖ فَأَلْقَوْا إِلَيْهِمُ
الْقَوْلَ إِنَّكُمْ لَكَاذِبُونَ ○
۸۷۔ وَأَلْقَوْا إِلَى اللَّهِ يَوْمَئِذٍ السَّلَمَ ۖ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا
يَفْتَرُونَ ○
۸۸۔ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ زِدْنَاهُمْ عَذَابًا
فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يُفْسِدُونَ ○
۸۹۔ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِي كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا عَلَيْهِمْ مِنْ أَنْفُسِهِمْ ۖ وَجِئْنَا
بِكَ شَهِيدًا عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ ۚ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ
وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ○

ترجمہ:

۸۴۔ اس دن کے بارے میں سوچو کہ جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ کو اٹھا کھڑا کریں گے پھر کافروں کو (بات کرنے کی) اجازت نہیں دی جائے گی (کیونکہ ان کے ہاتھ، پاؤں، کان اور آنکھ یہاں تک کہ ان کے بدن کی جلد بھی گواہی دے گی۔) اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔

۸۵۔ اور جب ظالم عذاب کو دیکھیں گے تو پھر انھیں تخفیف ملے گی نہ مہلت۔

Marfat.com

۸۶۔ اور جب مشرکین اپنے ان معبودوں کو دیکھیں گے کہ جنھیں وہ خدا کا شریک قرار دیتے تھے تو کہیں گے: پروردگارا! یہ ہمارے وہ شریک ہیں جنھیں ہم تیری بجائے پکارتے تھے اس وقت ان کے وہ معبود اُن سے کہیں گے: تم جھوٹ بولتے ہو۔

۸۷۔ اور اس دن سب بارگاہِ الٰہی میں جھک جائیں گے اور ان کا وہ سارا جھوٹ رفوچکر ہو جائے گا۔

۸۸۔ اور جن لوگوں نے کفر کا راستہ اپنایا اور (لوگوں کو بھی) راہِ خدا سے روکا، انھیں ہم ان کے فساد کے باعث عذاب پر عذاب دیں گے۔

۸۹۔ اس دن کے بارے میں سوچو کہ جب ہر اُمت میں خود اسی میں سے ایک گواہ ہم اٹھا کھڑا کریں گے اور تجھے ان پر گواہ بنائیں گے اور یہ (آسمانی) کتاب ہم نے تجھ پر اتاری ہے کہ جو ہر چیز کو واضح کرتی ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔

تفسیر:

جب بدکاروں کو کوئی راہ سجھائی نہ دے گی:

گزشتہ آیات میں اللہ کی گوناگوں نعمتوں پر منکرین حق کے غلط ردعمل کا ذکر تھا ان آیات میں ان منکرینِ حق کی دوسرے جہان میں بعض دردناک سزاؤں کا تذکرہ ہے کہ جو ان کا بُرا اور منحوس انجام ہے ان سزاؤں کا تذکرہ اس لیے ہے تاکہ وہ جلد اپنے طرزِ عمل پر تجدید نظر کریں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اس دن کا سوچو جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ پیش کریں گے (و یوم نبعث من کل امۃ شھیداً)[1]

یہ عبارت پڑھتے ہی فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کے لامتناہی علم کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے گواہ کی ضرورت رہ جاتی ہے۔

ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے اور وہ یہ کہ ایسے امور عام طور پر نفسیاتی پہلو سے ہوتے ہیں یعنی جتنا انسان کو احساس ہوگا کہ اس کی طرف دیکھنے والے اور گواہ زیادہ ہیں اتنا ہی اپنے کام کو بہتر حساب کتاب سے انجام دے گا یا کم از کم زیادہ افراد کے سامنے رسوائی سے ہی پریشان ہوگا۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اس عدالت میں کفار کو بات کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ (ثم لا یؤذن للذین کفروا)۔

---

[1] "یوم" یہاں ظرف ہے۔ یہ ایک فعل مقدر سے متعلق ہے جس کی تقدیر یوں تھی: "ولیذکروا" یا "واذکروا"

Marfat.com

کیا ممکن ہے کہ اللہ مجرم کو دفاع کی اجازت نہ دے؟

جی ہاں! وہاں زبان سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاتھ، پاؤں، کان، آنکھ بلکہ وہ زمین بھی جس پر انسان نے نیکی یا بدی کی ہوگی گواہی دے گی اس لیے زبان کی باری نہیں آئے گی۔

اس حقیقت کا ذکر قرآنِ حکیم کی دوسری آیات میں بھی ہے۔ مثلاً سورہ یٰس ۶۵ اور مرسلات ۳۶۔

نہ صرف انھیں بات کرنے کی اجازت نہیں ہوگی بلکہ اس وقت وہ تلافی اصلاح اور تقاضائے عفو بھی نہ کر سکیں گے (ولاھم یستعتبون)[۱] کیونکہ وہ ردِعمل کا موقع ہوگا نہ کہ عمل، تلافی اور اصلاح کا۔ جیسے کوئی پھل شاخ سے ٹوٹ جائے تو اس کی نشوونما کا زمانہ ختم ہو جاتا ہے۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: یہ ستم پیشہ ظالم جب حساب کتاب کے مرحلے سے گذر کر عذابِ الٰہی کا سامنا کریں گے تو کبھی تخفیف کا اور کبھی مہلت کا تقاضا کریں گے لیکن جب ظالم عذاب کو دیکھیں گے تو ان کے عذاب میں کمی ہوگی نہ انھیں کوئی مہلت دی جائے گی۔ (و اذا رآ الذین ظلموا العذاب فلا یخفف عنھم ولا ھم ینظرون)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ان دو آیتوں میں مجرموں کے چار مرحلوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس دنیا میں بھی یہ مرحلے ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں:

پہلا مرحلہ: یہ کہ مجرم کوشش کرے گا کہ مکر و حیلہ سے اپنے آپ کو بچالے۔

دوسرا مرحلہ: جب پہلے مرحلے میں بات نہ بنے تو وہ دوسرے مرحلے میں کوشش کرے گا کہ مدِمقابل کو مہر و محبت کی طرف مائل کرے اس کی سرزنش کو برداشت کرے اور اس کی رضا حاصل کرے۔

تیسرا مرحلہ: دوسرا مرحلہ بھی کامیاب نہ ہوا تو تیسرے مرحلے میں سزا میں کمی کا تقاضا کرے گا اور کہے گا کہ عذاب دے مگر کم۔

چوتھا مرحلہ: اگر اس کا جرم زیادہ ہونے کی وجہ سے تیسرے مرحلے پر بھی بات نہ بنی تو تقاضا کرے گا کہ مجھے کچھ مہلت دے دے اور سزا سے نجات کی یہ آخری کوشش ہوگی۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان ظالموں کے اعمال اتنے قبیح اور بُرے ہیں اور ان کے گناہوں کا بوجھ اتنا زیادہ ہوگا کہ نہ انھیں دفاع کی اجازت ملے گی نہ وہ رضا حاصل کر سکیں گے نہ انھیں تخفیف ملے گی اور نہ مہلت۔

اگلی آیت میں مشرکین کے بُرے انجام کے بارے میں ایسی ہی گفتگو کی گئی ہے ان کا یہ انجام بتوں کی پرستش کے باعث ہوگا ارشاد ہوتا ہے کہ میدانِ قیامت میں خود ساختہ معبود اور انسان کہ جن کی بتوں کی طرح پرستش کی جاتی تھی، پوجا کرنے والوں کے سامنے ہوں گے جس وقت یہ عبادت کرنے والے اپنے معبودوں کو دیکھیں گے تو کہیں گے پروردگار! یہ ہمارے

---

[۱] "یستعتبون" "استعتاب" کے مادہ سے ہے کہ جو عتاب سے لیا گیا ہے کہ جس کا معنی ہے دوسرے سے گفتگو میں سختی کا اظہار۔ لہٰذا "استعتاب" کا مفہوم یہ ہے کہ گنہگار شخص صاحبِ حق سے عتاب طلب کرے یعنی اپنے تئیں اس کی سرزنش کے سامنے پیش کرے تاکہ صاحبِ حق کا غصہ ختم ہو جائے اور وہ راضی ہو جائے یہی وجہ ہے کہ بعض "استعتاب" کا معنی "استرضاء" (کسی کی رضا طلب کرنا) لیتے ہیں حالانکہ اس کا مفہوم یہ نہیں بلکہ اس کے مفہوم کا لازمہ ہے۔

Marfat.com

وہی شریک ہیں جنھیں ہم تیری بجائے پکارتے تھے۔ (واذا رأ الذین اشرکوا ھم قالوا ربنا ھؤلاء شرکاؤنا الذین کنا ندعوا من دونک)۔
ان معبودوں نے بھی اس کام میں ہمیں وسوسے میں ڈالا اور درحقیقت ہمارے شریک جرم ہیں لہٰذا ہمارے عذاب کا کچھ حصہ ان کے لیے قرار دے۔ اس وقت حکم خدا سے "بت بول اٹھیں گے اور اپنی عبادت کرنے والوں سے کہیں گے یقیناً تم جھوٹے ہو (فالقوا الیھم القول انکم لکاذبون)۔ نہ ہم خدا کے شریک تھے اور نہ ہم نے تمھیں وسوسے میں ڈالا اور نہ تمھارے عذاب کا کوئی حصہ ہمیں پہنچے گا۔

چند قابل توجہ نکات:

۱۔ "شرکاء اللہ" کی بجائے "شرکاءھم": "شرکاء اللہ" (اللہ کے شریک) کی بجائے "شرکاءھم" (بت پرستوں کے شریک) ——— اس بناء پر ہے کہ وہ ہرگز پروردگار کے شریک نہ تھے بلکہ خیالی اور جھوٹے شریک تھے۔ کہ جو بت پرستوں نے اپنے لیے بنا رکھے تھے اور کیا ہی بہتر ہے کہ انھیں انھی کی طرف نسبت دی جائے نہ کہ خدا کی طرف۔
علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے پہلے بھی دیکھا ہے کہ بت پرست اپنے کچھ چوپائے اور زرعی پیداوار بتوں کے نام کر دیتے تھے اور اس طرح انھیں اپنا شریک بناتے تھے۔

۲۔ بے جان بت بھی پیش ہوں گے۔ زیر بحث آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ روز قیامت بت بھی ظاہر ہوں گے۔ فرعون اور نمرود کی طرح کے انسانی بت ہی وہاں پیش نہیں ہوں گے بلکہ بے جان بت بھی حاضر ہوں گے سورۂ انبیاء کی آیہ ۹۸ میں مشرکین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم

تم اور اللہ کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہیں جہنم کا ایندھن ہیں۔

۳۔ بت مشرکین کی تکذیب کریں گے: زیر بحث آیت میں ہے کہ اس دن مشرکین کہیں گے۔
ہم ان معبودوں کی پرستش کرتے تھے۔
ان کی یہ بات غلط نہیں کہ بت ان کی تکذیب کریں لیکن ہو سکتا ہے کہ یہ تکذیب اس بناء پر ہو کہ حقیقی معبود اس بات کی تکذیب کریں کہ وہ پرستش کے لائق ہیں یا شاید وہ اس بناء پر تکذیب کریں گے کہ ان کی عبادت کرنے والے یہ بھی کہیں گے کہ:

خدایا! یہ معبود ہمیں وسوسہ ڈالنے میں شریک تھے۔

لہٰذا وہ جواب دیں گے:

تم جھوٹ بولتے ہو، ہم وسوسہ نہیں ڈال سکتے تھے۔

۴۔ "فالقوا الیھم القول" کا مفہوم: اس کا معنی ہے "قول اس کی طرف القاء کرتے تھے" یہ نہیں

Marfat.com

کہا: "قالوا لھم" (انھیں کہتے تھے) یہ شاید اس بناء پر ہو کہ بُت خود سے بات کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور اگر بات کریں گے تو وہ پروردگار کی طرف سے القاء ہو گا یعنی خدا انھیں القاء قول کرے گا اور وہ اسے اپنی پوجا کرنے والوں کی طرف القاء کریں گے۔

اگلی آیت میں مزید فرمایا گیا ہے: یہ بات اور یہ جواب سننے کے بعد "سب بارگاہِ الٰہی میں جھک جائیں گے" یہ نادان عبادت کرنے والے جب حق کا چہرہ دیکھ لیں گے تو ان کے غرور، نخوت اور اندھے تعصبات کا خاتمہ ہو جائے گا اور وہ اس کی بارگاہ میں سر جھکا دیں گے (والقوا الی اللہ یومئذ السلم)۔[۱]

اس موقع پر جبکہ ہر چیز آفتاب کی مانند روشن ہو گی "ان کا سارا جھوٹ رفوچکر ہو جائے گا" (وضل عنھم ما کانوا یفترون)۔

خدا کی طرف شریک کی جھوٹی نسبت بھی بادِ ہوا ہو جائے گی اور یہ خیال بھی محو ہو جائے گا کہ بُت بارگاہِ الٰہی میں شفیع ہیں کیونکہ سب اچھی طرح دیکھ لیں گے کہ نہ صرف بُت کچھ نہیں کر سکتے بلکہ خود بھی جہنم کا ایندھن بن رہے ہیں۔

یہاں تک ان گمراہ مشرکین کی حالت بیان کی گئی ہے کہ جو خود شرک و انحراف میں غوطہ زن تھے مگر دوسروں کو اس راہ کی طرف دعوت نہ دیتے تھے۔ اب ان لوگوں کی حالت بیان کی جا رہی ہے کہ جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کے درپے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: وہ لوگ جو کافر ہو گئے ہیں اور لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے ہیں ان کے کفر کے عذاب پر ہم دوسروں کو گمراہ کرنے کے عذاب کا اضافہ کریں گے کیونکہ وہ فساد برپا کرتے ہیں (الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ زدناھم عذابا فوق العذاب بما کانوا یفسدون)۔

وہ اپنی ذمہ داری کا بوجھ بھی اپنے کندھے پر اٹھاتے ہیں اور دوسروں کے شریکِ جرم بھی ہوتے ہیں یہ لوگ زمین پر فساد اور برائی کا سبب بنتے ہیں، خلقِ خدا کی گمراہی کا باعث ہوتے ہیں اور راہِ حق پر چلنے والوں کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔

ہم نے کئی مرتبہ بیان کیا ہے کہ اسلام کی اجتماعی منطق کے لحاظ سے جو شخص بھی کوئی اچھی یا بُری روایت قائم کرتا ہے اس روایت پر عمل کرنے والوں کے عمل میں شریک ہے۔ ایک مشہور حدیث میں ہے:

> جو شخص کسی اچھی سُنت کی بنیاد رکھتا ہے اس پر عمل کرنے والوں کا اجر اُسے ملے گا جب کہ عمل کرنے والوں کی جزا بھی کم نہ ہو گی۔ اسی طرح جو کوئی بُری سنت کی بنیاد رکھتا ہے، اس پر عمل کرنے والے سب لوگوں کے گناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھے جاتے ہیں جبکہ عمل کرنے والوں کے

---

[۱] المیزان کے محترم مؤلف اور بعض دیگر مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اظہار تسلیم یہاں صرف عبادت کرنے والوں کی طرف سے ہو گا نہ کہ بتوں کی طرف سے۔ ان مفسرین نے آیت کے آخری جملے کو شہادت کے طور پر پیش کیا ہے۔

Marfat.com

گناہ میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔

بہر حال قرآن اور احادیث کے لرزا دینے والے یہ الفاظ اللہ اور مخلوقِ خدا کے بارے میں رہبروں اور راہنماؤں کی ذمہ داری کو واضح کرتے ہیں۔

قبل کی چند آیات میں ہر امت میں گواہ ہونے کا ذکر آیا تھا۔ اب پھر وہی گفتگو کچھ مزید وضاحت کے ساتھ آئی ہے ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کا سوچو جب ہم ہر امت کے لیے اسی میں سے ایک گواہ اٹھا کھڑا کریں گے (ویوم نبعث فی کل امۃ شھیدًا علیھم من انفسھم)۔

علم خدا ہر چیز پر محیط ہے مگر پھر ہر اُمت کے لیے خود اسی میں سے گواہ کا ہونا اس بات پر مزید تاکید کرتا ہے کہ انسانوں کے اعمال کی مسلسل نگرانی کی جارہی ہے یہ ایک تنبیہ بھی ہے۔

اس عام حکم میں اگرچہ مسلمان بھی شامل ہیں، رسولِ اسلام بھی، لیکن اس بات پر مزید تاکید کے طور پر بالخصوص فرمایا گیا ہے: اور تجھے ہم ان مسلمانوں پر شاہد قرار دیں گے (وجئنا بک شھیدًا علٰی ھٰؤلاء)۔

جو کچھ کہا گیا ہے اس کی بناء پر "ھٰؤلاء" سے مراد وہ مسلمان ہیں کہ جو زمانہ پیغمبر میں تھے اور رسول اللہؐ ان کے اعمال پر ناظر و شاہد تھے لہٰذا فطرتاً رسول اللہ کے بعد امت میں کوئی ایسا شخص ہونا چاہیے کہ جو بعد والوں پر شاہد ہو اور شاہد کسی ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو خود ہر قسم کے گناہ اور خطا سے پاک ہو تا کہ وہ شہادت کا حق اچھی طرح سے ادا کر سکے۔ اسی بناء پر بعض شیعہ و سُنّی مفسرین نے آیت کو ہر زمانے میں حجت عادل اور شاہد عادل کے وجود پر دلیل قرار دیا ہے البتہ شیعہ کہ جو ہر زمانے میں امام معصوم کے وجود پر اعتقاد رکھتے ہیں، ان کے لیے اس کی تفسیر واضح ہے لیکن اہل سنت علماء کے لیے اس کی توجیہ آسان نہیں ہے۔

شاید اسی مشکل کی بناء پر فخرالدین رازی اپنی تفسیر میں ایسے توجیہ میں اُلجھے ہیں کہ جو اشکال سے خالی نہیں ہے وہ کہتے ہیں:

> اس آیت سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوتا جب لوگوں پر گواہ نہ ہو اور گواہ کو جائز الخطا نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کے لیے بھی ایک گواہ کی ضرورت ہوگی اور اس معاملے کا سلسلہ لامتناہی ہو جائے گا ہر زمانے میں ایسے افراد کو ہونا چاہیے کہ جن کی گفتار اور قول حجت ہو اس معاملے کا اس کے سوا کوئی حل نہیں کہ ہم کہیں کہ اجماعِ امت حجت ہے (یعنی ہر زمانے کے تمام لوگ باہم مل کر کبھی راہِ خطا اختیار نہیں کریں گے)[1]

جناب فخرالدین رازی اپنے عقائد کی قید سے تھوڑا سا باہر نکل آتے تو یقیناً ایسی تعصب آمیز گفتگو میں مبتلا نہ ہوتے

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۲۰ ص ۹۸

Marfat.com

کیونکہ قرآن کہتا ہے:

ہر اُمت کے لیے خود اسی کی نوع میں سے ہم نے ایک گواہ بنایا ہے۔

قرآن یہ نہیں کہتا کہ اجماعِ اُمت ہر فردِ امت کے لیے حُجت اور گواہ ہے۔

البتہ جیسا کہ ہم نے سورۂ نساء کی آیت ۴۱ کے ذیل میں — تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ" ھٰؤلاء " کی تفسیر میں دو اور احتمال بھی ذکر کیے گئے ہیں۔

پہلا یہ کہ" ھٰؤلاء " گزشتہ امتوں کے گواہوں یعنی انبیاء و اوصیاء کی طرف اشارہ ہے لہٰذا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس اُمت پر بھی گواہ ہیں اور گزشتہ انبیاء پر بھی۔

دوسرا یہ کہ شاہد اور گواہ سے مراد عملی گواہ ہے یعنی وہ شخص کہ جس کا وجود نمونہ، ماڈل اور حق و باطل کی پہچان کے لیے میزان ہے۔

مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۳ ص ۲۸۲ (اُردو ترجمہ) کی طرف رجوع فرمائیں۔

شہید اور گواہ مقرر کرنا اس بات کی دلیل ہے انسان کے لیے پہلے سے ایک ایسا مکمل اور جامع پروگرام موجود ہے کہ جس سے سب پر حجت تمام ہو جاتی ہے تبھی تو نگرانی کا صحیح مفہوم پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا ساتھ ہی فرمایا گیا ہے اور ہم نے یہ آسمانی کتاب (قرآن مجید) تجھ پر نازل کی ہے کہ جس میں ہر چیز کا واضح بیان موجود ہے (ونزلنا عليك الكتاب تبيانًا لكل شيءٍ)۔

یہ ہدایت بھی ہے اور رحمت بھی اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے بشارت بھی ہے (وهدى ورحمة وبشرىٰ للمسلمين)۔

چند اہم نکات:

۱۔ قرآن سب کچھ واضح کرتا ہے: مندرجہ بالا آیات میں سب سے اہم بات یہ آئی ہے کہ قرآن "تبيانًا لكل شيءٍ" (ہر چیز کا واضح بیان) ہے۔ "تبیان" ("ت" پر زبر یا زیر کے ساتھ) مصدری معنی رکھتا ہے یعنی "بیان کرنا"[1] اس تعبیر سے "لكل شيءٍ" کے مفہوم کی وسعت کی طرف توجہ کی جائے تو یہ واضح استدلال کیا جا سکتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے لیکن اس نکتے کی طرف توجہ کرتے ہوئے کہ قرآن ایک تربیتی اور انسان ساز کتاب ہے کہ جو ہر پہلو سے معاشرے کے کمال و ترقی کے لیے نازل ہوئی ہے واضح ہو جاتا ہے کہ تمام چیزوں سے مراد وہ تمام امور ہیں جو اس سفر کے لیے ضروری ہیں نہ یہ کہ قرآن ایک بہت بڑا دائرۃ المعارف ہے کہ جس میں ریاضی، جغرافیہ، کیمیا، فزکس، فزیالوجی وغیرہ کی تفصیلات

---

[1] آلوسی نے روح المعانی میں بعض عربی ادیبوں سے نقل کیا ہے کہ وہ تمام مصدر جو "تفعال" کے وزن میں آتے ہیں "ت" کی زبر کے ساتھ ہیں سوائے "تبیان" اور "تلقاء" کے۔ ضمناً اس لفظ کو بعض نے مصدر اور بعض نے اسم مصدر سمجھا ہے۔

Marfat.com

بیان کی گئی ہیں۔ اگرچہ قرآن نے تمام علوم کے حصول کی ایک کلی دعوت دی ہے کہ جس میں مذکورہ اور غیر مذکورہ سب علوم جمع ہیں۔ علاوہ کبھی کبھی اس نے توحیدی اور تربیتی مباحث کی مناسبت سے علوم کے حساس حصوں سے پردہ اٹھایا ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود جس چیز کے لیے قرآن نازل ہوا ہے اور جو قرآن کا اصلی اور آخری ہدف ہے وہ انسان سازی ہی ہے اور اس سلسلے میں اس نے کسی چیز کو فروگذاشت نہیں کیا۔

بعض اوقات قرآن ان سب مسائل کی جزئیات تک کا ذکر کرتا ہے اور مسئلے کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بیان کر دیتا ہے (مثلاً تجارتی معاہدے اور قرض کے لیے اسناد لکھنے کے احکام کہ جو قرآن کی طویل ترین آیت میں بیان کیے گئے ہیں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲ میں اس سلسلے میں ۱۸ احکام بیان ہوئے ہیں)[1]

کبھی قرآن انسانی زندگی کے مسائل کو کلی صورت میں بیان کرتا ہے مثلاً یہ آیت کہ جس کی تفسیر بعد میں آرہی ہے۔

ان الله یأمر بالعدل و الاحسان و ایتاء ذی القربیٰ و ینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی

یقیناً اللہ عدل واحسان کا حکم دیتا ہے اور وہ فرمان دیتا ہے کہ قریبیوں کو عطا کرو۔ نیز وہ برائی نافرمانی اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

اسی طرح بعض امور کو بڑے وسیع مفہوم کے اعتبار سے بیان کیا گیا ہے۔

ایفائے عہد کے بارے میں ہے:

ان العھد کان مسئولاً

یقیناً عہد کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ (بنی اسرائیل — ۳۴)

اسی طرح اس آیت میں بھی مفہوم بہت وسیع ہے۔

اوفوا بالعقود (اپنے اقراروں کو پورا کرو۔) (مائدہ — ۱)

حق جہاد کی ادائیگی کے لازمی ہونے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وجاھدوا فی الله حق جھادہ

اور راہ خدا میں ایسا جہاد کرو کہ اس کا حق جہاد ادا ہو جائے۔ (حج — ۷۸)

اسی طرح قیام عدل کا وسیع مفہوم کے اعتبار سے بیان فرمایا گیا ہے۔

لیقوم الناس بالقسط (تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں)۔ (حدید — ۲۵)

تمام امور میں نظم کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

والسماء رفعھا و وضع المیزان الا تطغوا فی المیزان و اقیموا الوزن

---

[1] تفسیر نمونہ جلد ۲ ص ۲۲۱ (اردو ترجمہ) کی طرف رجوع کریں۔

Marfat.com

بالقسط ولا تخسروا المیزان[۱] (رحمٰن ــــ ۷تا۹)

زمین میں ہر قسم سے فتنہ وفساد اور برائی سے اجتناب کا حکم اس وسیع مفہوم میں پیش کرتا ہے۔

ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا

جب زمین میں اصلاح ہو چکی تو اس میں فتنہ وفساد برپا نہ کرو (اعراف ــــ ۸۵)

اسی طرح بہت سی آیات میں تدبّر، تفکّر اور تعقل کی دعوت دی گئی ہے اور یہ بہت سی قرآنی آیات میں موجود ہے اس طرح کے ہمہ گیر انسانی پروگرام کہ جو ہر سمت کی راہیں کھولتے ہیں اس امر کی روشن دلیل ہیں کہ قرآن میں تمام چیزوں کا بیان ہے یہاں تک کہ ان کلی احکام کی فروعات بھی معین کیے بغیر نہیں چھوڑی گئیں۔ نیز جس مرکز سے احکام اور پروگرام جاری اور بیان ہونا ہیں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

وما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا

جس چیز کا تمھیں رسول حکم دیں اس پر عمل کرو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

(حشر ــــ ۷)

قرآن کے بے کنار سمندر میں انسان جس قدر شناوری کرتا ہے اور اس کی گہرائی سے سعادت بخش پروگراموں کے موتی نکال کر لاتا ہے اس آسمانی کتاب کی عظمت، وسعت اور جامعیت زیادہ آشکار ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو مسلمان حیات انسانی کی راہنمائی کے لیے اِدھر اُدھر ہاتھ پھیلاتے ہیں انھوں نے یقیناً قرآن کو نہیں پہچانا اور جو کچھ خود ان کے پاس ہے اس کی آرزو دوسروں سے کرتے ہیں۔

یہ آیت ہر پہلو سے اسلامی تعلیمات کی اصالت و استقلال کو واضح کرنے کے علاوہ مسلمانوں پر ایک بھاری ذمہ داری بھی عائد کرتی ہے کہ انھیں جس چیز کی احتیاج ہو اس قرآن سے حاصل کریں۔

اس آیت اور ایسی دیگر آیات کے حوالے سے اسلامی روایات میں جامعیتِ قرآن پر بہت زور دیا گیا ہے ان میں سے ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے، آپ فرماتے ہیں۔

ان اللّٰہ تبارک و تعالیٰ انزل فی القراٰن تبیان کل شیء حتی و اللّٰہ ما ترک شیئًا تحتاج الیہ العباد، حتی لا یستطیع عبد یقول لو کان ھٰذا، انزل فی القراٰن، الا و قد انزلہ اللّٰہ فیہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں ہر چیز بیان کی ہے۔ خدا کی قسم! جو چیز لوگوں کی ضرورت ہے اسے ترک نہیں کیا تاکہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے کہ کاش فلاں حکم قرآن میں نازل ہوتا، لہذا اسے نازل کیا گیا ہے[۲]

ایک دیگر حدیث میں امام باقر علیہ السلام سے مروی ہے:

---

[۱] ترجمہ: اور اسی نے آسمان بلند کیا اور ترازو (انصاف) کو قائم کیا تاکہ تم لوگ ترازو (سے تولنے) میں حد سے تجاوز نہ کرو اور انصاف کے ساتھ ٹھیک تولو اور تول کم نہ کرو۔

[۲] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۷۰۔

Marfat.com

ان اللہ تبارک وتعالیٰ لم یدع شیئًا تحتاج الیہ الامۃ الا انزلہ فی کتابہ و بینہ لرسولہ (ص) وجعل لکل شیء حدًا ، وجعل علیہ دلیلا یدل علیہ ، وجعل علی من تعدی ذٰلک الحد حدًا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کوئی ایسی چیز جس کی اس اُمت کو ضرورت تھی اپنی کتاب میں فروگذاشت نہیں کی اور اسے اپنے رسول سے بیان کیا ہے اس نے ہر چیز کے لیے ایک حد مقرر کر دی ہے اور اس پر ایک واضح دلیل قائم ہے اور ہر اس شخص کے لیے حد اور سزا مقرر ہے جو اس حد سے تجاوز کرے۔[1]

یہاں تک کہ اسلامی روایات میں اس مسئلے کی واضح نشاندہی کی گئی ہے کہ ظاہر قرآن کہ جسے عام لوگ اور علماء سمجھ لیتے ہیں کے علاوہ باطنِ قرآن بھی ایک وسیع سمندر ہے جس میں بہت سے مسائل مخفی ہیں کہ جہاں تک ہماری فکر نہیں پہنچ سکتی۔ قرآن کا یہ پہلو خاص اور پیچیدہ علم کا حامل ہے کہ جو رسول اللہ اور ان کے سچے اوصیاء کی دسترس میں ہے جیسا کہ ایک حدیث میں امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے:۔

ما من امر یختلف فیہ اثنان الا ولہ اصل فی کتاب اللہ عز وجل ولکن لا تبلغہ عقول الرجال۔

ہر امر کہ جن کے بارے میں دو افراد کے درمیان بھی اختلاف ہو اس کے بارے میں قرآن میں ضابطہ موجود ہے لیکن لوگوں کی عقل و دانش اس تک نہیں پہنچ سکتی۔[2]

جو چیز عام لوگوں کی دسترس میں نہیں اسے انسان کے وجدان ناخودآگاہ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے البتہ یہ اس چیز سے مانع نہیں کہ اس کے خودآگاہ اور ظاہری حصے سے سب استفادہ کر سکتے ہیں۔

۲۔ ہدایت کے چار مرحلے : یہ بات جاذبِ توجہ ہے کہ زیرِ بحث آیت میں نزولِ قرآن کا مقصد بیان کرتے ہوئے چار تعبیریں آئی ہیں:

۱۔ تبیانًا لکل شیء قرآن میں ہر چیز کا واضح بیان ہے:

۲۔ باعثِ ہدایت ہے (ھدی)۔

۳۔ سببِ رحمت ہے (ورحمۃ)۔

۴۔ تمام مسلمانوں کے لیے موجبِ بشارت ہے (وبشریٰ للمسلمین)۔

---

[1] نور الثقلین جلد ۳ ص ۷۰۔

[2] نور الثقلین جلد ۳ ص ۵۔

Marfat.com

اگر صحیح طور پر غور و فکر کیا جائے تو ان چار مراحل میں واضح منطقی تعلق دکھائی دے گا۔ کیونکہ انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کے راستے میں پہلا مرحلہ بیان اور آگاہی کا ہے۔ اور مسلم ہے کہ آگاہی کے بعد ہدایت اور راہ پانے کا مرحلہ ہے اور اس کے بعد عمل کرنے کی باری ہے کہ جو باعثِ رحمت ہے۔ اور آخرکار جب انسان مثبت اور صالح عمل انجام دے لے تو وہ دیکھے گا کہ اسے اللہ تعالٰی کی طرف سے لامحدود جزاء ملے گا۔ کہ جو اس راہ کے تمام راہیوں کے لیے بشارت و سرور کا باعث ہے۔

Marfat.com

۹۰۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ ○

ترجمہ:

۹۰۔ اللہ عدل واحسان اور قریبیوں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور برائیوں، نافرمانیوں اور ظلم سے منع کرتا ہے۔ اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے کہ شاید تم سبق لو۔

تفسیر:

نہایت جامع معاشرتی پروگرام:

گذشتہ آیت میں تھا کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔ زیرِ نظر آیت میں تعلیمات اسلام کا ایک جامع اجتماعی انسانی اور اخلاقی پروگرام پیش کیا ہے۔ یہاں آیت میں چھ اہم اصول بیان کیے گئے ہیں۔ تین مثبت پہلو سے ہیں، اور تین منفی پہلو سے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اللہ عدل واحسان اور اسی طرح قریبیوں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے (ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربٰی)۔

عدل سے بڑھ کر کون سا قانون وسیع اور جامع متصور ہو سکتا ہے۔ عدل وہی قانون ہے جس کے محور پر تمام نظامِ ہستی گردش کرتا ہے۔ آسمان وزمین اور تمام موجودات عدالت کے ساتھ قائم ہیں (بالعدل قامت السمٰوت والارض)۔

انسانی معاشرہ اس وسیع عالمِ ہستی کا ایک گوشہ ہے۔ یہ معاشرہ عالمِ ہستی کے اس عمومی قانون سے الگ نہیں ہو سکتا اور عدل کے بغیر صحیح طرح اپنی زندگی جاری نہیں رکھ سکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ عدل کا حقیقی معنیٰ ہے کہ ہر چیز اپنی جگہ پر ہو لہٰذا ہر قسم کا انحراف، افراط وتفریط، حد سے تجاوز اور دوسروں کے حقوق کا استحصال عدالت کے برخلاف ہے۔ ایک صحیح انسان وہ ہے جس کے بدن کے تمام حصے بغیر کسی کمی بیشی کے اپنا اپنا کام کریں جب کبھی اس کا کوئی ایک یا کچھ حصے اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں کوتاہی کریں یا تجاوز کریں تو فوراً سارے بدن پر خرابی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں اور بیماری یقینی طور پر آجاتی ہے۔

سارا انسانی معاشرہ بھی ایک انسانی بدن کی طرح ہے۔ اگر عدل ملحوظ نہ رکھا جائے تو یہ بیمار ہو جائے گا۔

لیکن چونکہ بعض بحرانی واستثنائی مواقع پر تنہا عدالت اپنے جاہ وجلال اور گہرائی کے ساتھ کارساز نہیں ہوتی۔ لہٰذا ساتھ ہی

Marfat.com

احسان کا حکم دیا گیا ہے۔

زیادہ واضح الفاظ میں انسانوں کی طویل زندگی میں ایسے حساس مواقع بھی آجاتے ہیں کہ جب مشکلات کا حل عدالت کی مدد سے ممکن نہیں ہوتا بلکہ ایثار، درگذر اور قربانی کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کا مفہوم "احسان" میں مضمر ہے۔

مثلاً ایک غدار اور دھوکا باز دشمن نے علاقے پر حملہ کر دیا۔ یا طوفان، سیلاب اور زلزلے نے ملک کا ایک حصّہ تباہ کر دیا ہے۔ اب اگر لوگ ان حالات میں اس انتظار میں رہیں کہ مالی لحاظ سے اور دیگر لحاظ سے عادلانہ قوانین ان مسائل کو حل کریں تو یہ ممکن نہیں ہے ایسے مواقع پر وہ تمام لوگ کہ جن کے پاس زیادہ وسائل ہیں، جن کے پاس فکری، جسمانی اور مالی طاقت ہے انھیں چاہیے کہ ایثار و قربانی سے کام لیں اور اپنی طاقت کے مطابق ایثار کریں۔ ورنہ ہوسکتا ہے ظالم دشمن سارے ملک کو ختم کر دے یا قدرتی آفات بہت سے لوگوں کو بالکل مفلوج کر دیں۔

اتفاق کی بات ہے کہ یہ دونوں اصول ایک انسان کے بدن میں بھی فطری طور پر کارفرما ہیں۔ عام حالات میں بدن کے تمام حصّے ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں اور ہر عضو سارے بدن کے لیے کام کرتا ہے اور دوسرے اعضاء کی خدمات سے بہرہ مند ہوتا ہے یہ دراصل عدالت ہی ہے لیکن جب کبھی ایک عضو زخمی ہوجاتا ہے اور مقابلتہً خدمت کی قوت کھو بیٹھتا ہے تو کیا ممکن ہے اس حالت میں باقی اعضاء اسے بھلا دیں کیونکہ وہ بیکار ہوگیا ہے۔ کیا ممکن ہے زخمی عضو کا دوسرے اعضاء ساتھ نہ دیں اور اسے غذا نہ پہنچائیں؟ یقیناً ایسا نہیں ہے ــــــــــ یہ دراصل احسان ہی ہے۔

سارے انسانی معاشرے پر بھی یہ دو اصول کارفرما ہونے چاہییں ورنہ معاشرہ صحیح و سالم نہیں ہوسکتا۔

اسلامی روایات اور اسی طرح مفسرین کے اقوال میں عدل و احسان کے درمیان فرق کے بارے میں مختلف بیانات دکھائی دیتے ہیں جو شاید زیادہ تر اسی مفہوم کی طرف لوٹتے ہیں جو ہم نے سطور بالا میں بیان کیا ہے۔

ایک حدیث میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے:

العدل الانصاف، و الاحسان التفضل

عدل یہ ہے کہ لوگوں کے حقوق ان تک پہنچائے جائیں اور احسان یہ ہے کہ ان پر تفضّل کیا جائے۔[1]

اسی چیز کی طرف سطور بالا میں اشارہ کیا جاچکا ہے۔

بعض نے کہا ہے:

"عدل" توحید ہے اور "احسان" واجبات کی ادائیگی ہے۔

اس تفسیر کی بناء پر "عدل" اعتقاد کی طرف اور "احسان" عمل کی طرف اشارہ ہے۔

بعض نے کہا ہے:

"عدالت" ظاہر و باطن کی ہم آہنگی کا نام ہے اور "احسان" یہ ہے کہ انسان کا باطن اس کے

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار، جملہ ۲۳۱۔

Marfat.com

ظاہر سے بہتر ہو۔
بعض دیگر مفسّرین نے عدالت کو عملی پہلوؤں سے مربوط سمجھا ہے اور" احسان" کو گفتار کے ساتھ۔
لیکن ـــــــ جیسا کہ ہم نے کہا ہے ان میں سے بعض تفاسیر ہمارے ذکر کردہ مفہوم سے ہم آہنگ ہیں اور دوسری بھی اس کے منافی نہیں ہے اور اس قابل ہیں کہ سب کو اس آیت میں جمع سمجھا جائے۔
رہا" ایتاءِ ذی القربیٰ" یعنی قریبیوں کے ساتھ نیکی کرنے کا مسئلہ تو یہ درحقیقت مسئلہ احسان کا ایک حصّہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ" احسان" پورے معاشرے کے ساتھ ہے اور" ایتآء ذی القربیٰ" خصوصیّت سے اقربا اور وابستگان کے ساتھ ہے کہ جو ایک چھوٹا معاشرہ شمار ہوتا ہے یہ خاندان معاشرے کی ایک اکائی ہے اگر اس میں باہمی اتحاد ہو گا تو اس کا اثر پورے معاشرے پر مرتّب ہوگا۔ درحقیقت اس طرح لوگوں میں فرائض اور ذمّہ داریاں صحیح صورت میں تقسیم ہوتی ہیں، کیونکہ ہر گروہ ذرا پہلے درجے میں اپنے اقرباء میں سے کمزور افراد کی دستگیری کرے گا تو اس طرح سے تمام افراد کے اپنے اقرباء کے ساتھ خوشگوار مراسم قائم ہو جائیں گے۔
بعض احادیث اسلامی میں ہے کہ" ذی القربیٰ" سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیکی یعنی آئمہ اہل بیت علیہم السّلام ہیں اور" ایتآء ذی القربیٰ" سے مراد خمس کی ادائیگی ہے۔
اس تفسیر کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ آیت کا مفہوم محدود کر دیا جائے بلکہ کوئی مانع نہیں کہ آیت اپنے وسیع مفہوم میں باقی رہے اور یہ مفہوم دراصل اس کے عمومی مفہوم کا ایک روشن مصداق ہے۔
اور اگر ہم" ذی القربیٰ" کو مطلق طور پر نزدیکیوں کے معنی میں لیں ـــــــ چاہے وہ نسب اور خاندان کے اعتبار سے نزدیکی ہوں یا کسی اور اعتبار سے نزدیکی ـــــــ تو آیت کا مفہوم اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اس طرح اس کے مفہوم میں ہمسایے، دوست اور اس قسم کے دیگر قریبی بھی شامل ہو جائیں گے۔ اگرچہ" ذی القربیٰ" کا مشہور معنی وہی" اقرباء و خویش" ہی ہے۔
چھوٹے معاشرہ (یعنی اقرباء و اعزاء) کی مدد میں چونکہ خود انسان کے احساسات، کارفرما ہوتے ہیں لہذا اجراء کے لحاظ سے یہ حکم زیادہ قوی تر ہے۔
ان تین مثبت اصولوں کے ذکر کے بعد تین ممانعتوں کا ذکر شروع ہوتا ہے فرمایا گیا ہے: اللہ" فحشاء"،" منکر" اور" بغی" کی ممانعت کرتا ہے (وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی)۔
"فحشاء"،" منکر" اور" بغی" کے مفہوم کے بارے میں بھی مفسّرین میں بہت اختلاف ہے لیکن ان کے لغوی معانی کو ایک دوسرے کے قرینے سے دیکھا جائے تو زیادہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ" فحشاء" سے مراد چھپے ہوئے گناہ ہیں" منکر" کھلے عام گناہوں کو کہتے ہیں اور" بغی" اپنے حق سے ہر قسم کے تجاوز، ظلم اور اپنے تئیں دوسرے سے بڑا سمجھنے کی طرف اشارہ ہے۔
بعض مفسّرین[1] نے کہا ہے کہ اخلاقی انحراف کا سرچشمہ تین قوتیں ہیں:

---

[1] تفسیر فخرالدین رازی جلد ۲۰ ص ۱۰۴

Marfat.com

۱۔ قوّتِ شہوانی

۲۔ قوّتِ غضبی

۳۔ قوّتِ وہمی شیطانی

قوتِ شہوانی: انسان کو زیادہ سے زیادہ لذتیں حاصل کرنے پر اُبھارتی ہے اور اسے فحشاء میں غرق کر دیتی ہے۔

قوتِ غضبی: انسان کو منکرات انجام دینے اور لوگوں کو اذیت پہنچانے پر انگیخت کرتی ہے۔

قوتِ وہمی شیطانی: انسان کو مقام و منصب اور بڑا بننے پر ابھارتی ہے اور انسان کی منظر کو فقط اس کی اپنی ذات تک محدود کر دیتی ہے انسان میں دوسروں کے حقوق پر تجاوز کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور اسے ایسے کاموں پر اکساتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ تعبیرات کے ذریعے ان جبلتوں کی سرکشی پر تنبیہ کی ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں ایک جامع بیان کہ جس میں یہ تمام اخلاقی انحرافات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کے ذریعے راہِ حق کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔

آیت کے آخر میں ان چھ اصولوں پر ایک اور تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے شاید تم خیال کرو اور عمل کرنے لگو (یعظکم لعلکم تذکرون)۔

خیر و شر کے بارے میں جامع ترین آیات:

اس آیت کی جاذبیت اور طرزِ بیان کے بارے میں یہ روایت ملاحظہ ہو:

عثمان بن مظعون رسولِ اکرمؐ کے مشہور صحابہ میں سے تھے، وہ کہتے ہیں:

شروع میں مَیں نے اسلام ظاہری طور پر ہی قبول کیا تھا اور دل سے اُسے نہیں مانا تھا وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ بارہا مجھے اسلام کی دعوت دیتے۔ شرم کی وجہ سے میں نے قبول کر لیا میری یہ کیفیت یونہی رہی یہاں تک کہ ایک روز میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا میں نے دیکھا کہ آپ بہت گہری فکر میں ہیں اور سخت پریشان ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اچانک آپ نے اپنی نظریں آسمان پر گاڑ دیں، یوں لگتا تھا جیسے کوئی پیغام وصول کر رہے ہیں یہ حالت ختم ہوئی تو میں نے ماجرا پوچھا تو آپؐ نے فرمایا:

جس وقت میں تم سے باتیں کر رہا تھا، اچانک میں نے جبرئیل کو دیکھا وہ میرے پاس یہ آیت لے کر آئے تھے:۔

ان اللہ یأمر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربٰی۔

آپ نے میرے سامنے یہ آیت پوری تلاوت کی تو اس کے مضمون نے میرے دل پر ایسا اثر کیا کہ اسی وقت اسلام میری روح میں اُتر گیا میں آپ کے چچا ابو طالب کے پاس گیا اور انھیں یہ واقعہ سنایا تو انھوں نے فرمایا:

Marfat.com

اے اہلِ قریش ! محمد (ص) کی پیروی کرو تو ہدایت پاؤ گے کیونکہ وہ تمہیں مکارمِ اخلاق کے سوا کسی چیز کی دعوت نہیں دیتا۔

پھر میں ولید بن مغیرہ کے پاس گیا (یہ مشہور عالم اور مشرکین کا ایک سردار تھا) یہی آیت میں نے اس کے سامنے پڑھی تو اس نے کہا:

اگر یہ بات خود محمد (ص) کی طرف سے ہے تو بہت عمدہ ہے اور اگر اس کے خدا کی طرف سے ہے تو بھی بہت ہی اچھی ہے۔[1]

ایک اور حدیث میں ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کے سامنے پڑھی تو اس نے کہا برادرزادہ![2] اسے پھر پڑھنا۔

رسول اللہ نے یہ آیت پھر پڑھی تو ولید نے کہا:

ان له لحلاوة، و ان عليه لطلاوة، و ان اعلاه لمثمر، و ان اسفله لمغدق، وما هو قول البشر۔

یہ خاص مٹھاس، حسن اور درخشندگی کی حامل ہے اس کی شاخیں پُر بار ہیں اور اس کی جڑیں پُر برکت ہیں اور کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور حدیث مروی ہے، آپؐ نے فرمایا:

جماع التقوٰی فی قوله تعالٰی ان الله یأمر بالعدل و الاحسان

تقوٰی سارے کا سارا خدا کے اس ارشاد میں ہے۔ ان الله یأمر بالعدل و الاحسان۔[4]

مذکورہ بالا احادیث اور دیگر متعدد احادیث سے یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہو جاتی ہے کہ زیرِ نظر آیت اسلام کا ایک ہمہ گیر حکم، اسلام کے ایک بنیادی قانون اور اس کے عالمی منشور کی بنیاد کے طور پر ہمیشہ مسلمانوں کے ہاں بہت اہم رہی ہے یہاں تک کہ ایک حدیث کے مطابق جب امام باقر علیہ السلام نمازِ جمعہ پڑھاتے تو خطبہ نماز کے آخر میں آپ یہی آیت تلاوت فرماتے اور اس کے بعد ان الفاظ میں دُعا کرتے۔

اللّٰھم اجعلنا ممن یذکر فتنفعه الذکرٰی

---

[1] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[2] بھائی کا بیٹا، اس نے اس لیے کہا کہ ولید بن مغیرہ ابوجہل کا چچا تھا اور یہ دونوں قریش میں سے تھے۔

[3] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

[4] نور الثقلین جلد ۳ ص ۱۷۸۔

Marfat.com

خداوندا! ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو پند ونصیحت کو سنتے ہیں اور یہ اُن کے لیے مفید ثابت ہوتی ہے۔

اس کے بعد آپ منبر سے اُتر آتے۔[1]

اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا ہر قسم کی بدبختی، فساد اور بُرائی سے پاک ہوجائے تو اس کے لیے کافی ہے کہ ان تین اصولوں پر عمل کیا جائے:

۱۔ عدل ۲۔ احسان ۳۔ ایتاء ذی القربیٰ

اور ان تین انحرافات کا سطح ارض سے خاتمہ کر دیا جائے:

۱۔ فحشاء ۲۔ منکر اور ۳۔ بغی

مشہور صحابئ رسول ابنِ مسعود سے منقول ہے کہ انھوں نے کہا:

یہ آیت قرآن میں خیر اور شر کے بارے میں جامع ترین آیت ہے۔

ان کے اس قول کی بھی یہی وجہ ہے جو بیان کی جاچکی ہے۔

اس آیت کا مفہوم ہمیں رسولِ اکرمؐ کی ایک لرزا دینے والی حدیث یاد دلاتا ہے، آپؐ نے فرمایا:۔

صنفان من امتی اذا صلحا صلحت امتی و اذا فسد فسدت امتی

میری اُمت کے دو گروہ ایسے ہیں کہ اگر ان کی اصلاح ہوجائے گی تو میری امت کی اصلاح ہوجائے گی اور وہ فاسد اور خراب ہوجائیں گے تو میری اُمت فاسد ہوجائے گی۔

آپؐ سے پوچھا گیا:

"یارسول اللہؐ! یہ دو گروہ کون سے ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

الفقہاء و الامراء

علماء اور امراء و اہلِ اقتدار۔

محدث قمی، "سفینۃ البحار" میں یہ حدیث نقل کرنے کے بعد پیغمبر اکرمؐ کی ایک اور حسبِ حال حدیث نقل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا:۔

قال تکلم النار یوم القیٰمۃ ثلاثۃ! امیرًا، و قاریًا، و ذا ثروۃ من المال، فیقول للامیر یا من وھب اللہ لہ سلطانًا فلم یعدل، فتزدرد کما تزدرد الطیر حب السمسم، وتقول للقاری یا من تزین للناس و بارز اللہ

---

[1] نورالثقلین جلد ۳ ص ،، بحوالہ کافی

Marfat.com

بالمعاصی فتزدردہ، و تقول للغنی یا من وھب اللہ لہ دنیا کثیرۃ واسعۃ فیضًا وسئلہ الحقیر الیسیر قرضًا فابی الا بخلا فتزدردہ۔

قیامت کے دن جہنم کی آگ تین گروہوں سے بات کرے گی۔ اہل اقتدار، علماء اور دولت مند۔
اہل اقتدار سے کہے گی: تمھیں خدا نے اقتدار دیا تھا لیکن تم نے عدل سے کام نہیں لیا۔
یہ کہہ کر آگ انھیں اس طرح سے نگلے گی جیسے پرندہ تلوں کے دانوں کو نگل جاتا ہے۔
اس کے بعد علماء سے کہے گی: تم نے ظاہراً تو اپنے آپ کو بہت اچھا بنا رکھا تھا لیکن تم اللہ کی نافرمانی کرتے تھے۔
یہ کہہ کر آگ انھیں بھی نگل جائے گی۔
پھر دولت مندوں سے کہے گی: خدا نے تمھیں بہت سے وسائل عطا کیے تھے اور تم سے چاہا تھا کہ ان میں سے کچھ مال خرچ کرو لیکن تم نے بخل سے کام لیا۔
یہ کہہ کر آگ انھیں بھی نگل جائے گی [1]

(عدالت اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد میں سورۂ مائدہ کی آیہ ۸ کے ذیل میں تفصیلی بحث کی ہے اُدھر رجوع کیجیے گا)۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ۱، ص ۳۰۔

Marfat.com

۹۱۔ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ
جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝

۹۲۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ
تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ
اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝

۹۳۔ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ
مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

۹۴۔ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَتَذُوْقُوا
السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

ترجمہ:

۹۱۔ اللہ سے پیمان باندھو تو ایفائے عہد کرو اور اپنی قسموں کو ان کے پکّا ہوجانے کے بعد نہ توڑو جبکہ تم خدا کو (اپنی قسموں پر) کفیل وضامن قرار دے چکے ہو جو کچھ تم انجام دیتے ہو اللہ اس سے آگاہ ہے

۹۲۔ اس (کم عقل) عورت کی طرح نہ ہوجاؤ جو اپنے سُوت کو خُوب کات کر کھول دیتی ہے جبکہ تم اپنی قسموں (اور پیمانوں) کے ذریعے خیانت وفساد کرتے ہو اس بناء پر کہ ایک گروہ کی نفری دوسرے سے زیادہ ہے (اور دشمن کی کثرت کو رسولِ خدا کی بیعت توڑنے کے لیے بہانہ بناتے ہو) اور اللہ تمھیں آزماتا ہے اور جس چیز کے بارے میں تم اختلاف کرتے ہو، روزِ قیامت اسے واضح کردے گا۔

۹۳۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک اُمّت بنا دیتا (سب کو جبری طور پر ایمان قبول کروا دیتا لیکن جبری ایمان کا کیا فائدہ ہے) مگر خدا جس شخص کو چاہتا ہے (اور مستحق پاتا ہے) اسے گمراہ کر دیتا ہے اور جس

Marfat.com

شخص کو چاہتا ہے (اور اسے اس لائق سمجھتا ہے) ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو تمھاری اس بارے میں باز پُرس ہوگی۔

۹۴۔ اپنی قسموں کو باہم دھوکا بازی اور خیانت کا ذریعہ نہ بناؤ، مبادا (ایمان پر) جمے ہوئے قدم اکھڑ جائیں اور پھر راہِ خدا سے (لوگوں کو) روکنے کے بُرے آثار کا مزہ چکھو اور تمھارے لیے بڑا سخت عذاب ہوگا۔

شانِ نزول :

عظیم مفسرِ قرآن علامہ طبرسی "مجمع البیان" میں مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کے شانِ نزول کے بارے میں کہتے ہیں :-

> جس وقت مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی اور دشمن بہت زیادہ تھے ایسے میں امکان تھا کہ اپنے فرق کا احساس کرتے ہوئے بعض مومنین رسول اللہؐ سے کی ہوئی اپنی بیعت توڑ دیتے اور آپ کا ساتھ چھوڑ جاتے ـــــ ان حالات میں یہ آیت نازل ہوئی اور انھیں اس سلسلے میں تنبیہ کی گئی اور خبردار کیا گیا۔

تفسیر

عہد و پیمان ـــــ ایمان کی دلیل :

گذشتہ آیت میں اسلام کے اساسی اصول، عدالت، احسان وغیرہ کے ذکر کے بعد زیرِ نظر آیات میں اسلامی تعلیمات کے ایک نہایت اہم گوشے کا تذکرہ شروع کیا گیا ہے اور وہ ہے ایفائے عہد اور قسموں کو پورا کرنا۔

پہلے فرمایا گیا ہے : اللہ سے جب عہد کرو تو اسے ایفا کرو (واوفوا بعہد اللہ اذا عاھدتم)۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: اور اپنی قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ نہ دو (ولا تنقضوا الایمان بعد توکیدھا)۔

جبکہ تم نے اللہ کے نام کی قسم کھائی ہو اور اپنی قسم پر اللہ کو کفیل اور ضامن قرار دیا ہو (وقد جعلتم اللہ عیکم کفیلاً)۔

کیونکہ اللہ تمھارے اعمال کو جانتا ہے (ان اللہ یعلم ما تفعلون)۔

مفسرین نے "عہد اللہ" کی بہت سی تفسیریں کی ہیں لیکن ظاہری مفہوم وہی عہد و پیمان ہی ہے جو لوگ اللہ کے ساتھ باندھتے ہیں (اور واضح ہے کہ اس کے رسول کے ساتھ عہد کرنا بھی اس کے ساتھ عہد کرنا ہی ہے) لہٰذا ایمان اور جہاد وغیرہ کے نام پر بیعت کرنا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے بلکہ تمام شرعی ذمہ داریاں تو رسولؐ کے ذریعے بتائی جاتی ہیں ضمنی طور پر عہدِ الٰہی کے مفہوم میں داخل ہیں اور عقلی احکام کی بھی یہی صورت ہے کیونکہ عقل و ہوش اور استعداد

Marfat.com

اللہ ہی کی عطا ہیں۔

" ایمان" " یمین" کی جمع ہے اس کا معنی ہے قسم۔ مندرجہ بالا آیت میں آنے والے اس لفظ کی بھی مختلف تفاسیر بیان کی گئی ہیں۔ جُملے کے مفہوم کی طرف توجّہ کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا بھی وسیع مفہوم ہے اس میں بھی وہ تمام معاہدے شامل ہیں جو انسان خدا کے سامنے کرتا ہے اور تمام معاہدے اور وعدے جو قسم کے ذریعے مخلوق خدا کے سامنے کیے جاتے ہیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں دوسرے لفظوں میں ہر قسم کا معاہدہ یا وعدہ جو اللہ کے نام پر یا اس کی قسم کے ذریعے انجام پائے وہ " ایمان " کے معنی میں داخل ہے خصوصًا جبکہ اس کے بعد " وقد جعلتم الله عليكم كفيلاً " (جبکہ تم نے خدا کو اپنا کفیل وضامن قرار دیا ہو) تفسیر و تاکید کے طور پر آیا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ " اوفوا بعهد الله " خاص حکم ہے اور " لا تنقضوا الايمان " عام حکم ہے۔

ایفائے عہد کا مسئلہ معاشرے کے ثبات وقیام کے لیے چونکہ بہت اہم ستون کی حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اگلی آیت میں ملامت کے لہجے میں اس کے بارے میں گفتگو جاری ہے۔

ارشاد فرمایا گیا ہے: تم اس عورت کی طرح نہ ہوجانا جس نے خوب سُوت کاتا اور پھر اس سارے کو کھول دیا۔ (ولا تكونوا كالتي نقضت غزلها من بعد قوة انكاثًا[1])۔

یہ زمانہ جاہلیت کی ایک قریشی عورت " رائطہ " کی طرف اشارہ ہے وہ خود اور اس کی کنیزیں صبح سے دوپہر تک سُوت کاتتیں پھر وہ عورت حکم دیتی کہ اس سارے کو کھول دو۔ اسی وجہ سے وہ عربوں میں " حمقاء " (احمق عورت) کے نام سے مشہور تھیں۔

ان عورتوں کے اس کام پر غور کیا جائے تو یہ ایک رجعت پسندانہ کام دکھائی دیتا ہے کیونکہ کاتنے کے بعد سوت ایک نیا استحکام اور تکامل حاصل کرلیتا ہے اب اس کو ادھیڑنا ایک رجعتی عمل ہی ہے۔ کہ جو نہ صرف فضول اور لاحاصل ہے، بلکہ نقصان دہ بھی ہے اسی طرح جو لوگ اللہ سے عہد باندھتے ہیں یا اس کے نام پر کوئی معاہدہ کرتے ہیں ان کا اس عہد اور معاہدے کو توڑ دینا نہ صرف فضول اور بے ہودہ حرکت ہے بلکہ ایسا کرنے والوں کے شخصی انحطاط کی دلیل بھی ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: تم اس کی یا اس کی خاطر اور اس خیال سے کہ فلاں گروہ کی نفری دوسرے سے زیادہ ہے اپنا پیمان اور قسم نہ توڑو اور اس پیمان اور قسم کو دھوکا دہی اور برائی کا ذریعہ نہ بناؤ (تتخذون ايمانكم دخلاً بينكم ان تكون امة هي اربى من امة[2])۔

---

[1] " انکاث "، " نکث " (بروزن " قسط ") کی جمع ہے۔ یہ بٹنے کے بعد اُون اور بالوں کو کھول دینے کے معنی میں ہے یہ لفظ اون اور بالوں سے بُنے ہوئے لباس کو ادھیڑنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اس بارے میں کہ زیر بحث آیت میں " انکاث " کیا محلِ اعراب رکھتا ہے۔ بعض اسے حال تاکیدی اور بعض " نقضت " کا دوسرا مفعول سمجھتے ہیں ——— " ای جعلت غزلها انکاثًا " (اس نے اپنی کاتی ہوئی چیز کو ادھیڑ دیا)۔

[2] " دخل " (بروزن " دغل ") اندرونی برائی، باطنی دشمنی اور مکر وفریب کے معنی میں ہے اسی مادہ سے " داخل " اندر کے معنی میں لیا گیا ہے اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ ہم نے جو تفسیر سطور بالا میں پیش کی ہے اس کے مطابق " تتخذون ايمانكم " جملہ حالیہ ہے لیکن بعض مفسرین نے اسے جملہ استفہامیہ سمجھا ہے البتہ پہلی تفسیر آیت کے ظہور سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔

Marfat.com

یہ چیز انسان کی شخصیت اور روح کی کمزوری پر دلالت کرتی ہے یا اس کے مکروفریب اور خیانت کی دلیل ہے کہ وہ صرف مخالفین کی کثرت دیکھ کر اپنے سچے دین کو چھوڑ دے اور اس دین سے رشتہ جوڑ لے کہ جو بے بنیاد ہے، اس لیے کہ اس کے طرفدار زیادہ ہیں۔

آگاہ رہو کہ اس طرح اللہ تمھیں آزمائے گا (انما یبلوکم اللہ بہ)۔

اگر تم کثرت میں ہو اور تمھارا دشمن اقلیت میں تو یہ آزمائش کی بات نہیں آزمائش تو جبھی ہے کہ دشمن بڑی تعداد میں تمھارے سامنے کھڑا ہو اور تم ظاہراً کم اور کمزور ہو۔

بہرحال اس آزمائش کا نتیجہ اور جس امر میں تم اختلاف رکھتے تھے، خدا کی طرف سے روز قیامت تمھارے سامنے واضح ہو جائے گا اور اس روز دلوں کے بھید آشکار ہو جائیں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کی جزا پا لے گا (ولیبینن لکم یوم القیٰمۃ ما کنتم فیہ تختلفون)۔

خدا کی طرف سے آزمائش، ایمان پر زور دینا اور فرائض کی انجام دہی کی بحث سے عام طور پر یہ توہم پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مشکل ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام انسانوں سے جبری طور پر حق منوا لے۔ یہی وجہ ہے کہ اگلی آیت میں اس توہم کا جواب دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے، خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا (ولوشاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ)۔ امت واحدہ ——— ایمان اور قبولِ حق کے لحاظ سے لیکن جبری طور پر۔

واضح ہے اس طرح سے حق قبول کرنا نہ کمال وارتقاء کا باعث ہے اور نہ باعثِ افتخار ہے یہی وجہ ہے کہ سنت الٰہی یہ ہے کہ سب کو آزادی دی جائے تاکہ وہ اپنے اختیار اور ارادے سے راہ حق طے کریں۔

لیکن اس آزادی کا یہ معنی نہیں کہ جو لوگ اس کی راہ پر چلتے ہیں اللہ ان کی کسی قسم کی کوئی مدد نہیں کرتا بلکہ جو لوگ راہِ حق پر قدم رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں اللہ کی توفیق ان کے شاملِ حال ہوتی ہے اور وہ اس کی ہدایت کے زیر سایہ منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں اور جو باطل کے راستے پر قدم رکھتے ہیں وہ اس نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ اور ان کی گمراہی میں اضافہ ہوتا ہے۔

اسی لیے مزید فرمایا گیا ہے، لیکن خدا جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے (ولکن یضل من یشاء ویھدی من یشاء)۔

لیکن خدا کی طرف سے اس ہدایت وگمراہی کا یہ مطلب نہیں کہ تمھاری ذمہ داری سلب ہو گئی ہے کیونکہ اس سے پہلے خود تم نے قدم اٹھائے ہیں۔

اسی لیے مزید فرمایا گیا ہے، تم اپنے اعمال کے یقیناً جواب دہ ہو اور تم سے باز پرس ہو گی (ولتسئلن عما کنتم تعملون)۔

یہ تعبیر کہ جس میں ایک طرف اعمال انجام دینے کی نسبت انسانوں کی طرف دی جا رہی ہے اور دوسری طرف اعمال پر جواب دہی پر زور دیا جا رہا ہے ——— گزشتہ جملے کے مفہوم کے تعین کے لیے واضح قرائن میں سے ہے۔ اس سے

Marfat.com

ثابت ہوتا ہے کہ ہدایت وگمراہی ہرگز جبری نہیں ہے۔
(اس سلسلے میں ہم پہلے بھی بحث کرچکے ہیں۔ قارئین تفسیر نمونہ جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶ کی تفسیر کی طرف رجوع فرمائیں)

اس کے بعد پھر ایفائے عہد کی طرف تاکید کی جارہی ہے۔ اور قسمیں پوری کرنے پر زور دیا جارہا ہے چونکہ معاشرے کے ثبات وبقاء کے لیے یہ ایک اہم عامل ہے ارشاد ہوتا ہے: اپنی قسموں کو اپنے درمیان مکر وفریب اور نفاق کا ذریعہ نہ بناؤ (و لا تتخذوا ایمانکم دخلاً بینکم)۔ کیونکہ اس کام کے دو عظیم نقصانات ہیں۔ پہلا یہ کہ اس سے ایمان پر جمے ہوئے قدم متزلزل ہوجاتے ہیں (فتزل قدم بعد ثبوتها)۔ اس لیے کہ جب تم قسم کھاتے ہو یا عہد باندھتے ہو تو اگر اس وقت تمہارا ایفائے عہد کا ارادہ نہیں ہوتا پھر بھی ایسا کرتے ہو تو لوگوں کا تم پر اعتماد اُٹھ جائے گا اور ایمان لانے والوں میں سے بعض لوگوں کا ایمان بھی اس طرح متزلزل ہوجائے گا گویا ان کے ایمان کی بنیاد مضبوط نہ تھی۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ تمھیں اس کام کے بُرے نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ اس دنیا میں اللہ کے راستے سے محروم ہوجاؤ گے اور دوسری دنیا میں اللہ کا سخت عذاب تمھارے انتظار میں ہوگا۔ (و تذوقوا السوء بما صددتم عن سبیل الله ولکم عذاب عظیم)۔

درحقیقت پیمان شکنی اور قسموں کی خلاف ورزی سے ایک طرف تو لوگ دینِ حق سے بدبین اور متنفر ہوجاتے ہیں، انتشار اور بداعتمادی کی فضا پیدا ہوجاتی ہے یہاں تک کہ اسلام قبول کرنے کی طرف لوگوں کی رغبت کو نقصان پہنچتا ہے اس حالت میں اگر دوسرے لوگ کوئی عہد وپیمان باندھیں گے تو اسے پورا کرنے کے لیے وہ اپنے آپ کو پابند نہیں سمجھیں گے اور یہ صورتِ حال خود دنیا میں بے شمار پریشانیوں اور تلخ کامیوں کا باعث ہے۔
دوسری طرف دارِ آخرت میں تمھیں عذابِ الٰہی کی سوغات ملے گی۔

چند اہم نکات:

۱۔ **عہد وپیمان کے احترام کا فلسفہ:** ہم جانتے ہیں کسی معاشرے کا اہم ترین سرمایہ لوگوں کا باہمی اعتماد ہے۔ اصولی طور پر جو چیز معاشرے کو بکھری ہوئی اکائیوں سے نکال کر ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح آپس میں منسلک اور وابستہ کردیتی ہے وہ یہی باہمی اعتماد ہی ہے یہ اعتماد ہی ہے جس کی بنیاد پر انسانوں کے کاموں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور وہ آپس میں مل جل کر کام کرتے ہیں اور رہتے سہتے ہیں۔ عہد وپیمان اور قسمیں اس باہمی اعتماد ہی کے لیے تاکید کا کام دیتی ہیں۔

اگر عہد وپیمان ٹوٹتے رہیں تو پھر معاشرے میں باہمی اعتماد کے عظیم رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور معاشرہ ظاہری صورت میں ایک ہونے کے باوجود بکھرا ہوا اور پراگندہ ہوتا ہے اور وہ ایسی اکائیوں میں بدل جاتا ہے جن میں کوئی دم خم نہیں ہوتا۔
یہی وجہ ہے کہ قرآنی آیات اور اسلامی احادیث میں ایفائے عہد اور قسموں کو پورا کرنے پر بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے

Marfat.com

اور بدعہدی اور قسموں کو توڑنے کو گناہِ کبیرہ قرار دیا گیا ہے۔

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام اپنے فرمان میں اسلام اور زمانہ جاہلیت میں اس امر کی بہت زیادہ اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور اسے ایک نہایت اہم اور عمومی مسئلہ شمار کرتے ہوئے اس پر بہت تاکید کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ مشرکین تک اپنے عہد اور معاہدوں کی پابندی کیا کرتے تھے کیونکہ انھیں پیمان شکنی کے المناک انجام کا علم تھا۔[1]

اسلام کے جنگی احکام میں ہے کہ ایک عام سپاہی بھی دشمن فوج کے ایک فرد یا چند افراد کو امان دے دے تو تمام مسلمانوں کے لیے اس امان کا احترام لازمی ہے۔

مورخین اور مفسرین کہتے ہیں کہ صدر اسلام میں جو بہت سے گروہوں نے اسلام جیسا عظیم الٰہی دین قبول کیا اس کا ایک سبب مسلمانوں کا اپنے عہد و پیمان کا پابند ہونا اور اپنی قسموں کو پورا کرنا تھا۔

یہ معاملہ اس قدر اہم ہے کہ حضرت سلمان فارسی سے ایک روایت ان الفاظ میں مروی ہے:

تھلک ھٰذہ الامۃ بنقض مواثیقھا

اس امت کی ہلاکت پیمان شکنیوں کی وجہ سے ہوگی۔[2]

یعنی جیسے ایفائے عہد عظمت و شوکت اور ترقی کا سبب ہے اسی طرح پیمان شکنی، درماندگی، تنزلی اور نابودی کا سبب ہے۔

تاریخ اسلام میں ہے کہ جب خلیفہ ثانی کے دور میں مسلمانوں نے ساسانیوں کو شکست دی اور ایران کے لشکر عظیم بادشاہ ہرمزان گرفتار ہوا تو اسے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا۔ خلیفہ نے اس سے کہا: تم نے بارہا ہم سے عہد و پیمان کیا اور پھر پیمان شکنی کی، اس کی کیا وجہ تھی۔

ہرمزان کہنے لگا: مجھے خوف ہے کہ اس کی وجہ بیان کرنے سے پہلے تم مجھے قتل نہ کر دو۔

خلیفہ نے کہا: ڈرو نہیں۔

ہرمزان نے پانی مانگا، فوراً ایک عام سے بے قیمت برتن میں پانی بھر کے اسے پیش کیا گیا۔

ہرمزان نے کہا: میں پیاس سے مر بھی جاؤں تو اس برتن میں پانی نہیں پیوں گا۔

خلیفہ نے کہا: ایسے برتن میں پانی لے آؤ جو اس کے لیے قابلِ قبول ہو۔

ایسا برتن لایا گیا پانی بھر کر اسے دیا گیا وہ اِدھر اُدھر دیکھتا تھا اور پانی نہیں پیتا تھا اور کہتا تھا: مجھے ڈر ہے کہ میں پانی پینے لگوں گا تو مجھے قتل کر دیا جائے گا۔

خلیفہ نے کہا: ڈرو نہیں، میں تجھے اطمینان دلاتا ہوں کہ جب تک تو پانی پی نہ لے تجھے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

ہرمزان نے اچانک پانی کا برتن اوندھا کر دیا۔ پانی زمین پر گر گیا۔ خلیفہ نے سمجھا پانی اس کے ہاتھوں سے بے اختیار

---

[1] نہج البلاغہ خطوط علی (ع) نامہ ۵۳۔

[2] مجمع البیان، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

گر گیا ہے لہٰذا کہا: اس کے لیے اور پانی لے آؤ اور اسے پیاسا قتل نہ کرو۔

ہرمزان نے کہا: مجھے پانی نہیں چاہیے میرا مقصد تو یہ تھا کہ تجھ سے امان لے لوں۔

خلیفہ نے کہا: میں تجھے ہر صورت میں قتل کروں گا۔

ہرمزان کہنے لگا: تو مجھے امان دے چکا ہے اور اطمینان دلا چکا ہے۔

خلیفہ نے کہا: تو جھوٹ بولتا ہے، میں نے تجھے امان نہیں دی۔

انس[1] وہاں موجود تھے کہنے لگے: ہرمزان سچ کہتا ہے، آپ نے اسے امان دی ہے کیا آپ نے نہیں کہا کہ جب تک تو پانی نہ پی لے تجھے کچھ نہیں کہا جائے گا۔

خلیفہ بات کہہ کر پھنس گئے، ہرمزان سے کہنے لگے: تو نے مجھے دھوکا دیا ہے لیکن میں نے اس لیے دھوکا کھایا کہ تو اسلام قبول کر لے۔

ہرمزان نے یہ منظر دیکھا (اور مسلمانوں کے عہد و پیمان کی پابندی دیکھی تو اس کے سینے میں نورِ ایمان چمک اٹھا) تو مسلمان ہو گیا۔[2]

۲۔ **پیمان شکنی کے لیے بہانے:** پیمان شکنی اتنی بری چیز ہے کہ کوئی شخص پسند نہیں کرتا کہ اپنے اوپر اس کا الزام لے۔ یہی وجہ ہے کہ عہد شکنی کرنے والے عذر تلاش کرتے ہیں چاہے وہ عذر کتنا ہی بے بنیاد کیوں نہ ہو۔ اس کی مثال ہم نے زیر بحث آیات میں بھی دیکھی ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض مسلمان خدا اور رسولؐ سے باندھے ہوئے اپنے عہد میں تزلزل کے لیے دشمنوں کی کثرت کا بہانہ کرتے تھے حالانکہ کثرت کامیابی کی دلیل نہیں کیونکہ ایسا بہت ہوا ہے کہ ایک باایمان اور عزم صمیم کی حامل اقلیت کسی بڑی بے ایمان اکثریت پر کامیاب ہو گئی۔ اسی طرح دشمنوں کی کثرت اس بات کے لیے کب جواز بن سکتی ہے کہ دوستوں سے عہد شکنی کی جائے کیونکہ گہری نظر سے دیکھا جائے تو ایسی عہد شکنی دراصل ایک قسم کا شرک اور خدا سے بیگانگی ہے۔

آیت میں جو مثال پیش کی گئی ہے۔ ہمارے زمانے میں اس بات نے ایک نئی صورت اختیار کی ہے بعض ایسی مسلمان حکومتیں ہیں کہ جو بظاہر چھوٹی ہیں بڑی استعماری طاقتوں کے خوف سے مومنین سے باندھے ہوئے اپنے پیمان پورے نہیں کرتیں ان کے حکمران ناچیز اور کمزور انسانی طاقت کو خدا کی لامتناہی قدرت پر مقدم سمجھتے ہیں۔ غیر خدا پر تکیہ کرتے ہیں اور غیر خدا سے ڈرتے ہیں یہاں تک کہ ان کے عہد و پیمان بھی اسی انحصار اور خوف کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ یہ ساری کیفیت شرک و بت پرستی کی پیداوار ہے۔

---

[1] ایک مشہور صحابی۔

[2] تاریخ کامل جلد ۲ ص ۵۴۹۔

Marfat.com

۹۵۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

۹۶۔ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

۹۷۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۹۵۔ اللہ کے عہد کو (کبھی بھی) تھوڑی سی قیمت کے بدلے نہ بیچو (اور اس کے لیے ہر قیمت بے وقعت ہے) اور اگر تم جانو تو جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی بہتر ہے۔

۹۶۔ (کیونکہ) جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ فانی ہے لیکن جو کچھ خدا کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور جو لوگ صبر و استقامت اختیار کریں گے ہم انھیں بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔

۹۷۔ مرد ہو یا عورت جو کوئی بھی نیک عمل کریگا اس حالت میں کہ وہ مومن ہو ہم اسے حیات پاکیزہ عطا کریں گے اور انھیں ان کی سی جزا دیں گے جنھوں نے بہترین اعمال انجام دیئے ہیں۔

شانِ نزول:

عظیم مفسر مرحوم طبرسی نے ابن عباس سے نقل کیا ہے:

ایک شخص حضرموت کا رہنے والا تھا وہ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرا ایک ہمسایہ ہے اس کا نام امرؤالقیس ہے اس نے میری زمین کا کچھ حصہ غصب کر رکھا ہے، لوگ میری سچائی کے گواہ ہیں لیکن چونکہ اس کا احترام کرتے ہیں لہذا میری حمایت پر آمادہ نہیں ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امرؤالقیس کو طلب کیا اور اس سے اس سلسلے میں پوچھا تو اس نے جواب میں کچھ ماننے سے انکار کر دیا۔ رسولؐ اللہ نے اس سے کہا کہ اپنی سچائی کے لیے

Marfat.com

قسم کھاؤ، لیکن مدعی نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ شخص کسی اصول کا پابند نہیں لہٰذا اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں یہ تو جھوٹی قسم کھائے گا۔

رسول اللہؐ نے فرمایا: بہرحال اس کے علاوہ کوئی چارا نہیں یا تو اپنے گواہ پیش کرو یا اس کی قسم تسلیم کرو۔

امرؤالقیس قسم کھانے کے لیے اٹھا تو رسول اللہؐ نے اُسے روک دیا اور مہلت دی (اور فرمایا: اس بارے میں سوچ سمجھ لو پھر قسم اٹھانا)

وہ دونوں چلے گئے اسی دوران میں زیر نظر پہلی اور دوسری آیت نازل ہوئی (جس میں جھوٹی قسم کے انجام سے خبردار کیا گیا) رسول اللہؐ نے یہ دونوں آیتیں ان کے سامنے پڑھیں تو امرؤالقیس کہنے لگا: حق ہے، جو کچھ میرے پاس ہے بالآخر فانی ہے اور یہ شخص سچ کہتا ہے۔ میں نے اس کی زمین کا کچھ حصہ غصب کر رکھا ہے لیکن مجھے علم نہیں کہ وہ کتنا ہے؟ اب جبکہ یہ صورت ہے تو جتنا یہ چاہتا ہے (اور سمجھتا ہے کہ اس کا حق ہے) لے لے اور اس مقدار کے برابر مزید بھی لے لے چونکہ میں نے اتنی مدت اس کی زمین سے استفادہ کیا ہے

اس اثناء میں تیسری زیر نظر آیت بھی نازل ہوئی (جس میں ایمان کے ساتھ عمل صالح کرنے والوں کو "حیات طیبہ" کی بشارت دی گئی ہے)۔

تفسیر

حیاتِ طیبہ کی بنیاد

گزشتہ آیات میں پیمان شکنی اور جھوٹی قسم کی قباحت کے بارے میں گفتگو تھی۔ اس کے تسلسل میں زیر بحث پہلی آیت میں اسی مطلب کی تاکید کی گئی ہے البتہ فرق یہ ہے کہ گزشتہ آیات میں پیمان شکنی اور جھوٹی قسم کا سبب دشمن کی زیادہ تعداد سے مرعوب ہونا بیان کیا گیا تھا جبکہ یہاں بے قیمت مادی مفادات کے حصول کا مسئلہ در پیش ہے اسی لیے فرمایا گیا ہے: عہد الٰہی کا کبھی بھی کم قیمت پر سودا نہ کرو (ولا تشتروا بعهد الله ثمنا قليلا)۔

یعنی عہد الٰہی کی جو بھی قیمت لگاؤ وہ حقیر اور ناچیز ہے یہاں تک کہ اس کے بدلے تمھیں ساری دنیا بھی مل جائے تو ایفائے عہد الٰہی کے ایک لمحے کی بھی قیمت کے برابر نہیں ہے۔

اس کے بعد بطور دلیل مزید فرمایا گیا ہے: جو کچھ اللہ کے پاس ہے تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم جان لو (انما عند الله هو خير لكم ان كنتم تعلمون)۔

اگلی آیت میں اس بہتری کی دلیل یوں بیان کی گئی ہے: جو کچھ تمھارے پاس ہے آخر کار فانی ہے اور نابود ہو جائے گا۔

Marfat.com

اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی اور جاوداں ہے۔ (ماعند کم ینفد و ما عند اللہ باق)۔

مادی مفادات ظاہراً کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں پانی کے بلبلے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے جبکہ اللہ کی جزا اس کی ذات کی طرح جاوداں ہے اور ان سب سے برتر و بالا ہے۔

اس کے بعد مزید فرمایا گیا ہے: جو لوگ ہمارے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے (خصوصاً قسموں اور عہد و پیمان کے معاملے میں) صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ہم انھیں ان کے بہترین عمل کی جزا دیں گے (و لنجزین الذین صبروا اجرھم باحسن ما کانوا یعملون)۔

"احسن" کی تعبیر اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے تمام نیک اعمال ایک جیسے نہیں ہیں، بعض اچھے ہیں اور بعض بہت اچھے ہیں لیکن اللہ ان کے سارے اعمال کو زیادہ اچھے اعمال کے حساب میں رکھے گا اور انھیں زیادہ اچھے اعمال والی جزا دے گا اور یہ انتہائی عظمت کی بات ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کئی قسم کا مال و اسباب بیچنے کے لیے لاتا ہے بعض چیزیں بہت اعلیٰ ہیں کچھ اچھی ہیں اور کچھ درمیانی سی۔ لیکن خریدار سب چیزوں کو بہت بڑھیا والی کی قیمت پر خرید لیتا ہے۔

ضمناً "ولنجزین الذین صبروا ......" اس نکتے کی طرف اشارے سے خالی نہیں ہے کہ راہ اطاعت میں صبر و استقامت دکھانا، خصوصاً عہد و پیمان کا پابند ہونا، انسان کے بہترین اعمال میں سے ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

> الصبر من الایمان کالرأس من الجسد و لا خیر فی جسد لا رأس معہ و لا فی ایمان لا صبر معہ
>
> صبر و استقامت ایمان کے لیے ایسے ہے جیسے بدن کے لیے سر۔ بدن میں سر کے بغیر کوئی خوبی کی بات نہیں اور وہ سر کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح ایمان کی بھی صبر کے بغیر کوئی حیثیت نہیں[1]

اس کے بعد ایک ہمہ گیر قانون کے طور پر ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح کی انجام دہی کا نتیجہ اس جہان کے لیے اور دوسرے جہان کے لیے بیان کیا گیا ہے چاہے کوئی بھی شخص کسی حالت میں بھی ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح بجالائے قرآن اس بارے میں کہتا ہے، مرد ہو یا عورت، جو کوئی بھی حالتِ ایمان میں نیک عمل انجام دے ہم انھیں بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔ (من عمل صالحا من ذکر او انثی وھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون)۔

گویا معیار صرف ایمان اور اس کے نتیجے میں انجام دیئے جانے والے نیک اعمال ہیں اس کے علاوہ کوئی شرط نہیں

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ص ۸۲۔

Marfat.com

نہ سن و سال کا مسئلہ ہے، نہ قوم و قبیلے کا نہ جنس و صنف کا اور نہ معاشرے میں مقام و مرتبے کا وُہ عمل صالح جو ایمان کی پیداوار ہو، اس جہان میں اس کا نتیجہ "حیات طیبہ" ہے۔ یعنی اس سے ایسا معاشرہ وجود پاتا ہے جس میں آرام و سکون ہو امن و خوشحالی ہو، صلح و آشتی ہو اور تعاون و محبت ہو۔ ایسا معاشرہ جو انسان ساز اور اصلاحی مفاہیم کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرے سے ایسی بدحالی اور ایسے مصائب اور رنج و محن ختم ہو جاتے ہیں کہ جو استکبار، ظلم، طغیان، خودغرضی اور ہوس پرستی کی پیداوار ہوتے ہیں اور جن کے باعث آسمانِ حیات تیرہ و تار ہو جاتا ہے ——— ایمان اور عمل صالح کی بنیاد پر وجود میں آنے والا معاشرہ ان سب مشکلات اور قباحتوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ ایک طرف تو امن و خوشحالی کا یہ دور دورہ ہوتا ہے اور دوسری طرف خدا انھیں "ان کے بہترین اعمال کے مطابق جزا و ثواب دے گا" اور اس کی تفسیر گذشتہ آیات میں گزر چکی ہے۔

چند اہم نکات:

۱۔ سرمایۂ جاوداں: اس مادی دنیا کے مزاج میں فنا ہونا موجود ہے مضبوط ترین عمارتیں، طویل حکومتیں، نہایت قوی انسان اور ان سے بھی مضبوط ہر چیز نے آخر کار کہنہ، فرسودہ اور نابود ہونا ہے۔ بلا استثناء ہر چیز کے لیے زوال ہے لیکن ان موجودات کا رشتہ اگر کسی طرح خدا کی ذات پاک سے قائم ہو جائے اور انھیں اس کے لیے اس کی راہ پر ڈال دیا جائے تو وہ جاودانی رنگ اختیار کر لیتی ہیں کیونکہ اس کی ذاتِ پاک ابدی ہے۔ شہید حیاتِ جاوداں رکھتے ہیں۔ انبیاء، آئمہ حقیقی علماء اور مجاہدینِ راہِ خدا کی تاریخ جاودانی ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر زیر بحث آیات ہمیں خبردار کرتی ہیں کہ آؤ اور اپنے سرمایۂ وجود کو فنا ہونے سے بچاؤ اس سرمائے کو اس بنک میں محفوظ کر لو کہ جس میں جتنا بھی زمانہ گذر جائے کسی چیز کے ضائع ہونے کا احتمال نہیں۔ اپنے وسائل اور صلاحیتیں خدا کے لیے مخلوقِ خدا کے مفاد میں اور اس کی رضا کے حصول کے لیے استعمال میں لاؤ تاکہ وہ "عنداللہ" کا مصداق ہو جائیں اور "ما عنداللہ باق" کے تقاضے کے مطابق باقی رہیں۔

ایک حدیث میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے:

اذا مات ابن ادم انقطع امله الاعن ثلاث صدقة جارية، علم ينتفع به و ولد صالح يدعوله

فرزند آدم جب دنیا سے جاتا ہے تو تین چیزوں کے سوا ہر چیز سے اس کی اُمید کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور وہ تین چیزیں ہیں:

۱۔ صدقاتِ جاریہ:۔ (لوگوں کی خدمت کی غرض سے اور راہِ خدا میں انجام دیئے جانے والے کاموں کے آثار خیر)۔

۲۔ وہ علم کہ جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

Marfat.com

۴۔ اور نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہے[1]

یہ سب چیزیں جو اللہ کے لیے اور اس کی راہ میں ہیں اس لیے ابدیت کا رنگ رکھتی ہیں :

شتان ما بین عملین : عمل تذھب لذتہ و تبقی تبعتہ و عمل تذھب مؤنتہ و یبقی اجرہ۔

بہت فرق ہے اس عمل میں جس کی لذت ختم ہو جاتی ہے اور باز پرس باقی رہتی ہے اور اس عمل میں کہ جس کی سختی ختم ہو جاتی ہے اور اس کا اجر باقی رہ جاتا ہے[2]

۲۔ مرد اور عورت کی برابری :۔ اس میں شک نہیں کہ جسمانی اور روحانی اعتبار سے مرد اور عورت میں کئی لحاظ سے فرق ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی سماجی ذمہ داریاں اور مناصب مختلف ہیں اور بقول ے

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ہر کسی کو ایک خاص کام کے لیے بنایا گیا ہے ۔

ہر کسی کا اپنا الگ کام ہے لیکن ان میں سے کوئی فرق بھی ان کے مقامِ انسانیت یا بارگاہِ خداوندی میں ان کے مقام کے جُدا ہونے کی دلیل نہیں ہے ۔ اور اس لحاظ سے دونوں مکمل طور پر برابر ہیں ۔ اسی بناء پر جس معیار کی بناء پر ان کے معنوی روحانی مرتبے کا تعین کیا جاتا ہے وہ ایک سے زیادہ نہیں اور وہ ہے ایمان، عملِ صالح اور تقویٰ کہ جن میں دونوں یکساں طور پر اپنا مقام پیدا کر سکتے ہیں ۔

زیرِ نظر آیات میں یہ حقیقت صراحت کے ساتھ بیان کی گئی ہے ۔ عورت کے مقام و مرتبے کے بارے میں بیہودہ گو لوگ گزشتہ زمانے میں جو شک رکھتے تھے یا موجودہ زمانے میں رکھتے ہیں یا جو عورت کے لیے مرد سے کم تر انسانی مقام کے قائل تھے ۔ ان آیات میں ان کا منہ بند کر دیا گیا ہے اور ضمناً اس اہم معاشرتی مسئلے کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح کر دیا گیا ہے یہ آیات ثابت کرتی ہیں کہ کوتاہ فکر لوگوں کی سوچ کے برخلاف دینِ اسلام مرد کے تفوق کا دین نہیں بلکہ جس قدر اس کا تعلق مردوں سے ہے اسی قدر عورتوں سے بھی ہے ۔ مرد اور عورت ـــــــ دونوں صنفیں اعمالِ صالح کی طرف گامزن ہوں اور ان کا قدم مثبت، تعمیری اور اصلاحی ہو اور جذبہ ایمانی سے سرشار ہو تو دونوں یکساں طور پر "حیاتِ طیبہ" کے حامل ہوں گے اور دونوں بارگاہِ الٰہی میں مساوی اجر و ثواب سے بہرہ مند ہوں گے ۔ اور ان کی اجتماعی حیثیت بھی یکساں ہو گی ۔ ہاں البتہ جو ایمان اور عملِ صالح کو معیار قرار دیئے بغیر برتری کی تمنا کرے گا اس کے لیے حیاتِ طیبہ نہیں ہو گی ۔

۳۔ عملِ صالح کی جڑ سرچشمۂ ایمان سے سیراب ہوتی ہے : "عملِ صالح" کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ تمام

---

[1] ارشاد دیلمی۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار صفحہ ۱۲۱۔

Marfat.com

مثبت، مفید، تعمیری اور اصلاحی کام اور پروگرام اس میں شامل ہیں، چاہے وہ علمی ہوں یا ثقافتی، اقتصادی ہوں یا سیاسی اور چاہے وہ فوجی ہوں۔ ایک سائنس دان کہ جس نے انسانوں کے فائدے کے لیے، سالہا سال زحمت و مشقت جھیلی اور کوئی چیز ایجاد کی، وہ شہید کہ جس نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر معرکۂ حق و باطل میں شرکت کی اور اپنے خون کا آخری قطرہ تک نثار کر دیا، وہ با ایمان ماں — جس نے بچہ جننے سے لے کر اس کی پرورش تک تکلیف برداشت کی ہے، وہ علماءِ کرام جو اپنی بلند پایہ کتابیں لکھنے کے لیے زحمتیں اور مشقتیں جھیلتے ہیں، سب کے کام عملِ صالح کے مفہوم میں شامل ہیں۔

عظیم ترین کارناموں مثلاً انبیاء کی رسالت اور پیامبری سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے کام مثلاً راستے سے چھوٹا سا پتھر ہٹانے تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عملِ صالح کے ساتھ ایمان کی شرط کیوں لگائی گئی ہے جبکہ یہ ایمان کے بغیر بھی انجام پا سکتا ہے اور بہت سے مواقع پر ہم نے ایسا ہوتے بھی دیکھا ہے۔

اس سوال کے جواب میں ایک ہی نکتہ قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اگر جذبۂ ایمان نہ ہو تو عموماً عمل آلودہ ہو جاتا ہے اور ایسا بہت کم ہی ہوتا ہے کہ ایمان کے بغیر انجام پانے والا عمل آلودہ نہ ہو لیکن اگر عملِ صالح کی جڑیں توحید پرستی اور ایمان باللہ کے چشمے سے سیراب ہوں تو بہت کم ممکن ہے کہ اس میں تکبر، ریاکاری، خودنمائی، مکر و فریب اور احسان دھرنے کی سی آفات اور بلائیں اس پر اثر انداز ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً قرآن مجید عملِ صالح اور ایمان کو ایک دوسرے سے مربوط کر کے بیان کرتا ہے کیونکہ ان کا رشتہ نہ ٹوٹنے والا اور ایک عینی حقیقت ہے۔

ضروری ہے کہ ایک مثال کے ذریعے ہم اس مسئلے کو اور واضح کر دیں

فرض کیجئے دو افراد ہیں۔ ان میں سے ہر کوئی ایک ہسپتال بنا رہا ہے۔ ایک کے اندر جذبۂ الٰہی کارفرما ہے اور وہ خدمتِ خلقِ خدا کے لیے یہ کام کر رہا ہے لیکن دوسرے کا مقصد خودنمائی ہے اور وہ اس کے ذریعے معاشرے میں بلند مقام حاصل کرنا چاہتا ہے ہو سکتا ہے ہم سطحی نظر سے دیکھیں تو سوچیں کہ آخر دونوں ہسپتال ہی بنا رہے ہیں اور لوگوں کو تو ان کے عمل کا ایک جیسا فائدہ ہو گا۔ ٹھیک ہے کہ ایک کو اللہ کی طرف سے جزا و ثواب بھی ملے گا اور دوسرے کو نہیں ملے گا لیکن ظاہراً ان کے عمل میں کوئی فرق نہیں۔

لیکن ——— جیسا کہ ہم نے کہا ہے یہ سوچ ایک سطحی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ کچھ مزید غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ خود یہ دونوں عمل مختلف جہات سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں مثلاً پہلا شخص شہر کے ایسے محلّے کو منتخب کرے گا کہ جس میں مستضعفین، غریب اور ضرورتمند لوگ زیادہ ہوں۔ بعض اوقات یہ محلہ گمنام سا ہو گا جہاں کوئی بڑی گزرگاہ نہیں پڑتی، اور وہ آمد و رفت کا راستہ نہیں ہے لیکن دوسرا شخص ایسا علاقہ تلاش کرے گا جو زیادہ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہے چاہے وہاں ضرورت بہت ہی کم کیوں نہ ہو۔ پہلا شخص عمارت کی ساخت وغیرہ میں مستقبل بعید کو نظر میں رکھے گا اور ایسی بنیادیں رکھے گا جو صدیوں باقی رہیں لیکن دوسرا شخص عام طور پر یہ سوچے گا کہ عمارت جلد از جلد کھڑی ہو۔ اس کا افتتاح ہو اور وہ شور و غل مچا سکے۔ اور اس کا مقصد حاصل کر سکے۔ پہلا شخص اس کام کے باطن کو مضبوط کرنے کی کوشش کرے گا جبکہ دوسرا شخص

Marfat.com

ظاہری ٹیپ ٹاپ کا خیال رکھے گا۔ اسی طرح علاج معالجے کی مختلف اقسام، ڈاکٹروں اور نرسوں کے انتخاب اور اس ہسپتال کی دیگر ضروریات کے انتخاب میں ان دونوں میں بہت زیادہ فرق ہوگا کیونکہ ان کے مقاصد عمل کا اثر ہر مقام پر ہوگا، بالفاظ دیگر عمل کو وہ اپنے رنگ میں پیش کریں گے۔

۴۔ "حیاتِ طیبہ" کیا ہے؟ "حیات طیبہ" (پاکیزہ زندگی) کی مفسرین نے مختلف تفسیریں کی ہیں:

بعض نے اسے حلال روزی کے معنی میں لیا ہے۔

بعض نے قناعت اور نصیب پر راضی رہنا مراد لیا ہے۔

بعض نے روزانہ کا رزق سمجھا ہے۔

بعض نے حلال روزی کے ساتھ بجالائی جانے والی عبادت کا مفہوم لیا ہے۔

اور بعض نے اطاعتِ حکم خدا کی توفیق وغیرہ کا مطلب لیا ہے۔

لیکن شاید یاد دہانی کی ضرورت نہ ہو کہ حیاتِ طیبہ کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ یہ سب مطالب اور ان کے علاوہ دوسری چیزیں بھی اس کے اندر سموئی ہوئی ہیں۔ پاکیزہ زندگی کہ جو ہر لحاظ سے آلودگی، ظلم، خیانت، عداوت، ذلت، پریشانی اور بدبختی سے پاک ہو ایسی زندگی کہ جس کے پاک و شفاف چشمے میں ایسی کوئی آلودگی نہ ہو کہ اس کا پانی انسان کے حلق کے لیے ناگوار ہو جائے۔

البتہ اس سے پہلے جو گفتگو آئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیات طیبہ اس دنیا کے لیے مربوط ہے اور جزائے احسن آخرت کے ساتھ۔ یہ بات جاذب نظر ہے کہ نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ:

وسئل عن قوله تعالیٰ:

"فلنحيينه حيٰوة طيبة"

فقال:

هی القناعة

آپؑ سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا گیا

فلنحيينه حيٰوة طيبة

آپ نے فرمایا:

یہ قناعت ہے[1]

اس میں شک نہیں کہ اس تفسیر کا مطلب یہ نہیں کہ "حیات طیبہ" کا مفہوم قناعت میں محدود ہے بلکہ اس میں ایک مصداق بیان کیا گیا ہے لیکن یہ بات واضح مصداق ہے کیونکہ اگر انسان کو ساری دنیا دے دی جائے لیکن اس سے قناعت کی روح لے لی جائے تو وہ ہمیشہ تکلیف و آزار اور رنج و پریشانی میں رہے گا اس کے برعکس اگر انسان میں جذبۂ قناعت

---

[1] نہج البلاغہ، کلمات قصار ۲۲۹۔

Marfat.com

موجود ہو اور وہ حرص وطمع سے محفوظ ہو تو وہ ہمیشہ آسودہ خاطر اور خوش وخرم رہے گا۔
اسی طرح بعض دیگر روایات میں بتایا گیا ہے کہ حیاتِ طیبہ یہ ہے کہ انسان اس پر راضی رہے، جو کچھ خدا نے دیا ہے۔
ان روایات کا مفہوم "قناعت" کے قریب قریب ہے۔ البتہ معانی کو ان مفاہیم میں ہرگز منحصر نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ رضا و قناعت کو بیان کرنے کا یہاں اصلی مقصد حرص و آزار اور طمع و ہوا پرستی کو ختم کرنا ہے کیونکہ یہی تجاوز، لوٹ کھسوٹ، جنگوں اور خوں ریزی کے عامل ہیں اور یہی بعض اوقات ذلّت و رسوائی کا سبب بھی بن جاتے ہیں۔

Marfat.com

۹۸۔ فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ○
۹۹۔ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ○
۱۰۰۔ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۹۸۔ جب قرآن پڑھو تو دھتکارے ہوئے شیطان سے خدا کی پناہ مانگو۔
۹۹۔ کیونکہ جو اہلِ ایمان اپنے رب پر توکّل کرنے والے ہیں، ان پر اس کا بس نہیں چلتا۔
۱۰۰۔ اس کا تسلط تو صرف ان لوگوں پر ہے جنھوں نے اسے اپنا سرپرست بنا لیا ہے۔ اور وہ کہ جو اس کے بارے میں شرک اختیار کرتے ہیں (اور حکمِ خدا کے بجائے اس کے حکم پر عمل درآمد ضروری سمجھتے ہیں)۔

تفسیر

قرآن اس طرح سے پڑھو:

ہمیں یاد ہے کہ پہلے کی چند آیات میں اس نکتے کی طرف اشارہ ہوا تھا کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہے "تبیانا لکل شیء" اور اس کے بعد فرامینِ الٰہی کا ایک نہایت اہم حصّہ بیان ہوا ہے۔ زیرِ نظر آیات ہمیں قرآن مجید سے استفادہ کرنے اور اس کی تلاوت کا طریقہ بیان کرتی ہیں کیونکہ یہی کافی نہیں کہ مضامینِ قرآن پُرثمر ہوں بلکہ ضروری ہے کہ ہمارے وجود اور ہماری فکر و روح کے اردگرد موجود رکاوٹیں بھی دور ہوں تاکہ ان پُرثمر مضامین تک رسائی ممکن ہو سکے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جس وقت قرآن پڑھو، دھتکارے ہوئے شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو (فاذا قرأت القرآن فاستعذ باللہ من الشیطٰن الرجیم)۔

البتہ اس سے صرف یہ مراد نہیں کہ "اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم" پڑھ لیا جائے بلکہ اس مفہوم کو اپنے اخلاق اور مزاج میں شامل کرنا شرط ہے یعنی اس جملے کا ذکر انسان کے اندر ایک حالت پیدا ہونے کا مقدمہ بننا چاہیے ——

Marfat.com

خدا کی طرف توجہ کی حالت، سرکش ہوا و ہوس کہ جو صحیح فہم و ادراک سے مانع ہے، سے جدائی کی حالت اور تعصب، غرور، اور خود پرستی سے لاتعلقی کی حالت کیونکہ یہ چیزیں انسان سے تقاضا کرتی ہیں کہ ہر چیز سے یہاں تک کہ کلام الٰہی سے بھی اپنی انحرافی خواہشات کے لیے فائدہ اٹھائے جب تک انسان کی روح میں ایسی حالت پیدا نہ ہو جائے، حقائق قرآن کا ادراک اس کے لیے ممکن نہیں ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی شرک آلود خواہشات کی توجیہہ کے لیے اس کی تفسیر بالرائے کرنے لگے۔

اگلی آیت درحقیقت پہلی آیت میں کہی گئی بات کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے شیطان کا ان لوگوں پر بس نہیں چلتا کہ جو اہل ایمان ہیں اور اپنے رب پر توکّل کرتے ہیں (انه ليس له سلطن على الذين اٰمنوا وعلى ربهم يتوكلون)۔ اس کا تسلّط تو صرف ان لوگوں پر ہے جنہوں نے اسے اپنی رہبری اور سرپرستی کے لیے منتخب کر رکھا ہے (انما سلطنه على الذين يتولونه)۔ اور وہ لوگ کہ جنہوں نے اطاعت و بندگی میں اسے خدا کا شریک بنا رکھا ہے (والذين هم به مشركون)۔ وہ لوگ کہ جو حکمِ خدا کی بجائے حکمِ شیطان کو عمل درآمد کے لائق سمجھتے ہیں۔

چند اہم نکات:

۱۔ شناخت کی رکاوٹیں: حقیقت کا چہرہ کتنا ہی آشکار، درخشاں اور واضح کیوں نہ ہو جب تک نگاہِ بینا کے سامنے نہ ہو اس کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں حقائق کی شناخت کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک چہرۂ حق کا آشکار اور واضح ہونا اور دوسرا نظر اور قوتِ ادراک کا ہونا۔

کیا کبھی کوئی نابینا سورج کو دیکھ سکتا ہے؟ کیا بہرہ شخص عالمِ امکان کے دل نواز نغمے سن سکتا ہے؟ اسی طرح جو لوگ نگاہِ حق بیں نہیں رکھتے وہ چہرۂ حقیقت دیکھنے سے محروم ہیں۔ اور جو حق بات سننے والے کان نہیں رکھتے، وہ آیات نہیں سن سکتے۔

وہ کون سی رکاوٹ ہے کہ جس کے باعث انسان قوتِ شناخت کھو بیٹھتا ہے:

اس میں شک نہیں کہ پہلے سے کیے ہوئے غلط فیصلے، نفسانی ہوا و ہوس، اندھے انتہائی تعصبات، خود غرضی اور غرور حقیقت شناسی کے لیے سب سے پہلے درجے پر رکاوٹ بنتے ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ ہر چیز جو انسان کے دل کی صفائی اور روح کی پاکیزگی کو درہم برہم کر دے اور انسان کے باطن کو تیرہ و تار کر دے، ادراکِ حقیقت میں مانع ہے۔

جمال یار ندارد حجاب و پردہ ولی
غبار رہ بنشاں تا نظر توانی کرد

جمالِ یار پر تو کوئی پردہ اور حجاب نہیں ہے لیکن اگر تو نظارۂ رخِ یار کرنا چاہتا ہے تو راستے میں جو غبار حائل ہے پہلے اسے بٹھا دے۔

Marfat.com

تا نفس مبرا ز نواہی نشود

دل آئینہ نور الٰہی نشود

جب تک نفس نواہی اور نافرمانی سے پاک نہ ہو جائے، دل نور الٰہی کا آئینہ نہیں بن سکتا۔

ایک حدیث میں ہے:

لولا ان الشیاطین یحومون حول قلوب بنی ادم لنظروا الی ملکوت السمٰوت

اگر اولادِ آدم کے دلوں کے گرد شیطان محوِ گردش نہ ہوتے تو انسان ملکوتِ آسمانی کو دیکھ سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ راہِ حق کے مسافروں کے لیے پہلی شرط تہذیبِ نفس اور تقویٰ ہے اس کے بغیر انسان وہم کی تاریکیوں اور بے راہ رویوں میں سرگرداں رہتا ہے۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے:

ھدًی للمتقین

یہ آیاتِ الٰہی پرہیزگاروں کے لیے ہدایت ہیں۔

یہ بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

ہم نے بہت دیکھا ہے کہ جو لوگ تعصب، ہٹ دھرمی اور پہلے سے کیے گئے انفرادی یا گروہی فیصلوں کے ساتھ آیاتِ قرآن کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ قرآن سے ادراک حقیقت کی بجائے اپنی خواہشوں کو ان پر ٹھونس دیتے ہیں بالفاظ دیگر —— جو کچھ وہ چاہتے قرآن میں تلاش کرتے ہیں، وہ کچھ نہیں ڈھونڈتے جو اللہ نے بیان کیا ہے اس طرح بجائے اس کے کہ قرآن ان کی ہدایت کا سبب بنے ان کے انحراف میں اضافہ ہو جاتا ہے البتہ قرآن ایسا نہیں کرتا بلکہ ان کی سرکش ہوا و ہوس اس کا سبب بنتی ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

فاما الذین اٰمنوا فزادتھم ایماناً و ھم یستبشرون واما الذین فی قلوبھم مرض فزادتھم رجساً الی رجسھم وماتوا و ھم کافرون

جو لوگ ایمان لائے ہیں آیاتِ قرآنی ان کے ایمان میں اضافہ کرتی ہیں اور وہ مسرور ہوتے ہیں۔ جبکہ جن کے دلوں میں بیماری ہے ان کی ناپاکی میں اور ناپاکی کا اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ دنیا سے حالتِ کفر میں جاتے ہیں۔

(توبہ —— ۱۲۴، ۱۲۵)

Marfat.com

لہذا بالصراحت کہنا چاہیے کہ زیر بحث آیت کا یہ مقصد نہیں کہ صرف "اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم" پڑھ لیا جائے اور بس ـــــــ بلکہ ضروری ہے کہ یہ ذکر فکر میں بدل جائے اور فکر احساس میں ڈھل جائے اور ہر آیت پڑھتے ہوئے خدا سے پناہ مانگیں کہ کہیں کوئی شیطانی وسوسہ ہمارے اور حیات بخش کلام الٰہی میں حائل نہ ہو جائے۔

۲۔ شیطان کو یہاں "رجیم" کیوں کہا گیا ہے؟ "رجیم" "رجم" کے مادہ سے دھتکارے ہوئے کے معنی میں ہے اور اصل میں یہ لفظ پتھر مارنے کے معنی میں ہے بعد ازاں دھتکارے ہوئے کے معنی میں بھی استعمال ہونے لگا۔

یہاں شیطان کی تمام صفات میں سے اس کے دھتکارا ہوا ہونے کا ذکر کیا گیا ہے یہ ذکر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جب شیطان کو دعوت دی کہ وہ آدم کے سامنے سجدہ کرے تو اس نے تکبر کیا اس کا یہ تکبر سبب بنا کہ ادراکِ حقائق اور اس کے درمیان پردہ حائل ہو گیا یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو آدم سے برتر خیال کرنے لگا اور کہنے لگا کہ:

میں اس سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے اور اسے مٹی سے پیدا کیا ہے۔

یہاں تک کہ اس سرکشی اور غرور کے باعث اس نے فرمانِ خدا پر اعتراض کر دیا ایسا اعتراض کہ جو اس کے کفر اور راندۂ درگاہ ہونے کا باعث بنا۔

یہاں "رجیم" کی تعبیر استعمال کر کے قرآن گویا یہ حقیقت سمجھانا چاہتا ہے کہ تلاوت قرآن کے وقت غرور و تکبر اور تعصب کو اپنے آپ سے دور رکھو تاکہ کہیں شیطانِ رجیم جیسا حال نہ ہو جائے اور کہیں ادراک حقیقت کی بجائے کفر و بے ایمانی کے گڑھے میں نہ جا گرو۔

۳۔ **گروہِ حق اور گروہِ شیطان:** زیر بحث آیات میں لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک گروہ شیطان کے زیر تسلط ہے اور دوسرا اس کے تسلط سے خارج ہے ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک کی دو دو صفات بیان کی گئی ہیں۔

جو لوگ شیطان کے تسلط سے باہر ہیں وہ باایمان ہیں اور توکل علی اللہ کے حامل ہیں یعنی عقیدے کے لحاظ سے صرف خدا پرست ہیں اور عمل کے لحاظ سے ہر چیز کے بارے میں خدا پر بھروسہ کیے ہوئے ہیں۔ ان کا سہارا نہ کمزور انسان ہیں نہ ہوا و ہوس نہ تعصب اور نہ ہٹ دھرمی۔

لیکن جو شیطان کے کنٹرول میں ہیں اولاً اس کی رہبری پر اعتقاد رکھتے ہیں "یتولونہ"

ثانیاً عمل کے لحاظ سے اسے اطاعت خدا کا شریک سمجھتے ہیں یعنی عملی طور پر اس کے مطیع فرمان ہیں۔

البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو اپنے آپ کو پہلے گروہ میں شمار کروانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن تربیت کنندگانِ الٰہی سے دور ہونے، غلط ماحول میں رہنے یا دیگر وجوہات کے باعث دوسرے گروہ میں جا پڑتے ہیں۔

بہر حال زیر بحث آیات ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کی تاکید کرتی ہیں کہ انسانوں پر شیطان کا تسلط جبری اور بے اختیاری کی بناء پر نہیں بلکہ یہ انسان ہی ہے جو اسے اپنے اوپر تسلط کے حالات فراہم کرتا ہے اور اس کے لیے دل کے دروازے کھول دیتا ہے۔

Marfat.com

۴۔ تلاوتِ قرآن کے آداب : ہر کام کے لیے ایک طرزِ عمل کی ضرورت ہے خصوصاً قرآن جیسی عظیم کتاب سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی انداز اور آداب درکار ہیں اسی بناء پر قرآنی آیات کی تلاوت اور ان سے استفادہ کرنے کے آداب و شرائط خود قرآن میں بتائے گئے ہیں ۔ مثلاً :

۱۔ لا یمسہ الا المطہرون

پاک لوگوں کے علاوہ کوئی قرآن کو نہیں چھوتا ۔

ہوسکتا ہے یہ تعبیر ظاہری پاکیزگی کی طرف اشارہ ہو۔ یعنی قرآن کے الفاظ اور سطروں کو طہارت اور وضو کے بغیر مَس نہ کیا جائے ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس طرف اشارہ ہو کہ ان آیات کے مضامین ومفاہیم کا ادراک صرف وہ لوگ کرسکتے ہیں جو اخلاقی برائیوں سے پاک ہوں کیونکہ بُری صفات انسان کی حقیقت بین نگاہوں پر پردہ ڈال دیتی ہیں کہ جس کے باعث وہ جمالِ حق کے مشاہدے سے محروم ہوجاتا ہے ۔

۲۔ آغازِ تلاوتِ قرآن کے وقت راندۂ درگاہِ حق شیطان سے خدا کی پناہ طلب کی جائے ۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آیات میں ہے :۔

فاذا قرأت القراٰن فاستعذ باللہ من الشیطٰن الرجیم

ایک روایت میں امام صادق علیہ السّلام سے مروی ہے کہ آپ سے سوال کیا گیا کہ اس حکم پر کیسے عمل کیا جائے اور کیا کہا جائے ، آپؑ نے فرمایا :

استعیذ بالسمیع العلیم من الشیطان الرجیم

میں شیطانِ مرُدود سے سمیع وعلیم خدا کی پناہ مانگتا ہوں ۔

ایک اور روایت میں ہے کہ امام علیہ السّلام نے سورۃ الحمد کی تلاوت کے وقت فرمایا :

اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم، واعوذ باللہ ان یحضرون

میں شیطانِ مرُدود سے سمیع وعلیم خدا کی پناہ مانگتا اور میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں اس امر کے بارے میں کہ وہ (شیطان) میرے پاس آئیں ۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ پناہ طلبی فقط زبان اور الفاظ تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے روح کی گہرائیوں میں اُترنا چاہیے اور تلاوتِ قرآن کے وقت شیطانی عادات سے دُور اور الٰہی صفات کے قریب ہونا چاہیے تاکہ وہ رکاوٹیں انسان کی فکر سے دور ہوجائیں جو کلامِ حق کے سمجھنے میں حائل ہوجاتی ہیں اور حقیقت کے جمالِ دل آراء کو نظروں سے اوجھل کردیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ آغازِ تلاوت کے وقت بھی شیطان سے خدا کی پناہ طلب کرنا بھی ضروری ہے اور تلاوت کے دوران میں بھی مسلسل ـــــــ اگرچہ زبان سے نہ ہو ۔

۳۔ تلاوت بصورت ترتیل کرنا چاہیے یعنی ٹھہر ٹھہر کر اور غور وفکر کے ساتھ ۔ ارشادِ الٰہی ہے :

ورتل القراٰن ترتیلا (مزمل - ۴)

Marfat.com

ایک اور حدیث میں ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں امام صادق علیہ السلام نے فرمایا:

ان القرآن لایقرء ھذرمۃ، ولکن یرتل ترتیلا، اذا مررت بآیۃ فیھا ذکر النار وقفت عندھا و تعوذت باللہ من النار

قرآن کو جلدی جلدی اور اس کے اعضاء شکستہ کرکے نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ اس کی تلاوت سکون واطمینان سے کرنا چاہیے۔ جب تم تلاوت کرتے ہوئے کسی ایسی آیت تک پہنچو کہ جس میں آتش جہنم کا ذکر ہو وہاں رک جاؤ (اور غور و فکر) اور جہنم کی آگ سے خدا کی پناہ مانگو۔

۴۔ ترتیل کے علاوہ قرآنی آیات میں تدبر و تفکر کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

افلا یتدبرون القرآن

کیا وہ قرآن میں سوچ بچار نہیں کرتے۔ (نساء — ۸۲)

ایک حدیث میں ہے کہ اصحاب رسول آنحضرتؐ سے قرآن کی دس دس آیتیں سیکھتے تھے اور جب تک پہلی آیات میں جو علم و عمل ہوتا اسے جان نہ لیتے مزید دس آیات نہ سیکھتے[۱]

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اعربوا القرآن و التمسوا غرائبہ

قرآن کو فصیح طریقے سے اور واضح کرکے پڑھو اور اس کے حیران کن مفاہیم کو تلاش کرو[۲]

نیز ایک حدیث امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے، آپ نے فرمایا:

لقد تجلی اللہ لخلقہ فی کلامہ ولکنھم لایبصرون

خدا نے اپنے کلام میں اپنی ذات کی تجلی رکھی ہے لیکن دلوں کے اندھے نہیں دیکھتے[۳]

یعنی ——— صرف آگاہ، روشن ضمیر اور غور و فکر کرنے والے اہل ایمان اس کے کلام میں اس کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

۵۔ جو لوگ آیات قرآن کو سنیں ان کا بھی ایک فریضہ ہے اور وہ یہ کہ خاموشی اختیار کریں ایسی خاموشی کہ جس میں وہ سنیں بھی اور غور و فکر بھی کریں۔ ارشاد الٰہی ہے:

واذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا لعلکم ترحمون

جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ تاکہ تم پر اللہ تعالیٰ کی

۱۔ بحار، جلد ۹۲ ص ۱۰۶۔

۲۔ بحار، جلد ۹۲ ص ۱۰۶۔

۳۔ بحار، جلد ۹۲ ص ۱۰۷۔

Marfat.com

رحمت ہو۔ (اعراف ـــــــ ۲۰۴)

ان کے علاوہ بھی اسلامی روایات میں آدابِ قرآن کے بارے میں کئی احکام موجود ہیں مثلاً اسے اچھے لحن سے پڑھنا کیونکہ اچھی آواز بھی یقینی طور پر اس کے مفاہیم کے بارے میں ایک نفسیاتی تاثیر پیدا کرتی ہے۔ البتہ یہ موقع نہیں کہ ہم اس بات کی تفصیل میں جائیں۔[1]

---

[1] مزید معلومات کے لیے بحارالانوار جلد ۹ ص ۱۹۰ کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

۱۰۱۔ وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ
اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○

۱۰۲۔ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ○

۱۰۳۔ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۭ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ
اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ○

۱۰۴۔ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ○

۱۰۵۔ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۱۔ اور جب (کسی حکم کو منسوخ کرتے ہوئے) ایک آیت کو دوسری آیت سے بدل دیتے ہیں تو اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون سا حکم نازل کرے۔ وہ کہتے ہیں کہ تو جھوٹ بولتا ہے لیکن ان میں سے اکثر (حقیقت کو) نہیں سمجھتے۔

۱۰۲۔ کہہ دے: اسے رُوح القدس حق کے ساتھ تیرے پروردگار کی طرف سے لایا ہے تاکہ اہلِ ایمان کو ثابت قدم کردے اور یہ تمام مسلمانوں کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔

۱۰۳۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیات اسے ایک بشر سکھاتا ہے حالانکہ جس کی طرف وہ انھیں نسبت دیتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے جبکہ یہ (قرآن) واضح عربی زبان ہے۔

۱۰۴۔ جو لوگ آیاتِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے اللہ انھیں ہدایت نہیں کرتا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

Marfat.com

۱۰۵۔ جھوٹ صرف وہ لوگ بولتے ہیں جو آیاتِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ واقعاً جھوٹے ہیں۔

شانِ نزول :

ابن عباس کہتے ہیں:

کبھی کوئی آیت نازل ہوتی اور اس میں کوئی سخت حکم ہوتا اور اس کے بعد کوئی آیت آتی کہ جس میں نسبتاً سہل حکم ہوتا تو بہانہ ساز مشرکین کہتے: محمد (ص) اپنے اصحاب سے مذاق کرتا ہے اور یہ اپنے پاس سے کرتا ہے آج ایک چیز کا حکم دیتا ہے اور اس سے منع کر دیتا ہے۔ یہ امور ظاہر کرتے ہیں کہ محمد (ص) سب کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے نہ کہ خدا کی طرف سے۔

تفسیر

اس سلسلے میں پہلی آیت میں انھیں جواب دیا گیا ہے۔

رُسواکُن جھُوٹ :

گذشتہ آیات میں قرآن اور اس سے استفادہ کرنے کے طریقے کے بارے میں بات تھی۔ زیر بحث آیات بھی قرآن سے مربوط کچھ مسائل بیان کر رہی ہیں۔ خصوصاً ان میں مشرکین کی طرف سے آیاتِ الٰہی پر کیے جانے والے اعتراضات کا ذکر ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت لے آتے ہیں یہ تغیّر و تبدّل حکمت و مصلحت کے تحت ہوتا ہے اور خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کی حکمت کیا ہے اور کس طرح سے نازل کرنا چاہیے تو وہ کہتے ہیں کہ تو خدا پر جھوٹ باندھتا ہے لیکن ان میں سے اکثر حقیقتِ امر کو نہیں جانتے (واذا بدلنا اٰیة مکان اٰیة واللہ اعلم بما ینزل قالوا انما انت مفتر بل اکثرھم لا یعلمون)۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کا ادراک ہی نہیں کہ قرآن کی ذمہ داری کیا ہے اور کیا پیغام رسانی اس کے ذمہ ہے وہ نہیں جانتے کہ قرآن ایک معاشرے کی تعمیر کے درپے ہے وہ ایک ایسا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتا ہے جو ترقی یافتہ ہو آباد ہو، آزاد ہو اور بلند روحانی مقام رکھتا ہو ——— جی ہاں! "اکثرھم لا یعلمون" (ان میں سے اکثر نہیں جانتے)۔

واضح ہے کہ ان مقاصد کے لیے یہ خدائی نسخہ جو ان بیماروں کی جان بچانے کے لیے لکھا گیا ہے اس میں بعض اوقات تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے ہو سکتا ہے آج ایک نسخہ لکھا جائے کل اس کی کچھ اور تکمیل کی جائے اور آخر میں اصل نسخہ صادر ہو۔

Marfat.com

جی ہاں! وہ ان حقائق سے بے خبر ہیں انھیں نزولِ قرآن کی شرائط و کوائف کی خبر نہیں ورنہ وہ جانتے کہ کچھ احکام آیات قرآن کی تبدیلی ایک دقیق اور سوچے سمجھے تربیتی پروگرام کا حصہ ہے۔ اس کے بغیر اصلی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرنا کمال وارتقاء کے حصول کے لیے ضروری ہے۔

اپنی اسی ناسمجھی کی بناء پر ان کا خیال تھا کہ یہ تبدیلی پیغمبر اکرمؐ کی تناقض گوئی اور اللہ پر افتراء باندھنے کی دلیل ہے۔

حالانکہ ایک ایسا معاشرہ جو بہت ہی پست ہو اور اسے بلند مراحل کی طرف لے جانا ہو اس کے لیے نسخ کی حکمت عملی ناگزیر ہے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی مرحلے میں تمام تر تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ اور اسے مرحلہ بہ مرحلہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔

کیا کسی دیرینہ بیماری کا علاج ایک ہی دن میں ہو سکتا ہے۔ ایک شخص کہ جو سالہا سال سے منشیات کا عادی ہو گیا اس کا ایک ہی دن میں علاج ممکن ہے؟ کیا اس کے لیے مرحلہ وار طریق کار اختیار نہیں کرنا پڑے گا؟ کیا مرحلہ وار پروگرام میں جو تبدیلی رونما ہوتی ہے نسخ و منسوخ اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟

(نسخ کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۰۶ کے ذیل میں بحث کر چکے ہیں)۔

اگلی آیت میں اسی مسئلے پر گفت کو جاری رکھتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ کو حکم دیا گیا ہے: کہہ دے! اسے روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے (قل نزله روح القدس من ربك بالحق)۔

"روح القدس" یا "روحِ مقدس" وحی الٰہی کا قاصد جبریل امین ہے۔ وہی ہے کہ جو حکم خدا سے آیات الٰہی ناسخ ہوں یا منسوخ رسولؐ پر لے کر آتا ہے۔ وہ آیات جو سب کی سب حق ہیں اور سب ایک حقیقت کا سلسلہ ہیں —— اور وہ حقیقت تربیت نوعِ انسانی کے علاوہ کچھ نہیں —— وہ تربیت کہ جس کے لیے کبھی احکام میں ناسخ و منسوخ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی بناء پر اس کے بعد فرمایا گیا ہے: مقصد یہ ہے کہ اہل ایمان کو اپنے اپنے راستے میں زیادہ ثابت قدم کیا جائے اور یہ تمام مسلمانوں کے لیے ہدایت و بشارت ہے (لیثبت الذین اٰمنوا و ھدی و بشرٰی للمسلمین)۔

مفسّرِ عالی قدر مؤلف المیزان کے بقول یہ آیت مومنین کے بارے میں کہتی ہے کہ مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے راستے میں ثابت قدم ہو جائیں لیکن مسلمانوں کے بارے میں کہتی ہے کہ مقصد، ہدایت و بشارت ہے۔ یہ فرق اسی فرق کی بناء پر ہے جو مومن اور مسلم میں موجود ہے کیونکہ ایمان کا تعلق دل سے ہے اور اسلام کا تعلق ظاہری عمل سے ہے۔

بہرحال قوتِ ایمان کو مضبوط کرنے اور راہِ ہدایت و بشارت کو طے کرنے کے لیے بعض اوقات چھوٹی مدت کے پروگراموں (SHORT-TERM PROGRAMMES) کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا اور بعد میں ان کی جگہ آخری اور حتمی پروگرام لے لیتے ہیں آیات الٰہی میں ناسخ و منسوخ کا یہی راز ہے۔

آیات قرآن پر بہانہ ساز مشرکوں نے جو اعتراض کیا تھا یہ اس کا جواب تھا۔ اس کے بعد ان کے دوسرے اعتراض یا زیادہ واضح الفاظ میں پیغمبر اسلام پر مخالفین کے افتراء کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ آیات اسے ایک انسان سکھاتا ہے (و لقد نعلم انھم یقولون انما یعلمه بشر)۔

Marfat.com

اس بارے میں کہ مشرکین کی مراد اس سے کون شخص تھا، اس بارے میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں:
ابن عباس سے منقول ہے وہ ایک مکّہ کا شخص تھا جس کا نام "بلعام" تھا وہ تلواریں بناتا تھا۔ بنیادی طور پر اس کا تعلق رُوم سے تھا اور وہ عیسائی تھا۔
بعض کا خیال ہے کہ قبیلہ بنی حضرم کا ایک شخص تھا جس کا نام "یعیش" یا "عائش" تھا وہ اسلام لے آیا تھا اور اصحابِ رسول میں شمار ہوتا تھا۔
بعض دیگر سمجھتے ہیں کہ وہ دو عیسائی غلام تھے۔ اِن کا نام "یسار" اور "جبر" تھا۔ ان کے پاس ان کی زبان میں ایک کتاب تھی جسے کبھی کبھی وہ بلند آواز سے پڑھتے تھے۔
بعض نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ اس سے مراد سلمان فارسیؓ ہیں حالانکہ ہم جانتے ہیں سلمان مدینہ میں بارگاہِ رسالتؐ میں پہنچے تھے اور وہاں پہنچ کر انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ سورۂ نحل کا زیادہ تر حصہ مکّی ہے اور مشرکین کی ایسی تہمتوں کا تعلق بھی اسی دَور سے ہے۔
بہرحال ان بے بنیاد باتوں پر قرآن نے خطِ بطلان کھینچ دیا ہے انھیں دندان شکن جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے:
جس شخص کی طرف یہ اس قرآن کی نسبت دیتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے۔ حالانکہ یہ قرآن فصیح و واضح عربی میں نازل ہوا ہے۔
(لسان الذی یلحدون[1] الیہ اعجمی[2] و ھذا لسان عربی مبین)۔
اس تہمت سے اگر ان کی مراد یہ ہے کہ یہ الفاظِ قرآن رسول اللہ کو ایک ایسا انسان سکھاتا کہ جو عربی زبان سے بیگانہ تھا تو یہ انتہائی پست بات ہے ایسے شخص کی عبارات، ایسی فصیح و بلیغ کیسے ہو سکتی ہیں کہ جن کے سامنے خود اہلِ زبان عاجز ہیں یہاں تک کہ اس جیسی ایک سُورت بھی نہیں بنا سکے۔
اگر ان کی مراد یہ ہے کہ قرآن کے مضامین و مفہوم پیغمبرؐ نے ایک عجمی معلّم سے لیے ہیں تو بھی یہ سوال سامنے آئے گا کہ ان مضامین کو ایسے اعجاز آمیز الفاظ و عبارات میں کس شخص نے ڈھالا ہے جن کے سامنے دنیائے عرب کے تمام فصحاء نے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں کیا یہ کام اس شخص کا ہو سکتا ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہو یا پھر یہ اس ذات کا کام ہے کہ جس کی قدرت تمام انسانوں کی قدرت سے مافوق ہے یعنی اللہ۔
علاوہ ازیں فلسفے اور قوی منطق کے لحاظ سے، عقائد کے اعتبار سے اور اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے اس قرآن کے مضامین ایسے ہیں کہ جو انسان کے باطن اور روح کی پرورش کرتے ہیں۔ مختلف انسانی ضروریات کے حوالے سے اس کے

---

[1] "یلحدون" "الحاد" کے مادہ سے ہے یہ حق سے باطل کی طرف انحراف کے معنی میں ہے اور کبھی یہ ہر قسم کے انحراف کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے یہاں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ افترا پرداز چاہتے تھے کہ قرآن کو ایک انسان کی طرف نسبت دیں اور اسے رسول اللہ کا استاد قرار دیں۔

[2] "اعجام" اور "عجمۃ" دراصل "ابہام" کے معنی میں ہے اور اعجمی اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کے بیان میں نقص ہو چاہے وہ عرب ہو یا غیر عرب۔ عربوں کو چونکہ دوسروں کے بارے میں ناقص اطلاعات تھیں لہٰذا دوسروں کو "عجم" کہتے تھے۔

Marfat.com

معاشرتی قوانین ایسے ہیں کہ جو انسانی افکار سے ما فوق ہیں۔ یہ نشاندہی کرتے ہیں کہ افتراء پردازوں کو بھی اپنی بات پر یقین نہ تھا یہ صرف ان کا شیطانی ہتھکنڈا تھا وہ تو ایسی باتیں کر کے سادہ لوح افراد کو گمراہ کرنا چاہتے تھے اور ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا چاہتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مشرکین عرب کو اپنے میں سے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا تھا جس کی طرف اس قرآن کی نسبت دے سکیں لہٰذا کوشش کرتے تھے کہ کوئی ایسا اجنبی شخص کہ جس کی زندگی وہاں کے لوگوں کے لیے مبہم ہو اس کی طرف ان مطالب کی نسبت دے دیں تاکہ ہو سکتا ہے چند دنوں تک وہ سادہ لوح لوگوں کو گمراہ رکھ سکیں۔

ان تمام چیزوں سے قطع نظر خود پیغمبر اکرمؐ کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو ایسا کوئی شخص نہیں ملتا حالانکہ اگر واقعاً ایسے افراد ہی اس قرآن کے اصلی موجد ہوتے تو پھر اس قسم کا رابطہ ان سے برقرار رہنا چاہیے تھا ——— لیکن جیسا کہ پرانی مثل ہے کہ:

الغریق یتشبث بکل حشیش

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔

وہ بھی اس قسم کے سہارے ڈھونڈتے تھے۔

نزولِ قرآن کا زمانہ اور عربوں کی جاہلیت کا دَور تو معمولی بات ہے آج تمدّنِ انسانی کے مختلف میدانوں میں اس قدر پیش رفت ہو چکی ہے، بے پناہ کتابوں کے ذریعے انسانی معاشرے میں افکارِ انسانی پھیل چکے ہیں، مختلف نظام ہائے حیات اور قوانین معرضِ وجود میں آچکے ہیں مگر اس کے باوجود موازنہ کیا جائے تو ان سب پر قرآنی تعلیمات کی برتری پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے۔

یہاں تک کہ سیّد قطب نے تفسیر "فی ظلال القرآن" میں لکھا ہے کہ روسی مادہ پرستوں نے ۱۹۵۴ء میں قرآن پر اعتراض کرنے کی غرض سے مستشرقین کا ایک سیمینار منعقد کیا تو انھوں نے کہا:

یہ کتاب ایک انسان ——— محمدؐ ——— کے دماغ کا نتیجہ نہیں ہو سکتی بلکہ یہ ایک بڑی جماعت کی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے یہاں تک کہ یہ یقین بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ساری کی ساری جزیرۃ العرب میں لکھی گئی ہے بلکہ یقینی طور پر اس کے کچھ حصّے جزیرۃ العرب سے باہر لکھے گئے ہیں[1]

ان کی منطق کی بنیاد وجودِ خدا اور نزولِ وحی کا انکار تھی وہ ہر چیز کی مادّی تفسیر تلاش کرتے تھے دوسری طرف وہ جزیرۃ العرب میں قرآن کو انسانی ذہن کی پیداوار نہیں سمجھ سکتے تھے مجبوراً انھوں نے ایک مضحکہ خیز بات کی اور اسے عرب اور عرب کے باہر کے بہت سے افراد کی پیداوار قرار دیا جبکہ یہ وہ چیز ہے تاریخ جس کا بالکل انکار کرتی ہے۔

---

[1] تفسیر "فی ظلال القرآن" جلد ۵ ص ۲۸۲۔

Marfat.com

بہرحال اس آیت سے خوب واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کا اعجاز صرف اس کے مضامین کے حوالے سے نہیں بلکہ الفاظِ قرآن بھی معجزہ ہیں۔ ان الفاظ کی خاص کشش، مٹھاس، ہم آہنگی اور جملوں کی بندش ایسی ہے کہ جو انسانی طاقت سے ماوراء ہے۔

(اعجاز قرآن کے سلسلے میں ہم جلد اوّل سورۂ بقرہ آیہ ۲۳ کے ذیل میں کافی بحث کر آئے ہیں)

اس کے بعد قرآن تنبیہ کے انداز میں یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ ان کے یہ الزامات اور انحرافات سب کے سب ان کی داخلی بے ایمانی کے سبب سے ہیں اور "جو لوگ آیاتِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے خدا انھیں ہدایت نہیں کرتا (نہ صراطِ مستقیم کی ہدایت اور نہ جنت وسعادت جاوداں کے راستے کی ہدایت) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے" (ان الذین لا یؤمنون بآیات اللہ لا یھدیھم اللہ ولھم عذاب الیم)۔ کیونکہ وہ اس طرح سے تعصب، ہٹ دھرمی اور حق دشمنی میں گرفتار ہیں کہ ہدایت کی اہلیّت گنوا بیٹھے ہیں اور اب وہ عذابِ الیم کے علاوہ کسی چیز کی اہلیت نہیں رکھتے۔

زیر بحث آخری آیت میں مزید فرمایا گیا ہے "اللہ والوں پر صرف وہ لوگ جھوٹ باندھتے ہیں کہ جو آیاتِ الٰہی پر ایمان نہیں رکھتے اور وہ پکے جھوٹے ہیں (انما یفتری الکذب الذین لا یؤمنون بایٰت اللہ واولٓئک ھم الکاذبون)۔

اے محمد (ص)! جھوٹ وہ بولتے ہیں نہ کہ تو ——— کیونکہ ان آیات، واضح نشانیوں اور دلیلوں کو کہ جن میں ہر ایک دوسری سے زیادہ آشکار ہے، دیکھنے کے باوجود وہ افتراء پردازی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔

اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہوگا کہ انسان مردانِ حق پر تہمت باندھے اور اس طرح سے وہ حق کے پیاسے لوگوں اور ان کے درمیان دیوار کھڑی کر دے۔

اسلام کی نگاہ میں جھوٹ کی قباحت:

زیر بحث آخری آیت قرآن کی لرزا دینے والی آیتوں میں سے ہے۔ یہ آیت جھوٹ کی قباحت کے بارے میں گفتگو کر رہی ہے اس آیت نے جھوٹوں کو کافروں اور آیاتِ الٰہی کے منکروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے آیت اگرچہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر جھوٹ باندھنے کے بارے میں ہے تاہم جھوٹ کی قباحت اجمالاً اس سے مشخص ہو جاتی ہے اس کے پیشِ نظر ہم کچھ تفصیل سے جائزہ لیتے ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں جھوٹ کی قباحت کس قدر ہے۔

۱۔ راست گوئی اور امانت ایمان کی دلیل ہیں: راست گوئی اور امانت کی ادائیگی ایمان اور بلندیِ کردار کی دو واضح نشانیاں ہیں یہاں تک کہ نماز سے بڑھ کر ایمان پر دلالت کرتی ہیں۔

امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

لا تنظروا الی طول رکوع الرجل وسجودہ، فان ذٰلک شیٔ قد اعتادہ ولو ترکہ استوحش لذٰلک، ولکن انظروا الی صدق حدیثہ واداء امانتہ

لوگوں کے لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ دیکھو، ہو سکتا ہے اس کی انھیں عادت پڑ گئی ہو۔

Marfat.com

اس طرح سے کہ وہ انھیں چھوڑ دے تو پریشان ہو جائے۔ البتہ ان کے قول کی سچائی اور امانت کی ادائیگی کی طرف دیکھو[1]

راست گوئی اور ادائے امانت کا باہم ذکر اس بناء پر ہے کہ ان کی بنیاد ایک ہی ہے کیونکہ راست گوئی بات میں امانتداری کے علاوہ کچھ نہیں اور امانت بھی سچائی ہی ہے۔

۲۔ جھوٹ سب گناہوں کی جڑ ہے: اسلامی روایات میں جھوٹ کو "گناہوں کی چابی" کہا گیا ہے حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:-

الصدق یھدی الی البر، والبر یھدی الی الجنۃ

سچائی نیکی کی دعوت دیتی ہے اور نیکی جنت کی طرف ہدایت کرتی ہے[2]

ایک حدیث میں امام باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

ان اللّٰہ عزوجل جعل للشر اقفالا، وجعل مفاتیح تلک الاقفال الشراب، والکذب شر من الشراب

اللہ بزرگ و برتر نے برائی کے کچھ قفل قرار دیئے ہیں اور ان کی چابی شراب ہے (کیونکہ یہ عقل ہے کہ جو برائیوں سے روکتی ہے اور شراب عقل کو بیکار کر دیتی ہے):

اس کے بعد مزید فرمایا:

جھوٹ بولنا شراب نوشی سے بھی بدتر ہے[3]

امام عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں:

جعلت الخبائث کلھا فی بیت وجعل مفتاحھا الکذب

تمام خباثتیں ایک کمرے میں بند کر دی گئی ہیں اور اس کمرے کی چابی جھوٹ ہے[4]

جھوٹ اور دوسرے گناہوں کا تعلق یہ ہے کہ گناہ گار شخص ہرگز سچا نہیں ہو سکتا کیونکہ سچائی اس کی رسوائی کا سبب ہے اور آثارِ گناہ چھپانے کے لیے اسے عموماً جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں جھوٹ انسان کو گناہ کی چھوٹ دیتا ہے اور سچائی گناہ پر پابندی لگاتی ہے۔

اتفاق سے یہ حقیقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ایک حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ حدیث یوں ہے:

---

[1] سفینۃ البحار مادہ "صدق" منقول از کتاب کافی۔

[2] مشکوٰۃ الانوار طبرسی ص ۱۵۷۔

[3] اصول کافی جلد ۲ ص ۲۵۴۔

[4] جامع السعادات جلد ۲ ص ۲۲۳۔

Marfat.com

ایک شخص رسول اللہ (ص) کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے عرض کی، میں نماز نہیں پڑھتا اور ایسے کام کرتا ہوں تو عفت وپاکدامنی کے منافی ہیں اور جھوٹ بھی بولتا ہوں۔ ان میں سے کس کو پہلے چھوڑوں ؟

رسول اللہ (ص) نے فرمایا : جھوٹ کو۔

اس نے رسول اللہ (ص) کے سامنے عہد کیا کہ آیندہ ہرگز جھوٹ نہیں بولے گا۔

جب وہ آپ کے پاس سے اُٹھ کر چلا گیا تو اس کے دل میں شیطانی وسوسے پیدا ہوئے، اور غلط کاری پر ابھارنے لگے۔ فوراً اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر کل رسول اللہؐ نے اس سلسلے میں پوچھ لیا تو کیا کہوں گا۔ کیا یہ کہوں گا کہ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا اگر یہ کہا تو یہ جھوٹ ہوگا اور اگر سچ کہہ دیا تو اس پر حد جاری ہوگی۔ اسی طرح دوسرے غلط کاموں کے بارے میں اس کے دل میں یہ خیالات پیدا ہوتے رہے اس وجہ سے وہ گناہوں سے بچتا رہا۔ اس طرح سے جھوٹ ترک کرنا سارے گناہ ترک کرنے کی بنیاد بن گیا۔

۲۔ جھوٹ نفاق کی بنیاد ہے: جھوٹ نفاق کا سرچشمہ ہے کیونکہ راست گوئی کا مطلب ہے زبان و دل کی ہم آہنگی۔ لہٰذا جھوٹ ان دونوں کی باہم آہنگی اور نفاق ظاہر و باطن میں اختلاف کے سوا کچھ نہیں۔

سورۂ توبہ کی آیت ۷۷ میں ہے:

فاعقبهم نفاقاً فی قلوبهم الی یوم یلقونه بما اخلفوا الله ما وعدوه و بما کانوا یکذبون ٥

ان کے اعمال نے روزِ قیامت تک کے لیے ان کے دل میں نفاق پیدا کر دیا کیونکہ انھوں نے عہدِ الٰہی کو توڑا اور وہ جھوٹ بولتے تھے۔

۳۔ جھوٹ اور ایمان کا کوئی تعلق نہیں: یہ حقیقت نہ صرف اس آیت سے ظاہر ہوتی ہے بلکہ اسلامی احادیث میں بھی صراحت سے بیان کیا گیا ہے کہ جھوٹ اور ایمان ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔

ایک حدیث میں ہے:

سئل رسول الله (ص): یکون المؤمن جباناً؟

قال: نعم،

قیل، ویکون بخیلاً؟

قال: نعم

قیل، یکون کذاباً؟

قال: لا

Marfat.com

رسُول اللہ (ص) سے سوال کیا گیا: کیا ایک باایمان شخص (کبھی) بزدل ہوسکتا ہے؟

فرمایا: ہاں

پھر پوچھا گیا: کیا وہ کبھی بخیل ہوسکتا ہے؟

فرمایا: ہاں

پھر پوچھا گیا: کیا وہ کبھی جھوٹا ہوسکتا ہے؟

فرمایا: نہیں[1]

کیونکہ جھوٹ نفاق کی نشانیوں میں سے ہے اور نفاق اور ایمان ایک ساتھ کبھی نہیں رہ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ امیرالمؤمنین علیہ السلام سے منقول ہے:

لایجد العبد طعم الایمان حتی یترک الکذب هزله وجده

انسان کبھی بھی ایمان کا ذائقہ نہیں چکھ سکتا جب تک جھوٹ ترک نہ کرے چاہے مزاح میں ہو یا واقعی طور پر[2]

۵۔ جھُوٹ سے اعتماد جاتا رہتا ہے: ہم جانتے ہیں کہ کسی معاشرے کا اہم ترین سرمایہ باہمی اعتماد اور عمومی اطمینان ہے جب کہ خیانت اور دھوکا بازی اس سرمایے کو تباہ کر دیتی ہے اسلامی تعلیمات میں سچائی کو اختیار کرنے اور جھوٹ کو چھوڑ دینے کے لیے ایک اہم دلیل یہی بیان کی گئی ہے۔

اسلامی احادیث میں ہے کہ ہادیانِ دین نے جن لوگوں سے شدت سے منع کیا ہے ان میں دروغ گو اور جھوٹے بھی ہیں کیونکہ وہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام اپنے کلماتِ قصار میں فرماتے ہیں:

ایاك و مصادقة الکذاب فانه کالسراب، یقرب علیك البعید، و یبعد علیك القریب

جھوٹے سے دوستی کرنے سے بچو کیونکہ وہ سراب کی مانند ہے بعید کو تجھے قریب کر دکھائے گا اور قریب کو دور کر دے گا[3]

جھوٹ کی قباحتوں کے بارے میں اور بھی بہت گفتگو کی جاسکتی ہے اس کے نفسیاتی علل و اسباب بھی ہیں اور اس کا مقابلہ کرنے کے طریقے بھی بہت ہیں یہ تفصیلات اخلاق کے بارے میں لکھی گئی کتب میں دیکھنا چاہیے[4]

---

[1] جامع السعادات، جلد ۲ ص ۳۲۲۔

[2] مشکوٰۃ الانوار ص ۱۵۶۔

[3] نہج البلاغہ کلماتِ قصار ص ۳۷۔

[4] ہماری کتاب "زندگی پرتو اخلاق" کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

۱۰۶۔ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ
وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○

۱۰۷۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ○

۱۰۸۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ○

۱۰۹۔ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

۱۱۰۔ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ
اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

۱۱۱۔ يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ
وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۶۔ جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائے مگر یہ کہ وہ مجبور کیا گیا ہو اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو مگر جس نے آزادی سے کفر قبول کر لیا ہو عاصیوں پر اللہ کا غضب ہے اور عذابِ عظیم ان کے انتظار میں ہے۔

۱۰۷۔ یہ اس بناء پر ہے کہ انھوں نے (پست) دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے اور اللہ بے ایمان (اور ہٹ دھرم) افراد کو ہدایت نہیں کرتا۔

۱۰۸۔ وہ ایسے لوگ ہیں کہ (ان کے گناہوں کی کثرت کے باعث) اللہ نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مُہر لگا دی ہے (اس لیے وہ کچھ نہیں سمجھ سکتے) اور وہ واقعی غافل ہیں۔

۱۰۹۔ اور یقیناً آخرت میں وہ خسارے میں ہیں۔

Marfat.com

۱۱۰۔ لیکن تیرا رب اُن لوگوں کے لیے جنھوں نے دھوکا کھانے کے بعد (ایمان کی طرف پلٹ کر) ہجرت کی پھر راہِ خدا میں جہاد کیا اور استقامت دکھائی۔ یہ کام انجام پانے کے بعد تیرا رب غفور و رحیم ہے (اور اپنی رحمت ان کے شامل حال کرے گا)۔

۱۱۱۔ اس دن کا سوچو جب ہر شخص (اپنی فکر میں پڑا ہو گا اور) اپنے دفاع کے لیے کھڑا ہو گا اور ہر شخص کا نتیجۂ اعمال بے کم و کاست اسے دیا جائے گا اور اُن پر ظلم نہیں ہو گا۔

شانِ نزول:

بعض مفسرین نے پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں نقل کیا ہے کہ یہ آیت مسلمانوں کے ایک خاص گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ مشرکین کے چنگل میں گرفتار ہو گئے تھے کفار نے انھیں مجبور کیا کہ اسلام کے خلاف کفر و شرک کا اظہار کریں۔ یہ افراد عمار، ان کے والد یاسر، ان کی والدہ سمیہ، صہیب، بلال اور خبّاب تھے۔ عمار کے ماں باپ نے اس واقعے میں بڑی استقامت دکھائی اور ڈٹے رہے۔ انھیں قتل کر دیا گیا۔ عمارؔ نوجوان تھے مشرکین جو چاہتے تھے انھوں نے کہہ دیا۔ یہ خبر مسلمانوں تک پہنچی تو بعض نے غائبانہ طور پر عمارؔ کی مذمت کی اور کہا کہ عمّار اسلام سے نکل گیا ہے اور کافر ہو گیا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا:

ان عمارًا ملاء ایمانًا من قرنه الی قدمه و اختلط الایمان بلحمه ودمه

ایسا نہیں ہے (میں عمار کو خوب جانتا ہوں) عمارؔ سرتاپا ایمان سے معمور ہے ایمان اس کے گوشت اور خون میں ملا ہوا ہے (وہ ہرگز ایمان کو ترک نہیں کرے گا اور مشرکین سے نہیں ملے گا)۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ عمارؔ رسولِ خداؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے رسولؐ اللہ نے فرمایا: کیا بات ہے؟

انھوں نے عرض کی بہت بُرا ہوا۔ انھوں نے اس وقت تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا جب تک میں نے آپ کے بارے میں جسارت نہیں کی اور ان کے بتوں کے بارے میں کلمہ خیر نہیں کہا۔

رسول اللہؐ اپنے مبارک ہاتھوں سے عمارؔ کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے: اگر دوبارہ تم ان کے ہاتھوں میں آ جاؤ تو جو کچھ وہ کہیں کہہ دو (اور اپنی جان کو مشکل سے بچاؤ) اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

من کفر باللہ من بعد ایمانه الا من اکره ......

اس آیت نے مسائل کو واضح کر دیا۔[1]

[1] تفسیر مجمع البیان۔

Marfat.com

تفسیر

اسلام سے پھر جانے والے ــــــــ (مُرتدین):

گزشتہ آیات مشرکین اور کفار کے طرزِ عمل کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں۔ ان آیات میں بھی وہی سلسلۂ کلام جاری ہے ان میں کفار کے ایک اور گروہ یعنی مرتدین اور اسلام سے پھر جانے والوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: جو لوگ ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائیں سوائے ان کے جو دباؤ میں آکر اظہار کفر کریں، جبکہ ان کا دل ایمان پر ہو ــــــ مگر جنھوں نے اپنا سینہ پھر سے کُفر کے لیے کھول دیا ہے ان پر خدا کا غضب ہے اور عذابِ عظیم ان کے انتظار میں ہے (من کفر باللہ منْ بعد ایمانه الا من اکرہ و قلبه مطمئن بالایمان ولکن من شرح بالکفر صدرًا فعلیهم غضب من الله و لهم عذاب عظیم)۔

درحقیقت یہاں دو گروہوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ایک وہ کہ جو دشمنوں کے چنگل میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ جو منطق کی زبان نہیں جانتے۔ اس ظلم اور دباؤ کی وجہ سے وہ اسلام سے بیزاری اور کُفر سے وفاداری کا اظہار کر دیتے ہیں حالانکہ وہ یہ سب کچھ زبان سے کہتے ہیں اور ان کے دل ایمان سے مالا مال ہوتے ہیں یہ لوگ یقیناً عفو و درگزر کے قابل ہیں بلکہ اصلاً ان سے کوئی گناہ ہی سرزد نہیں ہوا یہی وہ تقیہ ہے کہ جس کی اجازت دی گئی ہے جس کا مقصد جان کی حفاظت ہے تاکہ زیادہ طاقت جمع کر کے راہِ خدا میں زیادہ خدمت کی جا سکے۔ اسی تقیہ کو اسلام میں جائز قرار دیا گیا ہے۔

دوسرے وہ کہ جو سچ مچ اپنے دل کے دریچے کفر اور بے ایمانی کے لیے کھول دیتے ہیں اور اپنا عقیدہ بالکل بدل لیتے ہیں ایسے لوگ غضبِ الٰہی اور اس کے عذابِ عظیم میں گرفتار ہوں گے۔

ہو سکتا ہے یہاں "غضب" اس جہان میں رحمتِ الٰہی اور اس کی ہدایت سے محرومی کی طرف اشارہ ہو، اور "عذابِ عظیم" دوسرے جہان کی سزا اور عذاب کی طرف اشارہ ہو۔ بہرحال مرتدین کے بارے میں اس آیت میں جو تعبیر آئی ہے وہ بہت سخت اور ہلا دینے والی ہے۔

اگلی آیت میں ان کے مرتد ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے یہ اس لیے ہے کہ انھوں نے دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی ہے لہٰذا انھوں نے پھر سے کفر کی راہ اختیار کر لی ہے (ذٰلك بانهم استحبوا الحیٰوۃ الدنیا علی الاخرۃ)۔ اور خدا (کفر و انکار پر اصرار کرنے والی) کافر قوم کو ہدایت نہیں کرتا (وان الله لا یهدی القوم الکٰفرین)۔

مختصر یہ کہ جب وہ ایمان لائے تھے تو وقتی طور پر ان کے کچھ مادی مفادات خطرے میں پڑ گئے تھے اور چونکہ وہ دنیا سے لگاؤ رکھتے تھے لہٰذا اپنے ایمان پر پشیمان ہوئے اور پھر کفر کی طرف لوٹ گئے۔

Marfat.com

اگلی آیت میں ان کی عدم ہدایت کی دلیل بیان کی گئی ہے: "وہ ایسے لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مُہر لگا دی ہے"۔ اس طرح سے کہ وہ حق کو دیکھنے، سننے اور سمجھنے سے محروم ہیں (اولئك الذين طبع الله على قلوبهم وسمعهم وابصارهم)۔

اور واضح ہے کہ ایسے افراد معرفت کے سارے ذرائع گنوا بیٹھنے کی وجہ سے واقعاً غافل ہیں (واولئك هم الغفلون)۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں غلط اعمال اور طرح طرح کے گناہ انسان کی حسِ ادراک اور نگاہِ معرفت پر بُرے اثرات مرتب کرتے ہیں اور ان کے باعث انسان کی سلیم فکری رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے اور انسان اس راہ پر جس قدر آگے بڑھتا ہے اس کے دل، کان اور آنکھ پر غفلت کے پردے دبیز تر ہوتے چلے جاتے ہیں آخر کار اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ آنکھ رکھتے ہوئے دیکھ نہیں پاتا، کان رکھتے ہوئے سُن نہیں پاتا اور اس کی روح کا دریچہ حقائق کے لیے بند ہو جاتا ہے حسِ ادراک اور قوتِ تمیز اس سے لے لی جاتی ہے حالانکہ یہ اللہ کی عظیم ترین نعمتیں ہیں۔

"طبع" یہاں پر "مہر لگانے" کے معنی میں آیا ہے یہ اس طرف اشارہ ہے کہ بعض اوقات کسی صندوق کو مضبوطی سے بند کر کے اس پہ خاص انداز سے مُہر لگا دیتے ہیں مقصد یہ ہوتا ہے کہ کوئی اس کے سامان کو نہ چھیڑے اور اگر کوئی اسے کھولے تو فوراً معلوم ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ تعبیر مطلقاً نفوذ ناپذیر کے لیے کنایہ ہے۔

اگلی آیت میں ان کے کام کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے کہ ناچار اور یقیناً آخرت میں وہ خسارے میں ہیں (لا جرم انهم فى الأخرة هم الخسرون)۔

اس سے بڑھ کر خسارا کیا ہو گا کہ انسان ہدایت و سعادتِ جاوداں کے تمام ضروری وسائل اپنی ہوا و ہوس کی وجہ سے گنوا بیٹھے۔

پہلے دو گروہ بیان کیے گئے ہیں۔ ایک وہ کہ جو دشمن کے ظلم اور دباؤ کی وجہ سے تقیہ کے طور پر کفر آمیز باتیں کہہ دے جبکہ اس کا دل ایمان سے معمور ہو۔ اور دوسرا وہ کہ جو آزادی اور رغبت کے ساتھ کفر کی طرف پلٹ جائے۔ ان کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا گروہ بھی ہے اور وہ ہے فریب خوردہ لوگوں کا گروہ۔ لہٰذا اگلی آیت میں ان کی کیفیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے: تیرا رب ان لوگوں کے بارے میں کہ جو دھوکا کھا کر ایمان سے پلٹ گئے ہیں لیکن بعد ازاں انھوں نے توبہ کر لی اور ہجرت، جہاد اور صبر و استقامت کے ذریعے اپنی توبہ کی سچائی کو ثابت کیا ———
جی ہاں! ان کے بارے میں تیرا رب غفور و رحیم ہے (ثم ان ربك للذين هاجروا من بعد ما فتنوا ثم جاهدوا وصبروا ان ربك من بعدها لغفور رحيم)[1]

---

[1] "بعدھا" کی ضمیر بہت سے مفسرین کے بقول لفظ "فتنہ" کی طرف لوٹتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ ہجرت، جہاد اور صبر کی طرف لوٹتی ہے جن کا ذکر اس سے پہلے کی آیت میں آیا ہے۔

Marfat.com

یہ آیت مُرتد کی توبہ قبول ہونے کے لیے واضح دلیل ہے لیکن جن افراد کے بارے میں یہ آیت بات کررہی ہے وہ پہلے مشرک تھے اور بعد میں مسلمان ہوئے تھے لہٰذا وہ "مرتد ملی" شمار ہوں گے نہ کہ "مرتد فطری"۔ ۱

زیرِ بحث آخری آیت میں ایک عمومی تنبیہ کے طور پر اور بیداری کے لیے فرمایا گیا ہے: اس دن کا سوچو جب ہر شخص اپنی فکر میں غلطاں ہوگا اور اپنے ہی دفاع کے درپے ہوگا" تاکہ اپنے تئیں اس دردناک عذاب اور سزا سے بچا سکے (یوم تاتی کل نفس تجادل عن نفسها)۔ ۲

بعض اوقات گنہ گار عذاب سے بچنے کے لیے اپنے غلط اعمال کا سرے سے انکار ہی کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں :۔

واللہ ربنا ما کنا مشرکین

اس اللہ کی قسم جو ہمارا پروردگار ہے ہم مُشرک نہ تھے (انعام ——— ۲۳)

جب وہ دیکھیں گے کہ اس مکروفریب اور دروغ سے کام نہیں بنتا تو کوشش کریں گے کہ اپنے گناہ اپنے گمراہ رہنماؤں کی گردن پر ڈال دیں ۔ وہ کہیں گے :

ربنا ھٰؤلاء اضلونا فاٰتھم عذاباً ضعفاً من النار

پروردگارا ! یہ تھے جنھوں نے ہمیں گمراہ کیا ان کا عذاب دگنا کردے اور ہمارے عذاب کا حصہ انھیں دے دے ۔ (اعراف ——— ۳۸)

لیکن اس طرح سے ہاتھ پاؤں مارنا فضول ہے" اور وہاں ہر شخص کا نتیجۂ اعمال بے کم و کاست اسی کو دیا جائے گا (وتوفی کل نفس ما عملت)، اور کسی شخص پر ذرہ بھر ظلم نہیں ہوگا (وھم لا یظلمون)۔

چند اہم نکات :

ا۔ تقیہ اور اس کا فلسفہ :۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ حقیقی مسلمان دشمنوں کے مقابلے میں حیران کُن، تحمّل اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ کرتے تھے مثلاً جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے عمارؓ کے والد ایک جملہ بھی دشمن کی مرضی کا کہنے کو تیار نہ ہوئے ان کا دل ایمان باللہ اور عشقِ رسولؐ سے سرشار تھا اور انھوں نے اسی راہ میں اپنی جان نثار کر دی جبکہ عمار زبان سے کچھ کہنے کے لیے تیار ہو گئے پھر وہ سرتاپا پریشانی اور ندامت میں غرق ہو گئے

---

۱ "مرتد فطری" اسے کہتے ہیں کہ جو مسلمان باپ یا ماں سے پیدا ہوا اور اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام سے پھر جائے لیکن "مرتد ملی" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس کے ماں باپ اس کے انعقادِ نطفہ کے وقت مسلمان نہ ہوں لیکن بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا ہو اور پھر اس سے پھر جائے۔

۲ مفسرین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ "یوم" کس فعل سے تعلق رکھتا ہے بعض اسے فعلِ مقدر سے متعلق سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تقدیر میں "ذکرھم یوم تاتی" تھا، بعض کہتے ہیں کہ گزشتہ آیت میں جو "غفور رحیم" آیا ہے یہ ان کے فعل "غفران" اور "رحمت" سے تعلق رکھتا ہے (لیکن ہم نے سطور بالا میں پہلے احتمال کو اس کی علمی جامعیت کی وجہ سے ترجیح دی ہے)۔

Marfat.com

وہ اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے تھے انھیں اس وقت تک قرار نہ آیا جب تک رسول اللہؐ نے اطمینان نہ دلا دیا کہ ان کا عمل جان بچانے کے لیے ایک تدبیر کے طور پر شرعاً جائز ہے۔

حضرت بلالؓ کے حالات میں ہے کہ جس وقت وہ اسلام لائے اور وہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے دفاع کے لیے بڑی شجاعت سے اُٹھ کھڑے ہوئے تو مشرکین انھیں شدید اذیتیں دینے لگے یہاں تک کہ انھیں چلچلاتی دھوپ میں گھسیٹ کر لے جاتے اور بہت بڑا پتھر ان کے سینے پر رکھ دیتے اور ان سے مشرکانہ کلمات ادا کرنے کو کہتے مگر وہ ایسا نہ کرتے۔ مشرکین اتنا ستم ڈھاتے کہ ان کی سانس اکھڑ اکھڑ جاتی مگر وہ مسلسل "احد"، "احد" (اللہ ایک ہی ہے، اللہ ایک ہی ہے) کہتے چلے جاتے اور اس کے بعد کہتے کہ بخدا اگر مجھے معلوم ہو کہ کوئی بات بھی اس سے بڑھ کر تمھیں ناگوار ہے تو میں وہی کہتا۔[1]

حبیب بن زید انصاریؓ کے حالات میں ہے کہ جب مسیلمہ کذاب نے انھیں گرفتار کر لیا تو ان سے پوچھا۔

"کیا تو گواہی دیتا ہے کہ محمدؐ اللہ کا رسول ہے؟

انھوں نے کہا: ہاں

پھر اس نے پوچھا: کیا تو یہ گواہی دیتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟

حبیب نے تمسخر سے کہا: مجھے تمھاری بات نہیں سنائی دے رہی۔

مسیلمہ اور اس کے پیروکاروں نے انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا مگر ان کے پائے استقامت میں کوئی لرزش نہ آئی اور وہ چٹان کی طرح ڈٹے رہے۔[2]

ایسے ہلا دینے والے واقعات تاریخ اسلام میں خصوصاً صدر اوّل کے مسلمانوں اور آئمہ اہلِ بیت علیہم السّلام کے اصحاب و انصار میں بہت زیادہ ہیں۔

اسی بناء پر محققین نے کہا ہے کہ ایسے مواقع پر تقیہ اختیار نہ کرنا اور دشمن کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کرنا جائز ہے اگرچہ اس میں انسان کی جان کیوں نہ چلی جائے کیونکہ ہدف پرچمِ اسلام کی سربلندی اور اعلائے کلمہ اسلام ہے خصوصاً پیغمبر اسلامؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کے آغاز میں یہ امر خاص اہمیت رکھتا تھا۔

اس کے باوجود اس میں شک نہیں ہے کہ ایسے مواقع پر بھی تقیہ جائز ہے اور اس سے کم تر مواقع پر واجب ہے۔ تقیہ (خاص مواقع پر ہر جگہ نہیں) نا آگاہ افراد کے خیال کے برخلاف نہ تو کمزوری کی نشانی ہے نہ جمعیت دشمن سے خوف کی اور نہ ان کے دباؤ کے سامنے جھک جانے کی۔ بلکہ تقیہ ایک سوچی سمجھی تدبیر اور تکنیک ہے انسانی قوتوں کی حفاظت کی اور کم اہم مواقع پر اہلِ ایمان کی جان ضائع ہونے سے بچانے کی۔

---

[1] تفسیر فی ظلال جلد ۵ ص ۲۸۴۔

[2] تفسیر فی ظلال جلد ۵ ص ۲۸۴۔

Marfat.com

ساری دنیا میں معمول ہے کہ حریت پسند اور مجاہد اقلیتیں خود سر اور ظالم اکثریتوں کا تختہ الٹنے کے لیے مخفی طریقے اختیار کرتی ہیں یہ لوگ زیرِ زمین افراد تیار کرتے ہیں جو خفیہ طور پر کام کرتے ہیں اور بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ دوسروں کے بھیس میں کام کرتے ہیں یہاں تک کہ گرفتار ہوجائیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کا اصلی کام مخفی رہے تاکہ ان کے گروہ کی قوتیں بیکار ضائع نہ ہوجائیں اور وہ جدوجہد جاری رکھ سکیں۔

کوئی عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ایسے حالات میں وہ مجاہدین کہ جو تھوڑی سی تعداد میں ہیں اپنے آپ کو دشمن پر ظاہر کرکے تباہ ہوجائیں۔

اسی بناء پر تقیہ ایک اسلامی حکمتِ عملی سے پہلے ان تمام لوگوں کے لیے ایک عقلی اور منطقی طریقہ ہے کہ جو کسی طاقتور دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے یا کر رہے ہیں۔

اسلامی روایات میں بھی تقیہ کو ایک دفاعی ہتھیار اور ڈھال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چنانچہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

التقية ترس المؤمن والتقية حرز المؤمن

تقیہ ——— مومن کی ڈھال اور اس کا دفاعی ہتھیار ہے [1]

(توجہ رہے کہ تقیہ کو یہاں سپر اور ڈھال سے تشبیہ دی گئی ہے جبکہ ڈھال وہ ہتھیار ہے کہ جسے صرف میدانِ جنگ میں دشمن سے مقابلہ کرتے ہوئے انقلابی قوتوں کی حفاظت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے)۔

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ احادیث میں تقیہ کو دین کی نشانی، ایمان کی علامت اور دین کے دس حصوں میں سے نو حصے شمار کیا گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔

البتہ تقیہ ایک وسیع موضوع ہے یہاں اس کی تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اس بات کی وضاحت ہوجائے کہ جو لوگ تقیہ کی مذمت کرتے ہیں وہ درحقیقت اس کی شرائط اور فلسفے سے آگاہی نہیں رکھتے۔

اس میں شک نہیں کہ بعض مواقع ایسے بھی ہیں جہاں تقیہ اختیار کرنا حرام ہے مثلاً جہاں تقیہ اسلامی قوتوں کی حفاظت کی بجائے مکتب دین کی نابودی یا اس کے لیے خطرے کا باعث ہو یا اس سے کسی بڑے فساد کی برائی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ایسے مواقع پر تقیہ کا بند توڑ دینا چاہیے اور اس سے جو نتائج برآمد ہوں انھیں قبول کرلینا چاہیے [2]

۲۔ فطری و ملی مرتد اور فریب خوردہ لوگ: جن لوگوں نے اسلام قبول نہ کیا ہو ان کے بارے میں اسلام سخت گیری نہیں کرتا (ہماری مراد اہل کتاب سے ہے)۔ اسلام انھیں پیہم دعوت اور منطقی تبلیغ کے ذریعے اپنی طرف بلاتا ہے اگر وہ اسے قبول نہ کریں اور ذمیوں کی شرائط پر مسلمانوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہیں تو اسلام نہ صرف انھیں

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۱۱ حدیث ۶ باب ۲۶، امر بالمعروف کے ابواب میں سے۔

[2] تقیہ کے بارے میں مکمل وضاحت، اس کے احکام، فلسفہ اور مختلف مدارک کے لیے ہماری کتاب "القواعد الفقھیۃ" کی تیسری جلد کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

امان دیتا ہے بلکہ ان کے مال وجان اور جائز مفادات کی حفاظت اپنے ذمّے لیتا ہے۔

لیکن جو لوگ اسلام قبول کرلیں اور پھر اس سے پھر جائیں اسلام کا رویہ ان کے بارے میں نہایت سخت ہے کیونکہ یہ عمل اسلامی معاشرے کو متزلزل کرنے کا سبب بنتا ہے یہ عمل حکومت اسلامی اور اس کے طریقے کے خلاف ایک قسم کا قیام شمار ہوتا ہے اور اکثر اوقات یہ عمل بدنیتی کی دلیل ہوتا ہے اور سبب بنتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے راز دشمنوں کے ہاتھ جا لگیں۔

بہرحال مرتد فطری وہ ہے کہ جس کا حمل ٹھہرتے وقت اس کے ماں باپ میں سے کوئی مسلمان تھا یا آسان لفظوں میں جو مسلمان زادہ ہے اور پھر وہ اسلام سے پھر جائے اور اسلامی عدالت میں یہ امر ثابت ہو جائے تو اسلام اس کے خون کو مباح سمجھتا ہے اس کے اموال اس کے وارثوں میں تقسیم ہونے چاہییں۔ اس کی بیوی کے لیے حکم ہے کہ وہ اس سے الگ ہو جائے اور ظاہراً اس کی توبہ قابلِ قبول نہیں ہے یعنی یہ تینوں احکام ایسے شخص پر ہر حالت میں نافذ ہوں گے لیکن اگر وہ واقعی پشیمان ہوں تو بارگاہِ الٰہی میں اس کی توبہ قبول ہوگی (البتہ اگر عورت اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس کی توبہ مطلقاً قبول کی جائے گی)۔

اسلام سے پھرنے والا اگر مسلمان زادہ نہ ہو تو اسے توبہ کا موقع دیا جائے گا اب اگر وہ توبہ کرلے وہ قابلِ قبول ہوگی اور اس کے لیے تمام سزائیں ختم ہو جائیں گی۔

جو لوگ اصل مفہوم سے آگاہ نہیں ہیں ہو سکتا ہے وہ مرتد فطری کے بارے میں اس سیاسی حکم کو سختی، عقیدے کا ٹھونسنا اور آزادی فکر سلب کرنا قرار دیں لیکن انھیں چاہیے کہ وہ اس حقیقت کی طرف غور کریں کہ یہ احکام اس شخص کے بارے میں نہیں ہیں جو باطنی طور پر یہ عقیدہ رکھتا ہے اور اس کا اظہار نہیں کرتا۔ یہ احکام تو صرف اس شخص کے بارے میں ہیں جو اظہار کرے اور پراپیگنڈا کرے۔ یعنی دراصل وہ موجود حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے اس امر پر غور سے واضح ہو جائے گا کہ یہ سختی بلاوجہ نہیں ہے یہ مسئلہ آزادی فکر و نظر کے بھی منافی نہیں ہے اور جیسا کہ ہم نے کہا بہت سے مشرقی اور مغربی ممالک میں اس سے ملتے جلتے قوانین موجود ہیں۔

اس سلسلے میں اسلام کی نظر اس نکتے پر بھی ہے کہ اسلام کو منطق اور دلیل کے ساتھ قبول کیا ہو۔ خاص طور پر جو شخص مسلمان باپ یا ماں سے پیدا ہوا ہو اور اس نے اسلامی ماحول میں پرورش پائی ہو اس کے لیے بہت بعید ہے کہ اس نے مفہومِ اسلام کو نہ پہچانا ہو۔ لہٰذا ایسے شخص کا پھر جانا اشتباہ اور ادراکِ حقیقت نہ کرنے کی نسبت سازش اور خیانت سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے اور ایسا شخص ایسی ہی سزا کا مستحق ہے۔

ضمناً یاد رکھیں کہ احکام ایک یا دو افراد کے ہرگز تابع نہیں ہوتے اس کے لیے مجموعی اور کلّی صورتِ حال کو نظر رکھنا چاہیے۔[1]

---

[1] "من کفر باللہ ......" اس جملے کی ترکیب کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا)

بعض اسے اس سے پہلے جملے کی تشریح و توضیح سمجھتے ہیں۔ بزبان اصطلاح یہ " الذین لا یؤمنون بآیات اللہ" کا بدل ہے۔

بعض اسے " کاذبون" کا بدل سمجھتے ہیں۔

بعض اسے محذوف الخبر مبتداء خیال کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس کی تقدیر اس طرح تھی:۔

من کفر باللہ من بعد ایمانہ فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذابٌ عظیم

اور حقیقت میں یہ جزائے شرط محذوف ہے کیونکہ بعد والا جملہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

اس کے بارے میں چوتھا احتمال بھی ہے کہ جو سب سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اس مبتداء کی خبر وہی ہے کہ جو خود آیت میں آئی ہے اور محذوف نہیں ہے اور " لکن من شرح بالکفر صدرًا " مبتداء کی نئے سرے سے توضیح ہے، کیونکہ جملہ استثنائیہ نے مبتداء اور خبر کے درمیان فاصلہ ڈال دیا ہے۔ ایسی تعبیرات دوسری زبانوں کے ادب میں بھی نظر آتی ہیں مثلاً فارسی زبان میں ہم کہیں گے۔

"جو شخص ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائے البتہ ان افراد کے استثنا کے ساتھ کہ جو دباؤ کی وجہ سے ایسا کریں اور ان کا دل ایمان سے معمور ہو ——— جی ہاں! ایسے لوگ کہ جو اسلام کے بعد کافر ہوں ان پر اللہ کا غضب ہو گا" (غور کیجیے گا)

Marfat.com

۱۱۲۔ وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا قَرْيَۃً كَانَتْ اٰمِنَۃً مُّطْمَئِنَّۃً يَّاْتِيْہَا رِزْقُہَا
رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰہِ فَاَذَاقَہَا اللّٰہُ لِبَاسَ
الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○
۱۱۳۔ وَلَقَدْ جَآءَہُمْ رَسُوْلٌ مِّنْہُمْ فَكَذَّبُوْہُ فَاَخَذَہُمُ الْعَذَابُ
وَہُمْ ظٰلِمُوْنَ ○
۱۱۴۔ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ اِنْ
كُنْتُمْ اِيَّاہُ تَعْبُدُوْنَ ○

ترجمہ

۱۱۲۔ (جو لوگ کفرانِ نعمت کرتے ہیں ان کے لیے) اللہ نے ایک آباد علاقے کی مثال بیان کی ہے کہ جہاں امن وامان اور سکون واطمینان تھا اور ہمیشہ ہر جگہ سے وہاں وافر رزق پہنچ جاتا تھا لیکن انھوں نے کفرانِ نعمت کیا اور اللہ نے ان کے اعمال کے باعث انھیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا۔

۱۱۳۔ خود انھی میں سے ایک رسول ان کے پاس آیا لیکن انھوں نے اس کی تکذیب کی اور عذابِ الٰہی نے انھیں آجکڑا کہ وہ ظالم تھے۔

۱۱۴۔ جب یہ صورتِ حال ہے تو اللہ نے جو کچھ روزی تمھیں دی ہے اس میں سے حلال و پاکیزہ کھاؤ اور نعمتِ خدا کا شکر ادا کرو، اگر اس کے عبادت گزار ہو۔

تفسیر

جنھوں نے کفرانِ نعمت کیا اور گرفتارِ عذاب ہوئے۔

ہم کئی بار کہہ چکے ہیں کہ یہ سورت نعمتوں کے ذکر سے معمور ہے اس میں مختلف قسم کی روحانی اور مادی نعمتوں کا تذکرہ ہے

Marfat.com

اس کی مناسبت سے بعض دیگر مباحث بھی آگئے ہیں۔ زیر نظر آیات میں نعماتِ الٰہی کے کفران کا نتیجہ ایک عینی مثال کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جو لوگ نعماتِ الٰہی کی ناشکری کرتے ہیں اللہ نے ان کے لیے ایک آبادی کی مثال بیان کی ہے کہ جو بڑے امن و سکون میں تھی۔ (ضرب اللہ مثلاً قریۃ کانت اٰمنۃ)۔

یہاں ایسا امن و امان تھا کہ سب باسی اطمینان سے رہتے سہتے تھے۔ انھیں یہاں سے چلے جانے کی کوئی مجبوری نہ تھی (مطمئنۃ)۔

امن و امان اور سکون و اطمینان کی نعمت کے علاوہ مختلف قسم کے جس رزق کی انھیں ضرورت تھی وہ وافر مقدار میں ہر جگہ سے پہنچ جاتا تھا (یأتیہا رزقہا رغداً من کل مکان)۔

لیکن آخرکار اس آبادی کے باسیوں نے نعماتِ الٰہی کا کفران کیا اور اللہ نے ان کے اعمال کی وجہ سے انھیں بھوک اور خوف کا لباس پہنا دیا (فکفرت بانعم اللہ فاذاقہا اللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون)۔

وہ نہ صرف مادی نعمتوں سے مالا مال تھے بلکہ انھیں روحانی نعمتیں بھی میسر تھیں ایک فرستادۂ الٰہی ان میں موجود تھا اور انھیں آسمانی تعلیمات میسر تھیں۔ انھی میں سے ایک رسُول ان کی طرف آیا، اس نے انھیں دینِ حق کی دعوت دی، اور اتمامِ حجت کیا لیکن انھوں نے اس کی تکذیب شروع کر دی" (ولقد جاءھم رسول منھم فکذبوہ)۔

اس موقع پر عذابِ الٰہی نے انھیں گھیر لیا کہ وہ ظالم و ستمگر تھے (فاخذھم العذاب وھم ظٰلمون)۔

جب تم نے ایسے زندہ اور واضح نمونے دیکھ لیے ہیں تو پھر ان غافلوں، ظالموں اور کفرانِ نعمت کرنے والوں کی راہ اختیار نہ کرنا" اللہ نے تمھیں جو رزق دیا ہے اس میں سے حلال اور پاکیزہ کھاؤ اور اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرو، اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو (فکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً واشکروا نعمت اللہ ان کنتم ایاہ تعبدون)۔

چند اہم نکات:

۱۔ یہ مثال ہے یا تاریخی واقعہ؟ زیر بحث آیات میں ایک آباد اور پُر نعمت جگہ کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس آبادی کے لوگ کفرانِ نعمت کی وجہ سے خوف، بھوک اور بُرے انجام کا شکار ہوئے اس لیے لفظ "مثلاً" استعمال کیا گیا ہے۔ نیز اس میں جو فعل ذکر کیے گئے ہیں وہ فعلِ ماضی کی صُورت میں ہیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ عملاً رونما ہوا ہے۔

اس سلسلے میں مفسّرین نے بحث کی ہے کہ کیا یہاں ایک عمومی مثال بیان کرنا مقصود ہے یا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جو عملاً خارجی حیثیت رکھتا ہے جو لوگ دوسرے احتمال کے حامی ہیں انھوں نے پھر اس مسئلے پر بھی گفتگو کی ہے

Marfat.com

کہ یہ علاقہ کہاں تھا؟

بعض کا خیال ہے کہ یہ سرزمینِ مکہ کی طرف اشارہ ہے اور شاید یہ کہنا کہ "یأتیھا رزقھا رغدًا من کل مکان" (اس آبادی کے لیے روزی فراوانی کے ساتھ ہر جگہ سے آتی ہے) اس احتمال کی تقویت کا باعث بنا ہے کیونکہ یہ کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس علاقے میں ضرورت کی چیزیں پیدا نہیں ہوتی تھیں باہر سے اس کی طرف لائی جاتی تھیں اس سے قطع نظر سورۂ قصص کی آیہ ۵۷ میں ہے:-

یجبی الیہ ثمرات کل شیٔ

ہر طرح کے پھل اس کی طرف لائے جاتے تھے۔

یقیناً یہ جملہ اس علاقہ سے مراد سرزمینِ مکہ ہونے سے بہت مناسبت رکھتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ تاریخی لحاظ سے واضح طور پر اس قسم کا کوئی ایسا واقعہ نہیں کہ جو مکہ میں رونما ہوا ہو کہ ایک دن وہاں بہت امن و سکون ہو اور دوسرے دن قحط و بدامنی نے اسے سختی سے گھیر لیا ہو۔

بعض دوسرے مفسرین کا کہنا ہے کہ یہ داستان بنی اسرائیل کے ایک گروہ سے مربوط ہے یہ لوگ ایک آباد علاقے میں زندگی بسر کرتے تھے اور کفرانِ نعمت کی وجہ سے قحط و بدامنی میں گرفتار ہو گئے تھے۔ اس بات کی شاہد وہ حدیث ہے جو امام صادق علیہ السلام سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:

"بنی اسرائیل کا ایک گروہ بہت خوشحال زندگی گزار رہا تھا یہاں تک کہ وہ لوگ غذا سے چھوٹے چھوٹے مجسمے بناتے تھے اور بعض اوقات اپنے بدن (کی نجاست) کو بھی ان سے صاف کر لیتے تھے لیکن انجام کار ان کا معاملہ یہاں تک پہنچا کہ وہ مجبور ہو گئے کہ غلاظت سے آلودہ اسی غذا کو کھائیں اور یہی وہ چیز ہے کہ جس کے بارے میں اللہ قرآن میں فرماتا ہے:

ضرب اللہ مثلاً قریۃ کانت اٰمنۃ مطمئنۃ ۔۔۔۔[1]

اس جیسے مضمون کی اور روایات بھی امام صادق علیہ السلام اور تفسیر علی بن ابراہیم سے نقل ہوئی ہیں کہ جن کے اسناد پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ورنہ مسئلہ واضح تھا۔[2]

یہ احتمال بھی ہے کہ مذکورہ آیت قوم سبا کے واقعے کی طرف اشارہ ہو کہ جو مین کی آباد سرزمین میں زندگی بسر کرتی تھی۔ قرآن نے سورۂ سبا کی آیت ۱۵ تا ۱۹ میں ان کی زندگی کی داستان بیان کی ہے کہ وہ لوگ بہت سرسبز علاقے میں رہتے تھے وہاں پھلوں سے لدے ہوئے باغات تھے ہر طرف امن و امان تھا۔ پاک و پاکیزہ زندگی تھی وہ غرور سرکشی اور کفرانِ نعمت کا شکار ہوئے جس کے باعث ان کا علاقہ ویران ہو گیا۔ اور وہ لوگ اِدھر اُدھر منتشر ہو کر ساری دنیا کے لیے سامانِ عبرت

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۳ ص ۹۱ (توجہ رہے کہ مندرجہ بالا حدیث تفسیر عیاشی سے لی گئی ہے اور اس کی احادیث مرسل ہیں)۔

[2] ایضاً۔

Marfat.com

بن گئے۔

"یأتیھا رزقھا رغدا من کل مکان" لازمی طور پر اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ علاقہ خود سرسبز و شاداب نہیں تھا بلکہ ہو سکتا ہے "کل مکان" سے مراد اسی علاقے اور شہر کے اطراف ہوں اور ہم جانتے ہیں کہ ایک وسیع علاقے کی پیداوار شہر یا مرکزی بستی کی طرف منتقل ہوتی ہے۔

اس نکتے کی یاددہانی بھی ضروری ہے کہ کوئی مانع نہیں کہ زیر بحث آیت ان سب کی طرف اشارہ ہو بہرحال تاریخ میں ایسے بہت سے علاقوں کا ذکر ہے کہ جو اس انجام سے دوچار ہوئے لہٰذا آیت کی تفسیر کے بارے میں کوئی اہم مشکل باقی نہیں رہتی اگرچہ کسی ایک علاقے کے تعین کے بارے میں عدم اطمینان کے باعث بعض مفسرین نے اسے ایک عمومی مثال قرار دیا ہے۔ لیکن زیر نظر آیات کا ظاہری مفہوم اس تفسیر سے مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس کی سب تعبیرات ایک حقیقی واقعے پر دلالت کرتی ہیں۔

۲۔ **امن اور رزقِ فراواں:** زیر نظر آیات میں اس آباد اور پر برکت علاقے کی تین خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے پہلی خصوصیت امن و امان ہے۔ اس کے بعد اطمینانِ حیات کا ذکر ہے اور تیسری خصوصیت یہ ہے کہ فراواں رزق اس کی طرف آتا ہے یہ تینوں خصوصیات آیت میں موجود ترتیب کے لحاظ سے طبیعی ترتیب اور علت و معلول کے سلسلے کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ جب تک امن و امان نہ ہو کوئی شخص کسی جگہ اطمینان سے زندگی نہیں گزار سکتا اور جب تک یہ دونوں نہ ہوں کوئی شخص پیداوار کے حصول اور اقتصادی امور میں لگاؤ سے کام نہیں کر سکتا۔ یہ بات ہم سب کے لیے اور ان لوگوں کے لیے ایک درس ہے جو چاہتے ہیں کہ ان کی سرزمین آباد اور ہر لحاظ سے آزاد ہو۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے امن و امان کی ضرورت ہے اس کے بعد علاقے کے لوگوں کو اپنے مستقبل کے لیے پُرامید ہونا چاہیے اور اس کے بعد اقتصادی فعالیت کی باری آتی ہے۔

لیکن یہ تینوں مادی نعمتیں اس وقت کمال کو پہنچتی ہیں جب ایمان و توحید جیسی نعمتوں سے ہم آہنگ ہوں اسی لیے مندرجہ بالا آیات میں ان تینوں نعمتوں کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے:

ولقد جاءھم رسول منھم

ایک رسول کہ جو انھی کی نوع میں سے تھا اسے ان کی ہدایت کے لیے مامور کیا گیا۔[1]

۳۔ **بھوک اور بدامنی کا لباس:** یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ زیر بحث آیات میں کفرانِ نعمت کرنے والوں کا انجام بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اللہ نے انھیں بھوک اور خوف کا لباس چکھایا۔

یعنی ایک طرف تو بھوک اور خوف کو لباس سے تشبیہ دی گئی ہے اور دوسری طرف پہنانے کی بجائے چکھانے کا

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۲ ص ۳۸۸۔

Marfat.com

ذکر ہے۔ اس تعبیر نے مفسّرین کو زیادہ غور و خوض پر اُبھارا ہے۔

البتہ ہوسکتا ہے بعض تشبیہات کا ہماری زبان میں معمول نہ ہو اور ہمیں ان پر تعجب ہو جبکہ یہی تعبیرات کسی دوسری زبان میں کوئی لطیف نکتہ بیان کر رہی ہوں مثلاً لباس کا چکھنا۔

ابن راوندی کے بقول اس سے ابن اعرابی نے پوچھا: کیا لباس بھی چکھا جاتا ہے؟

ابن راوندی نے کہا: فرض کیا تمھیں پیغمبر اسلام کی نبوت میں شک ہے لیکن تم اس پر شک نہیں کر سکتے کہ وہ ایک (فصیح) عرب تھے[۱]

بہرحال یہ تعبیر اس طرف اشارہ ہے کہ قحط اور بدامنی نے انھیں اس طرح سے گھیر رکھا تھا کہ جیسے لباس نے جسم کو گھیرا ہوتا ہے اور بدن کے ساتھ چمٹا ہوتا ہے دوسری طرف یہ قحط اور خوف اس طرح سے ان پر مسلّط تھا کہ گویا اسے وہ اپنی زبان سے چکھ رہے تھے یہ بات قحط کی انتہائی شدّت اور بدامنی کی دلیل ہے۔

درحقیقت جیسے ابتداء میں امن و خوشحالی نے ان کے سارے وجود کو سرشار کر رکھا تھا بعدازاں کفرانِ نعمت کے باعث اسی طرح فقر و فاقہ اور بدامنی نے ان کے وجودِ حیات کو گھیر لیا۔

۴۔ نعماتِ الٰہی کا ضیاع اور کفرانِ نعمت: جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا روایت میں پڑھا ہے کہ خوشحالی میں یہ قوم اس طرح سے غرور و غفلت میں گرفتار ہوئی کہ مفید اور محترم غذا کو اپنے بدن کی غلاظت دور کرنے کے لیے استعمال کرنے لگی اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انھیں قحط اور خوف میں مبتلا کر دیا۔

یہ بات ان تمام افراد اور قوموں کے لیے ایک تنبیہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ جو نعماتِ الٰہی میں مستغرق ہیں تاکہ وہ جان لیں کہ ہر قسم کا اسراف، حدِ اعتدال سے تجاوز اور نعمتوں کا ضیاع جرم ہے ایسا جرم کہ جو بہت ہی سنگین ہے، یہ ان سب کے لیے تنبیہ ہے کہ جو ہمیشہ اپنی اضافی غذا کو کوڑا کرکٹ کی نذر کر دیتے ہیں یہ ان لوگوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ جو تین چار مہمانوں کے لیے ۲۰ افراد کی ضرورت کے مطابق رنگا رنگ کھانے تیار کر دیتے ہیں یہاں تک کہ اس میں سے جو کھانا بچ جاتا ہے وہ غریب بھوکے انسانوں کے بھی کام نہیں آتا۔

یہ ان لوگوں کے لیے بھی تنبیہ ہے کہ جو غذائی اشیاء ذخیرہ کر رکھتے ہیں تاکہ بعد میں انھیں مہنگے داموں بیچیں یہاں تک وہ اشیاء خراب ہوجاتی ہیں لیکن وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ انھیں سستے داموں یا مُفت دے دیں۔

جی ہاں! ان سب اُمور پر خدا کے ہاں عذاب اور سزا ہے اور کم از کم سزا یہ ہے کہ نعمتیں سلب ہوجاتی ہیں۔

اس مسئلے کی اہمیت اس وقت زیادہ واضح ہوجاتی ہے جب ہم جان لیں کہ روئے زمین پر موجود غذا اور اناج محدود نہیں ہے دوسرے لفظوں میں زمین کی جو پیداوار ہے اس کے مطابق ضرورت مند اور بھوکے افراد بھی موجود ہیں اور اس میں جو بھی افراط و تفریط کی جائے گی اس کا نتیجہ اس کے مطابق لوگوں کی محرومی ہوگا۔

---

[۱] تفسیر فخرالدین رازی جلد ۲۰ ص ۱۲۸۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ اسلامی روایات میں اس مسئلے کی طرف سختی سے توجہ دلائی گئی ہے یہاں تک امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ۔

میرے والد تولیے سے غذا آلودہ ہاتھ صاف کرنے پر ناراض ہوتے تھے وہ غذا آلودہ ہاتھ کو احترامِ غذا میں چاٹ لیتے تھے۔ کوئی بچہ ان کے پاس ہوتا اور کوئی چیز اس کے برتن میں باقی رہ جاتی تو اس کے برتن کو خود صاف کر لیتے یہاں تک کہ آپ خود فرماتے کہ کبھی دسترخوان سے تھوڑی سی غذا گر جاتی ہے تو میں اسے تلاش کرتا رہتا ہوں اس حد تک کہ گھر کی خادمہ ہنستی ہے (کہ میں غذا کے تھوڑے سے ٹکڑے کو تلاش کرتا پھرتا ہوں) آپ مزید کہتے کہ تم سے پہلے بعض قومیں ایسی تھیں کہ جنھیں اللہ نے فراواں نعمت عطا کی لیکن انھوں نے ناشکری کی، غذا کو بلا وجہ ضائع کیا تو خدا نے اپنی برکتیں ان سے واپس لے لیں اور انھیں قحط میں مبتلا کر دیا۔[1]

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۹۱ (ہم نے حدیث کی تلخیص کر کے مفہوم بیان کیا ہے)۔

Marfat.com

۱۱۵۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ
مَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○
۱۱۶۔ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا
حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى
اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ○
۱۱۷۔ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۖ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○
۱۱۸۔ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ
مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ○
۱۱۹۔ ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ
وَاَصْلَحُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○

ترجمہ

۱۱۵۔ اللہ نے تم پر صرف مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور حرام کیے ہیں کہ جن کا سر غیر خدا کے نام پر کاٹا جائے البتہ جو لوگ مجبور ہو جائیں مگر حد سے تجاوز نہ کریں (اللہ انھیں سزا نہیں دے گا) کیونکہ اللہ غفور و رحیم ہے۔

۱۱۶۔ اور اللہ پر افتراء باندھتے ہوئے اپنی زبانوں سے غلط طور پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام ہے کیونکہ اللہ پر افتراء باندھنے والے فلاح نہیں پائیں گے۔

۱۱۷۔ ایسے لوگوں کو دنیا کا تھوڑا سا فائدہ تو مل جائے گا مگر دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے۔

۱۱۸۔ جو چیزیں پہلے ہم نے تجھ سے بیان کی ہیں انھیں ہم نے یہودیوں پر حرام کیا ہے۔ ان پر ہم نے

Marfat.com

کوئی ظلم نہیں کیا۔

۱۱۹۔ ـــــ لیکن جنھوں نے جہالت کے باعث بُرے کام کیے ہیں مگر بعدازاں انھوں نے توبہ کرلی ہے اور اصلاح کے لیے اقدام کیا ہے تو پھر تیرا پروردگار بخشنے والا اور مہربان ہے۔

تفسیر:

جھوٹے کبھی فلاح نہیں پائیں گے:

گذشتہ آیات میں اللہ کی پاکیزہ نعمتوں اور ان کے شکرانے کے بارے میں گفتگو تھی۔ زیر بحث آیات میں وہی سلسلہ کلام جاری ہے۔ اب ان چیزوں کا ذکر ہے کہ جو واقعاً حرام ہیں نیز جنھیں لوگوں نے دینِ خدا میں بدعت کے طور پر حرام قرار دے لیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: جانوروں سے مربوط غذا میں سے اللہ نے چار چیزیں تم پر حرام قرار دی ہیں مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور کہ جن کا سر غیر اللہ کے نام پر کاٹا گیا ہے (انما حرم علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اھل لغیر اللہ بہ[۱])

مُردار، خون اور سؤر کا گوشت حرام ہونے کا فلسفہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۷۳ کی تفسیر میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا (پہلی جلد میں مذکورہ آیت کی طرف رجوع کریں)۔

دورِ حاضر میں کسی سے مخفی نہیں کہ یہ تینوں چیزیں کس قدر آلودگی کی حامل ہیں۔ مردار طرح طرح کے جراثیم کا منبع ہے۔ خون بھی بدن کے تمام اجزاء کی نسبت جراثیموں کے اعتبار سے زیادہ آلودہ ہے اور سؤر کا گوشت بھی کئی طرح کی خطرناک بیماریوں کے لیے عامل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان تمام سے قطع نظر جیسا کہ ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان کیا ہے خون اور سؤر کا گوشت کھانے سے جسمانی نقصانات کے علاوہ نفسیاتی اور اخلاقی قباحتیں بھی پیدا ہوتی ہیں اور یہ اپنے ہارمونز (Hormones) انسان کے وجود میں بطور یادگار چھوڑ جاتے ہیں۔

مردار بھی چونکہ ذبح نہیں کیا گیا ہوتا اس لیے اس سے خون باہر نہیں نکلتا لہٰذا اس کے کھانے سے دوسرے نقصان کے علاوہ خون کھانے کا نقصان بھی ہوتا ہے۔

رہے وہ جانور کہ جو غیر خدا کے نام پر ذبح ہوتے ہیں ـــــ (ہم جو آج بسم اللہ کہتے ہیں وہ اس کی بجائے بتوں کے نام لیتے تھے) ـــــ اس کی حرمت یقیناً صحت کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ یہ حکم اخلاقی اور روحانی پہلو رکھتا ہے۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اسلام میں حلال و حرام کا ہر حکم صرف صحت کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ کچھ محرمات

---

[۱] "اُھلّ" "اھلال" کے مادہ سے لیا گیا ہے اور یہ بھی دراصل "ھلال" سے لیا گیا ہے یہ چاند دیکھتے وقت آواز بلند کرنے کے معنی میں ہے مشرکین جانور ذبح کرتے وقت بتوں کے نام بلند آواز سے لیتے تھے لہٰذا اسے "اھل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

صرف روحانی پہلو رکھتی ہیں ان کا مقصد تہذیبِ نفس ہوتا ہے اور انھیں اخلاقی مسائل کے پیشِ نظر حرام کیا گیا ہے یہاں تک کہ بعض اوقات صرف نظامِ معاشرہ کی حفاظت کے لیے بعض چیزیں حرام قرار دے دی گئی ہیں جو جانور نامِ خدا لیے بغیر ذبح کر دیئے جاتے ہیں ان کی حُرمت بھی اخلاقی پہلو سے ہے کیونکہ یہ حکم ایک طرف سے تو شرک اور بُت پرستی کے خلاف جنگ ہے اور دوسری طرف ان نعمتوں کے خالق کی طرف توجّہ کا باعث ہے۔

ضمنی طور پر اس آیت سے اور بعد کی آیات سے مجموعی طور پر یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ گوشت استعمال کرنے کے سلسلے میں اسلام اعتدال کا راستہ معیّن کرتا ہے۔ اسلام اس سلسلے میں نہ ساگ پات کھانے والے ہندو مت کی طرح اس غذا کو بالکل حرام قرار دیتا ہے اور نہ دورِ جاہلیّت اور ہمارے زمانے کے بعض بزعمِ خویش تہذیب یافتہ لوگوں کی طرح ہر قسم کا گوشت کھانے کی اجازت دیتا ہے (یہاں تک کہ بعض لوگ سوسمار، سرطان اور طرح طرح کے کیڑے مکوڑے تک کھا جاتے ہیں)۔

ایک سوال کا جواب:

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ:

زیرِ بحث آیت میں حکمِ حرمت صرف چار حرام چیزوں میں منحصر ہے جبکہ ہم جانتے ہیں کہ اور بھی بہت سے حرام جانور ہیں مثلاً درندوں کا گوشت اور چھلکے والی مچھلی کے علاوہ طرح طرح کے دریائی جانور۔ یہاں تک کہ قرآن کی دوسری سورتوں میں بھی ان چار سے زیادہ حرام چیزوں کا ذکر ہے۔ مثلاً سُورۂ مائدہ کی آیت ۲ دیکھیے۔ لہٰذا یہاں حکم چار چیزوں میں محدود کیوں ہے؟

اس سوال کا جواب ہم چھٹی جلد میں سُورۂ انعام کی آیہ ۱۴۵ کے ذیل میں بھی دے آئے ہیں ہم کہہ چکے ہیں کہ یہاں ایک نکتہ پنہاں ہے وہ یہ کہ اس مقام پر حصر اصطلاح کے مطابق "حصرِ اضافی" ہے یعنی "انما" جو کہ حصر کے لیے آتا ہے یہاں اس کا مقصد بدعتوں کی نفی ہے یہ بدعتیں مشرکین میں کچھ جانوروں کی حرمت کے بارے میں رائج تھیں۔ دراصل قرآن کہتا ہے: یہ حرام ہیں نہ کہ وہ جو تم کہتے ہو۔

یہ احتمال بھی ہے کہ جن چار چیزوں کا یہاں قرآن ذکر کرتا ہے وہ اصلی اور بنیادی محرّمات ہیں (مثلاً "منخنقة" یعنی جس جانور کا گلا گھونٹ دیا جائے یا اس قسم کا کوئی جانور جس کا ذکر سُورۂ مائدہ کی آیہ ۳ میں آیا ہے وہ بھی انھی چار جانوروں میں داخل ہے کیونکہ یہ بھی مردار ہی ہے) اسی طرح جانوروں کے کچھ حرام اجزاء یا مختلف قسم کے حیوانات مثلاً درندے یہ سب دوسرے درجے کے محرمات ہیں اسی لیے ان کی حُرمت کا حکم سنّتِ رسولؐ میں آیا ہے اس صورت میں آیت میں موجود حصر حقیقی حصر ہو سکتا ہے (غور کیجیے گا)۔

جیسا کہ قرآن کی سنت ہے، آیت کے آخر میں استثنائی مواقع کا ذکر ہے فرمایا گیا ہے: جو لوگ حرام گوشت کھانے پر مجبور ہو جائیں (مثلاً کسی بیابان میں ہوں جہاں کچھ اور کھانے کو نہ مل سکے اور ان کی جان خطرے میں ہو) اور صرف جان بچانے کی حد تک ان میں سے کچھ کھالیں اور حد سے تجاوز نہ کریں تو ان کے لیے کوئی حرج نہیں کیونکہ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے

Marfat.com

(فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان اللہ غفور رحیم)۔

"باغ" یا "باغی" "بغی" کے مادہ سے طلب کے معنی میں ہے یہاں طلب لذت کے معنی میں یا حرام الٰہی کو حلال شمار کرنے کے مفہوم میں ہے۔

"عاد" یا "عادی" "عدو" کے مادہ سے تجاوز کرنے کے معنی میں ہے یہاں وہ شخص مراد ہے کہ جو بوقت ضرورت ان حرام کردہ چیزوں کو حد لازم سے بڑھ کر استعمال کرے۔

البتہ اہل بیت علیہم السلام کی بعض روایات میں "باغی" "ظالم" کے معنی میں اور "عادی" "غاصب" کے معنی میں تفسیر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ بعض روایات میں "باغی" کا مطلب امام کے خلاف قیام کرنے والا شخص اور "عادی" کا مطلب چور بیان کیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے یہ روایات اس طرف اشارہ ہوں کہ حرام گوشت کھانے کے لیے اضطراری کیفیت عموماً دوران سفر پیدا ہوتی ہے اب اگر کوئی شخص ظلم، غصب اور چوری کے لیے سفر کرے اور اس قسم کا گوشت کھائے اگرچہ اس کے لیے ضروری ہو جائے کہ اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کرے لیکن اللہ تعالیٰ ایسے شخص کا یہ گناہ نہیں بخشے گا۔

بہرحال یہ تفسیریں آیت کے عمومی مفہوم کے منافی نہیں ہیں اور انھیں یکجا کر کے دیکھا جا سکتا ہے۔

مشرکین نے بے بنیاد طور پر جو چیزیں حرام قرار دے لی تھیں اور جن کا ذکر پہلے ہو چکا۔ اگلی آیت میں ان کے بارے میں صراحت سے فرمایا گیا ہے: اور اللہ پر افتراء باندھتے ہوئے اپنی زبانوں سے غلط طور پر یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام ہے (ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھٰذا حلال و ھٰذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب)[1]۔

یعنی یہ ایک واضح جھوٹ ہے کہ جو صرف تمھاری زبانوں سے ٹپکا ہے کہ تم خود سے کچھ چیزوں کو حلال بنا لیتے ہو اور کچھ کو حرام۔ (یہ ان چوپایوں کی طرف اشارہ ہے کہ مشرکین جن میں سے کچھ کو اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے اور کچھ کو حلال اور ان میں سے بعض کو بتوں کے نام کر دیتے تھے)۔

کیا اللہ نے تمھیں ایسی قانون سازی کا حق دیا ہے؟ کیا یہ خدا پر افتراء نہیں؟ تمھیں تمھارے بے ہودہ افکار اور اندھی تقلید نے ان بدعتوں سے باندھ رکھا ہے۔

سورۂ انعام کی آیہ ۱۳۶ میں وضاحت کے ساتھ آیا ہے کہ وہ لوگ اس طرح کے حلال و حرام گھڑنے کے لیے اپنی

---

[1] "ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب" کی ترکیب اس طرح ہے:

اس میں لام، لام تعلیل ہے اور "لما تصف" میں "ما" "مائے مصدریہ" ہے اور "کذب"، "تصف" کا مفعول ہے جو مجموعی طور پر یوں ہوگا

لا تقولوا ھٰذا حلال و ھٰذا حرام لتوصیف السنتکم الکذب

اپنی زبانوں سے جھوٹی توصیف کرتے ہوئے نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور وہ حرام ہے۔

Marfat.com

زرعی پیداوار کا ایک حصہ اللہ کے نام پر وقف کر دیتے تھے اور ایک حصہ بتوں کے نام۔ تعجب کی بات ہے کہ وہ کہتے تھے کہ بتوں کے نام جو حصہ کیا ہے وہ ہرگز اللہ کو نہیں پہنچ سکتا لیکن جو حصہ خدا کے لیے ہے وہ بتوں کو پہنچتا ہے لہٰذا اللہ کے حصے کو نقصان پہنچ جائے تو بتوں کے حصے سے اسے پورا نہیں کیا جا سکتا لیکن بتوں کا حصہ کم ہو جائے تو اسے اللہ کے حصے سے پورا کر دیتے اس قسم کی اور بھی ان میں بہت سی خرافات تھیں۔

سورۂ انعام کی آیت ۱۴۸ میں ہے:

سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا اٰباءنا ولا حرمنا من شیء

مشرکین کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم لوگ شرک کرتے اور نہ ہمارے آباء اور نہ ہی ہم کوئی چیز اپنے اوپر حرام کرتے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ انھیں حق پہنچتا ہے کہ کچھ چیزوں کو حلال قرار دے لیں یا حرام۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خدا بھی ان کی بدعتوں کا موافق ہے (یہی وجہ ہے کہ پہلے وہ کوئی بدعت ایجاد کرتے، کسی چیز کو حلال یا حرام بناتے اور پھر اسے خدا سے منسوب کر دیتے اور اس طرح ایک اور جھوٹ کے مرتکب ہوتے)[1]

آیت کے آخر میں ایک ضمنی خطرے کے الارم کے طور پر فرمایا گیا ہے: جو لوگ خدا پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کبھی نجات اور فلاح نہیں پائیں گے (ان الذین یفترون علی اللہ الکذب لا یفلحون)۔

اصولی طور پر جھوٹ کسی کے بارے میں بھی ہو، یہ ہی بدبختی اور عدم فلاح کا سبب ہے۔ چہ جائیکہ وہ خدائے بزرگ کے بارے میں ہو۔ ظاہر ہے ایسے جھوٹ کا گناہ اور بُرے اثرات کئی گنا ہوں گے۔

اگلی آیت میں عدمِ فلاح اور بدبختی کی اس طرح سے وضاحت کی گئی ہے: ایسے کاموں سے وہ اس دنیا سے تو تھوڑا سا فائدہ اٹھالیں گے لیکن اس کے مقابلے میں دردناک عذاب ان کے انتظار میں ہے (متاع قلیل ولهم عذاب الیم)۔

یہ متاعِ قلیل ہو سکتا ہے شکمِ مادر میں مر جانے والے جانوروں کے بچوں کی طرف اشارہ ہو جنھیں وہ اپنے لیے حلال شمار کرتے تھے اور ان کا گوشت استعمال کرتے تھے یا ہو سکتا ہے ان کی خود غرضی اور پیٹ پرستی کی طرف اشارہ ہو کہ جو اُن کی بدعتوں کا باعث تھی یا یہ کہ ان کے اس طرزِ عمل کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اس شرک اور بُت پرستی کو مضبوط کرتے اور لوگوں کو اس میں مشغول رکھتے تاکہ ان پر اس طرح سے زیادہ عرصہ تک حکومت کرتے رہیں ——— یہ سب کچھ "متاعِ قلیل" تھا کہ جس کا نتیجہ "عذابِ الیم" تھا۔

ممکن ہے یہاں یہ سوال کیا جائے کہ چار چیزوں کا جن کا ان آیات میں ذکر ہے۔ ان کے علاوہ جانور یہودیوں پر

---

[1] اسی بناء پر زیر بحث آیت میں خدا پر افتراء کا ذکر جو لام کے ساتھ آیا ہے، ان کی بدعتوں کا نتیجہ ظاہر کر رہا ہے (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

کیوں حرام کیے گئے تھے ؟
اگلی آیت گویا اس سوال کا جواب دے رہی ہے ، ارشاد ہوتا ہے : اور یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کر دی تھیں جو تم سے پہلے بیان کر چکے ہیں (وعلی الذین ھادوا حرمنا ما قصصنا علیك من قبل)۔
یہ ان چیزوں کی طرف اشارہ ہے کہ جن کا ذکر سورہ انعام کی آیہ ۱۴۶ میں اس طرح سے آیا ہے :

وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر ومن البقر والغنم حرمنا
علیھم شحومھما الا ما حملت ظھورھما او الحوایا او ما اختلط بعظم
ذلك جزینا ھم ببغیھم وانا لصادقون

یہودیوں پر ہم نے ہر ناخن دار حیوان حرام کر دیا ہے (یہ ان جانوروں کی طرف اشارہ ہے جو گھوڑے کے سُموں کی طرح یکپارچہ ہوتے ہیں) نیز گائے اور گوسفند کی پشت، انتڑیوں کے درمیان اور دونوں پہلوؤں یا ہڈی سے ملی ہوئی چربی کے علاوہ باقی چربی بھی حرام قرار دی ہے۔ یہ حرمت ان کے ظلم کی وجہ سے سزا کے طور پر ہے اور ہم سچ کہتے ہیں۔

درحقیقت حرمت کے یہ اضافی احکام یہودیوں کے مظالم اور ستم کاریوں پر عذاب اور سزا کے طور پر تھے۔ اسی لیے زیر بحث آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے :

وما ظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون

ہم نے ان پر ستم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔

سورہ نساء کی آیت ۱۶۰ اور ۱۶۱ میں ہے :

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ
عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ

یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے کچھ پاکیزہ غذائیں جو ذاتاً حلال تھیں ہم نے ان پر حرام کر دیں کیونکہ وہ لوگوں کو راہِ خدا سے روکتے تھے اور سُود کھاتے تھے حالانکہ انہیں ان کاموں سے منع کیا گیا تھا اور وہ لوگوں کا مال باطل طور پر کھاتے تھے۔

لہٰذا یہودیوں پر کچھ گوشت انہیں سزا دینے کے لیے حرام قرار دے دیئے گئے اور مشرکین کو حق نہیں پہنچتا تھا وہ اس سے استدلال کریں۔
علاوہ ازیں جو چیزیں مشرکین نے حرام کی ہوئی تھیں نہ یہودیوں کے مذہب میں حرام تھیں اور نہ دینِ اسلام میں۔ وہ تو خرافات کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آنے والی بدعتیں تھیں۔
(ہو سکتا ہے زیر بحث آیت اس نکتے کی طرف بھی اشارہ ہو کہ تم نے ایسا کام کیا ہے کہ جو کسی آسمانی کتاب سے

Marfat.com

مطابقت نہیں رکھتا)۔ (وما ظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون)۔

زیر نظر آخری آیت میں قرآن اپنی روش کے مطابق فریب خوردہ یا پشیمان ہوجانے والے افراد کے لیے لوٹ آنے کا راستہ کھولتے ہوئے فرماتا ہے: تیرا پروردگار ان کے بارے میں کہ جنھوں نے جہالت کے باعث بُرے اعمال انجام دیئے ہیں اور پھر انھوں نے توبہ کرلی ہے اور اصلاح و تلافی کی ہے ——— جی ہاں! تیرا پروردگار توبہ و اصلاح کے بعد بخشنے والا مہربان ہے (ثم ان ربك للذين عملوا السوء بجهالة ثم تابوا من بعد ذلك واصلحوا ان ربك من بعدها لغفور رحيم)

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ———

اولاً ارتکاب گناہ کی وجہ جہالت کو شمار کیا گیا ہے کیونکہ جہالت ہی بہت سے گناہوں کا حقیقی عامل ہے اور جو لوگ جہالت میں ارتکاب گناہ کرتے ہیں وہی آگاہی کے بعد راہِ حق کی طرف لوٹتے ہیں نہ کہ وہ جنھوں نے جان بوجھ کر غرور و تکبّر، تعصب یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے غلط راستہ اختیار کیا ہو۔

ثانیاً قرآن یہاں توبہ کو فقط دل کی توبہ و ندامت تک محدود نہیں کرتا بلکہ اس کی عملی تاثیر پر تاکید کرتا ہے اور اصلاح و تلافی کے ساتھ توبہ کو مکمل شمار کرتا ہے یہ اس لیے ہے کہ ہم غلط فکری کو دل و دماغ سے باہر نکالیں کیونکہ ہزاروں گناہوں کا ازالہ "استغفر الله" کے ایک جملے سے نہیں ہوسکتا۔ انسانی روح یا معاشرے کو جو نقصان گناہ سے پہنچتا ہے اس کی اصلاح و مرمت کی ضرورت ہوتی ہے یہی ہے حقیقی توبہ نہ کہ زبانی توبہ۔

ثالثاً اس مسئلے پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ "ان ربك من بعدها لغفور رحيم" (ایسا ہوجائے تو یقیناً تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے) کہہ کر تاکید مزید کی گئی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رحمتِ الٰہی کا حصول توبہ و اصلاح کے بعد ہی ممکن ہے۔

بہ الفاظ دیگر یہ حقیقت ہے کہ توبہ کی قبولیت یقینی طور پر ندامت، تلافی اور اصلاح کے بعد ہے اور تین تعبیروں کے ذریعے ایک ہی آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے پہلے لفظ "ثم" آیا ہے پھر "من بعد ذلك" آیا ہے اور آخر میں "من بعدها" فرمایا گیا ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ وہ بُرے افراد جو مسلسل گناہ کرتے رہتے ہیں لیکن کہتے ہیں کہ ہم لطفِ الٰہی اور اس کی بخشش و رحمت کے امیدوار ہیں، یہ سوچ اپنے دماغ سے نکال دیں۔

Marfat.com

۱۲۰۔ اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا ؕ وَلَمْ یَکُ مِنَ
الْمُشْرِکِیْنَ ۝

۱۲۱۔ شَاکِرًا لِّاَنْعُمِہٖ ؕ اِجْتَبٰہُ وَھَدٰہُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝

۱۲۲۔ وَاٰتَیْنٰہُ فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً ؕ وَاِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ؕ ۝

۱۲۳۔ ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا کَانَ
مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝

۱۲۴۔ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَی الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ ؕ وَاِنَّ رَبَّکَ لَیَحْکُمُ بَیْنَھُمْ
یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فِیْمَا کَانُوْا فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۲۰۔ ابراہیم (تن تنہا) ایک امت تھا، امرالٰہی کا مطیع تھا، ہر قسم کے انحراف سے مبرا تھا اور وہ ہرگز مشرکین میں سے نہ تھا۔

۱۲۱۔ وہ پروردگار کی نعمتوں کا شکر گزار تھا۔ اللہ نے اسے منتخب کیا اور اسے سیدھے راستے کی ہدایت کی

۱۲۲۔ اور دنیا میں ہم نے اسے ہمت نیک بخشی اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہے۔

۱۲۳۔ پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیم کے دین کی اتباع کر کہ جو ہر قسم کے انحراف سے پاک ہے اور مشرکین میں سے نہ تھا۔

۱۲۴۔ ہفتے کا روز (کہ جس روز یہودیوں پر کچھ چیزیں حرام تھیں) سزا کے طور پر تھا کہ اس میں بھی انھوں نے اختلاف کیا اور جن چیزوں میں وہ اختلاف کرتے تھے ان کے بارے میں تیرا رب قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔

Marfat.com

تفسیر

ابراہیمؑ اپنی ذات میں ایک اُمت تھے :

ہم کہہ چکے ہیں کہ اس سورہ کا موضوع نعمتوں کا بیان ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے جذبۂ شکر گذاری کو بیدار کیا جائے تاکہ وہ یہ نعمتیں عطا کرنے والے کی معرفت کی جانب آئے۔

زیر نظر آیات میں خدا کی شکر گزاری ایک کامل مصداق یعنی مکتب توحید کے مجاہد ہیرو اور علمبردار حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے ان کا ذکر اس لحاظ سے بھی خصوصیت کا حامل ہے کہ مسلمان بالعموم اور عرب بالخصوص حضرت ابراہیمؑ کو اپنا پہلا پیشوا اور مقتداء سمجھتے ہیں۔

اس عظیم اور بہادر انسان کی صفات میں سے یہاں پانچ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

۱۔ پہلے فرمایا گیا ہے: ابراہیمؑ اپنی ذات میں ایک اُمت تھا (ان ابراھیم کان امۃ)۔

اس سلسلے میں حضرت ابراہیمؑ کو "امت" کیوں قرار دیا گیا ہے مفسرین نے مختلف نکات بیان کیے ہیں۔ ان میں سے چار قابلِ ملاحظہ ہیں:

(i) ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے عظیم رہبر، مقتداء اور معلّم تھے۔ اسی بناء پر انھیں اُمّت کہا گیا ہے کیونکہ "امت" اسمِ مفعول کے معنی میں اسے کہا جاتا ہے جس کی لوگ اقتداء کریں اور جس کی رہبری لوگ قبول کریں۔

(ii) ابراہیم علیہ السلام ایسی شخصیت کے مالک تھے کہ اپنی ذات میں ایک اُمت تھے۔ کیونکہ بعض اوقات کسی انسان کی شخصیت کا نُور اتنی وسیع شعاعوں کا حامل ہوتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک دو یا بہت سے افراد سے زیادہ ہوجاتی ہے اور اس کی شخصیت ایک عظیم اُمت کے برابر ہوجاتی ہے۔

ان دونوں معانی میں ایک خاص روحانی تعلق ہے کیونکہ جو شخص کسی ملّت کا سچا پیشوا ہوتا ہے وہ ان سب کے اعمال میں شریک اور حصہ دار ہوتا ہے اور گویا وہ خود اُمت ہوتا ہے۔

(iii) وہ ماحول کہ جس میں کوئی خدا پرست نہ تھا اور جس میں سب لوگ شرک و بُت پرستی کے جوہڑ میں غوطہ زن تھے ——— اس میں ابراہیم تن تنہا موحد اور توحید پرست تھے پس آپ تنہا ایک امت تھے اور اس دور کے مشرکین ایک الگ اُمت تھے۔

(iv) ابراہیم علیہ السلام ایک اُمت کے وجود کا سرچشمہ تھے اس لیے آپ کو "امت" کہا گیا ہے۔

اس میں کوئی اشکال نہیں "امت" کا یہ چھوٹا سا لفظ اپنے دامن میں یہ تمام وسیع معانی لیے ہوئے ہو۔

جی ہاں! ابراہیمؑ ایک امت تھے۔

——— وہ ایک عظیم پیشوا تھے۔

Marfat.com

——— وہ ایک امت ساز جوانمرد تھے۔
——— جس ماحول میں کوئی توحید کا دم بھرنے والا نہ تھا وہ توحید کے عظیم علمبردار تھے[1]
ایک عرب شاعر کہتا ہے :

لیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

اللہ سے بعید نہیں کہ سارے عالم کو ایک میں جمع کر دے۔

۲۔ ان کی دوسری صفت یہ تھی کہ وہ اللہ کے مطیع بندے تھے (قانتاً للہ)۔
۳۔ وہ ہمیشہ اللہ کے سیدھے راستے اور طریق حق پر چلتے تھے (حنیفاً)۔
۴۔ وہ کبھی بھی مشرکین میں سے نہ تھے۔ ان کے فکر کے ہر پہلو میں، ان کے دل کے ہر گوشے میں اور ان کی زندگی کے ہر طرف اللہ ہی کا نور جلوہ گر تھا (ولم یک من المشرکین)۔
۵۔ ان تمام خصوصیات کے علاوہ وہ ایسے جواں مرد تھے کہ اللہ کی سب نعمتوں پر شکر گزار تھے (شاکراً لانعمہ)۔

ان پانچ صفات کو بیان کرنے کے بعد ان کے اہم نتائج بیان کیے گئے ہیں :

(i) اللہ نے ابراہیم کو نبوت اور دعوت کی تبلیغ کے لیے منتخب کیا (اجتبیہ)۔
(ii) اللہ نے انھیں راہِ راست کی ہدایت کی اور انھیں ہر قسم کی لغزش اور انحراف سے بچایا (وھداہ الی صراط مستقیم)۔

ہم نے بارہا کہا ہے کہ خدائی ہدایت ہمیشہ لیاقت و اہلیت کی بنیاد پر ہوتی ہے کہ جس کا مظاہرہ انسان کی اپنی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے کسی کو کوئی چیز استعداد اور کسی حساب کتاب کے بغیر نہیں دی جاتی۔ حضرت ابراہیم کو بھی اسی بنیاد پر یہ ہدایت نصیب ہوئی۔

(iii) ہم نے دنیا میں انھیں "حسنہ" سے نوازا۔ (وآتینٰہ فی الدنیا حسنۃ)۔
وسیع معنی کے اعتبار سے "حسنہ" میں ہر قسم کی نیکی اور اچھائی کا مفہوم موجود ہے۔ اس میں مقام نبوت و رسالت سے

---

[1] حضرت عبد المطلبؑ کے بارے میں مروی احادیث میں سے ایک کے الفاظ یوں ہیں :

یبعث یوم القیامۃ امۃ واحدۃ علیہ بہاء الملوک وسیماء الانبیاء

عبد المطلب (چونکہ شرک و بت پرستی کے ماحول میں توحید کے حامی و مددگار تھے اس لیے) قیامت کے دن ایک اُمت کی شکل میں مبعوث ہوں گے ان کی درخشندگی (عدل کے) نام داروں کی سی ہوگی اور ان میں انبیاء کی سی علامتیں ہوں گی۔ (سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۱۲۹)

Marfat.com

لے کر اچھی اولاد وغیرہ تک کا مفہوم موجود ہے۔

(۶) اور آخرت میں وہ صالحین میں سے ہے (وانه فی الاخرة لمن الصّٰلحین)۔

اس کے باوجود کہ ابراہیم صالحین کے سردار ہیں پھر بھی قرآن کہتا ہے کہ وہ صالحین میں سے ہیں اور یہ امر مقامِ صالحین کی عظمت کی نشانی ہے کہ ابراہیم اپنے ان تمام بلند مقامات کے باوجود ان میں سے ہیں ——— خود حضرت ابراہیم نے اللہ سے یہی تقاضا کیا تھا:

رب هب لی حکما و الحقنی بالصّٰلحین

پروردگارا! مجھے نگاہِ صائب عطا فرما اور مجھے صالحین میں سے قرار دے۔ (شعراء ۸۳)

(۷) ان صفات کے ساتھ ساتھ ایک اور امتیاز جو اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو عطا فرمایا وہ یہ ہے کہ ان کا مکتبِ مذہب صرف ان کے اہلِ زمانہ کے لیے نہ تھا بلکہ ہمیشہ کے لیے تھا۔ خاص طور پر اسلامی اُمت کے لیے بھی یہ ایک الہام بخش مکتب قرار پایا ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے پھر ہم نے تجھے وحی کی کہ دینِ ابراہیم کی اتباع کر کہ جو خالص توحید کا دین ہے (ثم اوحینا الیك ان اتبع ملة ابراهیم حنیفًا)۔[۱]

ایک مرتبہ پھر تاکید کی گئی ہے کہ ابراہیم مشرکین میں سے نہ تھے (وما کان من المشرکین)۔

ان آیات کی طرف توجہ کرنے سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر دینِ اسلام دینِ ابراہیم ہے اور بہت سے مسائل میں مسلمان سننِ ابراہیم کی پیروی کرتے ہیں اور ان میں روزِ جمعہ کا احترام کرنا بھی شامل ہے تو پھر یہودی روزِ ہفتہ کو کیوں عید قرار دیتے ہیں اور اس روز کیوں چھٹی کرتے ہیں۔

زیرِ نظر آخری آیت میں اس سوال کا جواب موجود ہے، ارشاد ہوتا ہے: ہفتے کا دن (اور ہفتے کے روز حرام قرار دی گئی چیزوں کا حکم) یہودیوں کے لیے سزا کے طور پر مقرر تھا اور پھر انھوں نے اس میں بھی اختلاف کیا ان میں سے بعض نے اس سزا کو قبول کر لیا اور اس روز کام کاج بالکل چھوڑ دیا اور بعض نے اس کے بارے میں اعتنائی سے کام لیا (انما جعل السبت علی الذین اختلفوا فیه)۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا تھا کہ وہ روزِ جمعہ کا احترام کریں اور اس روز تعطیل کیا کریں یہ حکم دینِ ابراہیم کے مطابق تھا لیکن انھوں نے بہانے بنائے اور روزِ ہفتہ کو ترجیح دی تو اللہ نے ان کے لیے ہفتے کا دن مقرر کیا لیکن اس کے بارے میں سختی برتی گئی اور کئی حد بندیاں اور شرائط نافذ کر دیں لہٰذا فرمایا گیا ہے کہ روزِ ہفتہ کی تعطیل کے اس حکم کو تمھیں سند قرار نہیں دینا چاہیے کیونکہ یہ حکم تو بڑی سخت سزا کا پہلو رکھتا ہے اور اس سلسلے میں بہترین دلیل یہ ہے کہ

---

[۱] "حنیف" ایسے شخص کو کہتے ہیں جو ٹیڑھے اور انحرافی راستے کو چھوڑ کر درست اور سیدھے راستے کی طرف متوجہ ہو دوسرے لفظوں میں "حنیف" وہ شخص ہے جو ٹیڑھے اور انحرافی دینوں اور راستوں سے منہ موڑ کر اللہ کے صراطِ مستقیم کا رُخ کرتا ہے ——— صراطِ مستقیم کہ جو ایسا دین ہے جو فطرت سے ہم آہنگ ہے اور اس ہم آہنگی کی وجہ سے صراطِ مستقیم شمار ہوتا ہے لہٰذا لفظ "حنیف" میں توحید کے فطری ہونے کی طرف بھی ایک لطیف اشارہ موجود ہے۔

Marfat.com

یہودیوں نے خود اپنے اس انتخاب شدہ دن کے بارے میں بھی اختلاف کیا ہے ان میں سے بعض تو اس دن کی قدر و منزلت کے قائل ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں اور بعض اس کے احترام کو نظر انداز کرتے ہوئے کاروبار میں لگے رہتے ہیں اور عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتے ہیں ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ زیر بحث آیت جانوروں کی غذا کے سلسلے میں مشرکین کی بدعتوں کے بارے میں ہو کیونکہ گزشتہ آیات میں جو گفتگو ہوئی ہے اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں میں جو محرمات تھے وہ اسلام میں کیوں نہیں ہیں تو جواب دیا گیا ہے کہ وہ محرمات سزا کے طور پر تھے ۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے احکام یہودیوں میں کیوں تھے ؟ مثلاً مچھلی کا شکار ہفتہ کے روز ان کے لیے حرام کیوں تھا جبکہ اسلام میں ایسا نہیں ہے پھر جواب یہی ہے ایسا ان کے لیے عذاب اور سزا کے طور پر تھا ۔

بہر حال ان آیات کا تعلق سورۂ اعراف کی آیات ۱۶۳ تا ۱۶۶ سے ہے کہ جو " اصحاب السبت " کے بارے میں ہیں ۔ اس سلسلے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۶ میں وضاحت کر چکے ہیں[۱] ۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ وہ ہفتے کے روز کس طرح مچھلی شکار کرتے تھے اس حکم اور خدائی آزمائش کے بارے میں وہاں وضاحت موجود ہے اس کی مخالفت کرنے والے یہودیوں کو جو سخت سزا ملی اس کا بھی وہاں ذکر موجود ہے ۔

ضمناً توجہ رہے کہ " سبت " دراصل آرام کے لیے کام سے تعطیل کرنے کے معنی میں ہے اور روزِ ہفتہ کو اس لیے " یوم السبت " کہتے ہیں کہ یہودی اس روز عام کاروبار سے تعطیل کرتے تھے بعد ازاں مسلمانوں میں بھی اس دن کا یہی نام باقی رہ گیا اگرچہ اسلام میں یہ تعطیل کا دن نہ تھا ۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : جنھوں نے اختلاف کیا ہے ان کے بارے میں اللہ قیامت کے دن فیصلہ کرے گا ۔ (وان ربك ليحكم بينهم يوم القيٰمة فيما كانوا فيه يختلفون) ۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ قیامت کے روز ایک مقصد یہ حاصل کیا جائے گا کہ تمام معاملات کے بارے میں اختلافات ختم کر دیئے جائیں گے کیونکہ وہ یوم البروز اور یوم الظہور ہوگا اس روز تمام حقیقتیں ظاہر ہو جائیں گی پردے ہٹ جائیں گے ہر مسئلے اور ہر معاملے کے بارے میں حق آشکار ہو جائے گا ۔

---

[۱] دیکھیے صفحہ ۳۵۶ اُردو ترجمہ تفسیر نمونہ جلد ۶ ۔

Marfat.com

۱۲۵۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَ الْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ
جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ
عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ ○
۱۲۶۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِہٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ
لَھُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ○
۱۲۷۔ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَیْھِمْ وَلَا تَکُ فِیْ
ضَیْقٍ مِّمَّا یَمْکُرُوْنَ ○
۱۲۸۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ ○ ع

ترجمہ

۱۲۵۔ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے بہترین انداز میں استدلال اور مباحثہ کر۔ تیرا پروردگار ہر شخص کے بارے میں بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کس نے ہدایت پائی ہے۔

۱۲۶۔ اور جب تم بدلا لینا چاہو تو صرف اتنی ہی سزا دو جتنی تم پر زیادتی ہوئی ہے اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں ہی کے لیے بہتر ہے۔

۱۲۷۔ صبر کر، اور تیرا یہ صبر اللہ کے لیے اور اس کی توفیق سے ہو اور ان کی حرکات پر رنجیدہ نہ ہو اور ان کی سازشوں اور چالبازیوں پر دل تنگ نہ ہو۔

۱۲۸۔ اللہ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور جو نیکوکار ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

مخالفین کے مقابلے میں دس اہم اخلاقی احکام:

اس سُورہ میں مختلف آیات مشرکوں، یہودیوں اور کُلّی طور پر تمام مخالف گروہوں کے بارے میں ہیں یہ گفتگو کبھی نرم انداز سے ہے اور کبھی تند و تیز لہجے میں۔ خصوصاً زیرِ نظر آخری آیات میں اس سلسلے میں زیادہ گہرائی اور شدت ہے۔

یہ سورۂ نحل کی آخری آیات ہیں ان میں اہم اخلاقی احکام ہیں ان میں منطقی اور استدلالی گفتگو اور طرزِ بحث اختیار کرنے کا حکم ہے مخالفین کو سزا دینے اور معاف کرنے کے بارے میں حکم ہے اور ان کی سازشوں کے مقابلے کی کیفیت اور طریقہ بیان کیا گیا ہے۔ ان احکام سے ایک ہمہ گیر قانون کے طور پر ہر زمانے میں اور ہر مقام پر استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ساری گفتگو دس اصولوں پر محیط ہے۔ ترتیب کچھ یوں ہے:

(۱) پہلے فرمایا گیا ہے: اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت سے دعوت دے (ادع الی سبیل ربک بالحکمة)۔

"حکمت" علم و دانش اور منطق و استدلال کے معنی میں ہے۔ اصل میں یہ لفظ منع کرنے کے معنی میں ہے اور علم و دانش اور منطق و استدلال چونکہ فتنہ و فساد اور انحراف سے مانع ہیں لہٰذا انھیں حکمت کہا جاتا ہے بہرحال راہِ حق کی طرف دعوت دینے کے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ صحیح منطق اور نپے تلے استدلال سے کام لیا جائے ——— دوسرے لفظوں میں لوگوں کی فکر و نظر کو دعوت دی جائے اور ان کی سوچ بچار کی صلاحیت کو ابھارا جائے اور عقلِ خوابیدہ کو بیدار کیا جائے۔

(۲) نیز یہ دعوت عمدہ نصیحت کے ساتھ ہو (والموعظة الحسنة)۔

راہِ خدا کی طرف دعوت کا یہ دوسرا اُصول ہے۔ یہ درحقیقت انسانی جذبات اور فطری احساسات سے استفادہ کرنے کا انداز ہے کیونکہ وعظ و نصیحت دراصل جذب و احساس کو ابھارنے کے لیے ہوتی ہے۔ زیادہ تر عوام کو جذبات و احساسات کو ابھار کر حق کی طرف متوجہ کیا جاسکتا ہے۔

درحقیقت ——— حکمت انسان کے عقلی پہلو سے مربوط ہے اور "الموعظة الحسنة" انسانی جذب و احساس سے کام لینے کے لیے ہے۔[۱] نیز "موعظة" کے ساتھ "حسنة" کی شرط شاید اس طرف اشارہ ہے کہ وعظ و نصیحت

---

[۱] بعض مفسرین نے "حکمۃ"، "موعظہ حسنہ" اور "مجادلۂ احسن" کے درمیان فرق کے بارے میں کہا ہے کہ "حکمۃ" قطعی اور یقینی دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ "موعظة حسنة" ظنی دلائل کو کہتے ہیں اور "مجادلہ احسن" ایسے دلائل سے استفادہ کرنا ہے کہ جو مخالفین کے ہاں قابلِ قبول ہوں (البتہ جو کچھ ہم نے سطور بالا میں کہا ہے وہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے)۔

Marfat.com

اس صورت میں مؤثر ہوتی ہے کہ جب اس میں کسی قسم کی سختی، بڑائی، دوسرے کی تحقیر و تذلیل اور اس کی ہٹ دھرمی کی انگیخت وغیرہ نہ ہو۔ بہت سے لوگوں کے وعظ و نصیحت کا الٹا اثر نکلتا ہے کیونکہ اس میں دوسرے کی تحقیر و تذلیل پائی جاتی ہے یا اس میں وعظ و نصیحت کرنے والے کی بڑائی کا پہلو ہوتا ہے لہذا "موعظة" تبھی مؤثر ہوتا ہے جب "حسنة" ——— اچھا اور عمدہ ہو۔

(۳) اور مخالفین سے زیادہ اچھے طریقے سے مباحثہ کر (وجادلهم بالتی هی احسن)۔

یہ تیسرا قدم ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے کہ جن کے ذہن میں پہلے سے غلط مسائل اور نظریات سمائے ہوئے ہوں۔ مناظرے اور مباحثے کے ذریعے ان کا ذہن ان کے نظریات سے پاک کرنا چاہیے تاکہ وہ حق قبول کرنے کے قابل ہوسکیں۔

واضح ہے کہ مجادلہ اور مباحثہ بھی تبھی مؤثر ہوگا جب وہ "بالتی هی احسن" ہو۔ جب وہ حق، عدالت، درستی امانت اور صداقت کے ساتھ ہو جب اس میں کسی قسم کی تحقیر، توہین، غلط بیانی اور تکبر نہ ہو ——— مختصر یہ کہ اس میں تمام انسانی اقدار کا احترام ملحوظ رکھا گیا ہو۔

زیر نظر پہلی آیت کے آخر میں مزید فرمایا گیا ہے: تیرا رب ہر کسی سے بہتر جانتا ہے کہ کون لوگ اس کی راہ سے بھٹک گئے ہیں اور کن لوگوں نے ہدایت پائی ہے (ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله وهو اعلم بالمهتدين)۔

یہ اس طرف اشارہ ہے کہ تمھاری ذمہ داری مذکورہ تین طریقوں کے مطابق حق کی طرف دینا ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ کون لوگ ہدایت پاتے ہیں اور کون لوگ گمراہی پر پڑے رہتے ہیں ——— انھیں خدا جانتا ہے اور بس۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس جملے میں مذکورہ بالا تین احکام کی دلیل بیان کی گئی ہو۔ یعنی اللہ نے منحرفین اور کج رو افراد کے بارے میں یہ جو تین حکم دیئے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے گمراہوں کے لیے کون سی بات مؤثر ہے اور ہدایت کے لیے کون سا ذریعہ مناسب ہے۔

(۴) اب تک تو اس بارے میں گفتگو تھی کہ مخالفین سے منطق، جذب و احساس اور معقول مباحثے کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے لیکن معاملہ اگر اس سے بڑھ کر جھگڑے تک جا پہنچے اور مخالفین دستِ تجاوز دراز کریں اور انھیں سزا دینے کی نوبت آجائے تو پھر انھیں اتنی سزا دو جتنی انھوں نے زیادتی کی ہے اور اس سے زیادہ نہیں (وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به)۔

(۵) لیکن اگر صبر اختیار کرو اور عفو و درگزر سے کام لو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہی بہتر طرزِ عمل ہے۔ (ولئن صبرتم لهو خير للصابرين)۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت جنگ احد کے دوران میں اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہؐ نے اپنے چچا حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی شہادت کی دردناک کیفیت دیکھی۔ دشمن نے انھیں شہید کرنے پر بس نہیں کی تھی بلکہ ان کا سینہ اور پہلو بڑی بے دردی سے چیرے گئے ان کا جگر یا دل نکال لیا گیا ان کے کان اور ناک کاٹے گئے۔ یہ منظر دیکھ کر رسول اللہؐ بہت دکھی ہوئے اور فرمایا:

Marfat.com

اللھم لک الحمد و الیک المشتکی و انت المستعان علی ما اری

خدایا! حمد تیرے لیے ہے اور تیری ہی بارگاہ میں شکایت پیش کرتا ہوں اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اس پر تو ہی میرا مددگار ہے۔

اس کے بعد آپؐ نے فرمایا:

لئن ظفرت لامثلن ولامثلن ولامثلن

اگر میں ان پر فتحیاب ہوگیا تو ان کا مثلہ کروں گا، ان کا مثلہ کروں گا، ان کا مثلہ کروں گا۔

ایک اور روایت کے مطابق آپؐ نے فرمایا:

ان کے ستر آدمیوں کا مثلہ کروں گا۔[1]

اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

و ان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصٰبرين

رسول اللہؐ نے فوراً عرض کیا:

اصبر! اصبر!

خدایا! میں صبر کروں گا، میں صبر کروں گا۔[2]

شاید رسولِ اکرمؐ کی زندگی میں یہ لمحہ کرب ناک ترین تھا لیکن پھر بھی آپؐ کو اپنے اعصاب پر پورا کنٹرول تھا آپؐ نے عفو و درگزر کا راستہ اختیار کیا۔ فتح مکہ کے واقعہ میں ہے کہ جس دن آپ ان سنگدلوں پر فتح یاب ہوئے تو عام معافی کا حکم صادر فرمایا اور جنگِ اُحد کے موقع پر اللہ سے کیا ہوا اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور سچی بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص عالی ظرفی اور انسانی جذبوں کا بہترین نمونہ دیکھنا چاہے تو واقعہ اُحد کو فتح مکہ کے واقعے کے ساتھ رکھ کر دیکھے اور ان دونوں کا آپس میں موازنہ کرے۔

شاید آج تک کسی کامیاب قوم نے کسی شکست خوردہ قوم کے ساتھ یہ سلوک نہ کیا ہو کہ جو رسولؐ اللہ اور مسلمانوں نے کامیابی کے بعد مشرکین مکہ سے کیا وہ بھی ایسے ماحول میں کہ جہاں انتقام کے جذبے لوگوں کے رگ و پے میں اُترے ہوئے تھے اور نسل در نسل ان میں بغض و کینہ کے سلسلے میراث کے طور پر چلتے رہتے تھے اس معاشرے میں انتقام نہ لینا ایک بہت بڑا عیب سمجھا جاتا تھا۔

اس عالی ظرفی، عظمتِ کردار اور عفو و درگزر کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جاہل اور ہٹ دھرم قوم بہت متاثر ہوئی اور ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہاں تک کہ قرآن کے مطابق۔

---

[1] بعض روایات میں ہے کہ یہ جملہ بعض مسلمانوں نے کہا تھا کہ اگر ہم کامیاب ہوگئے تو اس سے زیادہ تعداد میں مثلہ کریں گے (تفسیر تبیان جلد ۶ ص ۴۴۰)

[2] تفسیر عیاشی اور تفسیر در المنثور، زیرِ بحث آیت کے ذیل میں (جیسا کہ تفسیر المیزان میں نقل کیا گیا ہے)۔

Marfat.com

یدخلون فی دین اللہ افواجًا

وہ لوگ فوج در فوج دین خدا میں داخل ہو گئے۔

۶۔ اگر عفو و درگزر اور صبر و شکیبائی کسی توقع کے بغیر ہو تو یقینی طور پر اثر انداز ہوتی ہے ـــــ یعنی صرف اللہ کی خاطر ہو ـــــ لہٰذا قرآن مزید کہتا ہے: صبر اختیار کر اور تیرا یہ صبر صرف اللہ کے لیے ہو اور یہ اس کی توفیق کے بغیر نہیں ہو سکتا (واصبر وما صبرك الا باللہ)۔

کیا یہ انسان کے بس میں ہے کہ وہ ایسے جاں سوز مواقع پر قوتِ الٰہی اور روحانی جذبے کے بغیر صبر کرے جو اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتے ہیں۔ توفیقِ الٰہی کے بغیر کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان روح کو اذیت پہنچانے والے واقعات اور مناظر کا سامنا کرے اور صبر کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ جی ہاں! یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ سب کچھ خدا کے لیے ہو اور اس کی توفیق سے ہو۔

(۷) تبلیغ اور دعوت الی اللہ کے راستے میں یہ تمام زحمات اٹھانے، عفو و درگذر کرنے اور صبر اختیار کرنے کے باوجود کوئی نتیجہ نہ نکلے تو بھی مایوس اور بددل نہیں ہونا چاہیے بلکہ جتنا زیادہ ممکن ہو سکے حوصلے کے ساتھ اور ٹھنڈے دل سے تبلیغ کا سلسلہ جاری و ساری رکھنا چاہیے۔ اسی لیے ساتواں حکم یہ دیا گیا ہے: ان کی حالت پر کبیدہ خاطر نہ ہو (ولا تحزن علیھم)۔

یہ حزن و ملال کہ یقیناً ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے ہے۔ ہو سکتا ہے اس سے دو میں سے ایک نتیجہ پیدا ہو۔ یا تو انسان ہمیشہ کے لیے بددل ہو جائے یا وہ بے حوصلگی اور بے تابی کا اظہار کرے۔ لہٰذا حزن و ملال کی نہی درحقیقت دونوں کی نہی ہے۔ یعنی راہِ حق کی دعوت دیتے ہوئے نہ بیتاب و مضطرب ہونا چاہیے اور نہ ہی مایوس و ناامید۔

(۸) ان تمام اوصاف کے باوجود ہو سکتا ہے ہٹ دھرم دشمن سازش کا راستہ اپنائے اور خطرناک منصوبے بنائے تو ان حالات میں صحیح موقف وہی ہے کہ جو قرآن کہتا ہے: ان سازشوں پر پریشان اور تنگ دل نہ ہو (ولا تك فی ضیق مما یمکرون)۔

یہ سازشیں جس قدر بھی گہری، وسیع اور خطرناک ہوں تمھارا راستہ نہیں روک سکتیں تم یہ خیال نہ کرو ہمارا دائرہ تنگ ہو گیا ہے اور ہم ان سازشوں میں گھر چکے ہیں کیونکہ تمھارا سہارا خدا ہے تم ایمان و استقامت کی قوت سے اور عقل و دانش سے ان سازشوں کو ناکام کر سکتے ہو۔

زیر نظر آخری آیت سورۂ نحل کی بھی آخری آیت ہے۔ اس میں اس سلسلے کا نواں اور دسواں حکم بیان کیا گیا ہے۔

(۹) ارشاد ہوتا ہے: اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں (ان اللہ مع الذین اتقوا)

"تقویٰ" یہاں تمام جہات سے اور وسیع مفہوم میں ہے یہاں تک کہ دشمنوں کے مقابلے میں بھی تقویٰ ـــــ یعنی

Marfat.com

اپنے دشمنوں کے ساتھ اسلامی اصولوں کی پاسداری کے ساتھ برتاؤ کرنا ۔ قیدیوں کے ساتھ اسلامی طرزِ عمل اختیار کرنا ، کج رو اور منحرف افراد کے ساتھ انصاف اور ادب کے اصولوں کا لحاظ رکھنا اور جھوٹ اور تہمت سے پرہیز کرنا ۔ یہاں تک کہ دورانِ جنگ بھی اسلامی اصولوں پر عمل کرنا ، تقویٰ اور اسلامی قوانین کا پاس کرنا ۔ جنگ کے دوران میں نہتے اور دفاع نہ کر سکنے والے افراد پر حملہ نہ کرنا ۔ بچوں اور کمزور بوڑھوں سے تعرض نہ کرنا ۔ چوپایوں کو ہلاک نہ کرنا ، فصلوں کو تباہ نہ کرنا اور دشمن پر پانی بند نہ کرنا وغیرہ ۔ مختصر یہ کہ دوست اور دشمن دونوں کے ساتھ تقویٰ کی بنیاد پر سلوک کرنا چاہیے (البتہ بہت کم استثنائی مواقع ایسے ہیں جو اس حکم سے خارج ہیں) ۔

(۱۰) اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو نیکوکار ہیں (والذین هم محسنون) ۔

جیسا کہ قرآن نے اپنی دیگر بہت سی آیات میں بھی کہا ہے بعض اوقات بدی کا جواب نیکی سے دینا چاہیے اور اس طریقے سے دشمن کو شرمسار کرنا چاہیے کیونکہ یہ طریقہ ان دشمنوں کو کہ جن کا سینہ دشمنی سے پُر ہو اور " الد الخصام " کو مہربان اور مخلص دوست میں تبدیل کر دیتا ہے ۔

احسان اور نیکی اگر برمحل اور برموقع ہو تو یہ جنگ کا ایک عمدہ طریقہ ہے تاریخ اسلام میں اس حکمتِ عملی کے بہت سے مظاہر دکھائی دیتے ہیں فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو سلوک مشرکین مکہ کے ساتھ کیا ، جو طرزِ عمل آپؐ نے حضرت حمزہؓ کے قاتل " وحشی " سے روا رکھا ، جو مہربانی آپؐ نے بدر کے قیدیوں پر کی اور جو سلوک آپ نے ان یہودیوں کے ساتھ کیا جنہوں نے آپؐ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی تھیں وہ سب اس کردار کے مظاہر ہیں ۔

ایسے ہی بہت سے واقعات حضرت علی علیہ السلام اور دیگر آئمہ ہدیٰ علیہم السلام کی زندگی میں دکھائی دیتے ہیں ان واقعات سے اس اسلامی حکم کی وضاحت ہوتی ہے ۔

نہج البلاغہ کا ایک مشہور خطبہ ہے جسے خطبہ ہمام کہا جاتا ہے ۔ ہمام ایک عابد و زاہد اور دانا شخص تھا ۔ اس نے امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے پرہیزگاروں کی صفات کے بارے میں ایک جامع حکم کا تقاضا کیا تو امام نے صرف یہ آیت تلاوت فرمائی اور کہا :

اتق الله واحسن ان الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون

تقویٰ الٰہی اختیار کرو اور نیکی کرو کیونکہ اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو پرہیزگار اور نیکوکار ہیں ۔

اگرچہ اس عاشقِ حق سائل کی پیاس اس مختصر سے جواب سے نہ بجھی اور پھر تقاضا کیا تو ناچار امام علیہ السلام نے وضاحت سے جواب دیا اور پرہیزگاروں کی صفات کے بارے میں نہایت جامع خطبہ دیا ۔ اس میں پرہیزگاروں کی سو سے زیادہ صفات بیان کی گئی ہیں ۔ تاہم امامؑ کے پہلے مختصر جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت دراصل پرہیزگاروں کی صفات کا اجمال ہے گویا یہ پرہیزگاروں کی کتابِ صفات کی فہرست ہے ۔

یہ دس چیزیں مخالفین کے ساتھ طرزِ عمل کے اتمام اصلی اور فرعی خطوط واضح کر دیتی ہیں ان میں غور و فکر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں تمام منطقی ، احساساتی اور نفسیاتی طریقے اختیار کرنے کو کہا گیا ہے کہ جو مخالفین پر اثر انداز ہو سکیں ۔

Marfat.com

اس کے باوجود اسلام ہرگز یہ نہیں کہتا کہ صرف منطق واستدلال پر قناعت کرو بلکہ اسلام بہت سے مواقع پر ضروری قرار دیتا ہے کہ دشمنوں کی سازشوں کے مقابلے میں ہم میدانِ عمل میں نکلیں اور ان کی سختی کے جواب میں ضرورت کی صورت میں سختی سے جواب دیں اور ان کی سازشوں کو باطل کرنے کے لیے ان کا کوئی توڑ اور سدِباب کریں البتہ اس مرحلے میں بھی عدالت، تقویٰ اور اسلامی اخلاق کا اصول فراموش نہ کیا جائے۔ اگر مسلمان اپنے مخالفین کے مقابلے میں اس ہمہ گیر طریقہ کار کو اختیار کرتے تو شاید آج اسلام ساری دنیا یا اس کے زیادہ تر حصے پر چھایا ہوا ہوتا۔

نعمتوں کی سورت ـــــ سورۂ نحل کے بارے میں آخری بات

جیسا کہ ہم نے اس سورہ کی ابتداء میں کہا ہے اس سورہ میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ خدا کی گوناگوں نعمات ہیں چاہے وہ مادی ہوں یا روحانی، ظاہری ہوں یا باطنی اور انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ اس سورہ کو جو نعمتوں کی سورت کہا جاتا ہے تو وہ اسی لحاظ سے ہے۔

اس سورہ کی آیات کے مطالعے اور تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں تقریباً چالیس چھوٹی بڑی مادی اور روحانی نعمتوں کا ذکر ہے ہم انھیں ذیل میں فہرست وار پیش کرتے ہیں۔ اور ہم تاکید کرتے ہیں کہ ان کا مقصد پہلے توحید اور عظمتِ خالق کی تعلیم ہے اور اس کے بعد ان نعمتوں کے خالق سے انسان کے میلان کو تقویت پہنچانا ہے اور احساسِ تشکر کو ابھارنا ہے۔

۱۔ تخلیقِ فلک (خلق السمٰوٰت)۔
۲۔ خلقتِ زمین (والارض)۔
۳۔ چوپایوں کی پیدائش (والانعام خلقها)۔
۴۔ ان کی اون اور چمڑے کے ذریعے لباس کی تیاری (لکم فیها دفء)۔
۵۔ جانوروں کے دیگر فائدے (ومنافع)۔
۶۔ جانوروں کے گوشت سے استفادہ (ومنها تأکلون)۔
۷۔ استقلالِ اقتصادی کے حسن سے فائدہ اٹھانا (ولکم فیها جمال)۔
۸۔ نقل وحمل کے لیے جانوروں سے کام لینا (وتحمل اثقالکم ـــ والخیل والبغال والحمیر لترکبوها)۔
۹۔ صراطِ مستقیم کی ہدایت (وعلی الله قصد السبیل)۔
۱۰۔ آسمان سے بارش کا نزول اور اس سے پینے کے پانی کی دستیابی (هو الذی انزل من السماء ماء لکم منه شراب)۔
۱۱۔ اس سے چراگاہوں کی نشوونما (ومنه شجر فیه تسیمون)۔
۱۲۔ اس سے فصلوں، زیتون، کھجور، انگور اور طرح طرح کے پھلوں کا اگنا (ینبت لکم به الزرع

Marfat.com

والزیتون والنخیل والاعناب ومن کل الثمرات)۔

۱۳۔ رات اور دن کا مسخر ہونا (وسخر لکم اللیل والنھار)۔

۱۴۔ سورج اور چاند کی تسخیر (والشمس والقمر)۔

۱۵۔ ستاروں کی تسخیر (والنجوم)۔

۱۶۔ گوناگوں مخلوق کہ جو زمین میں پیدا کی گئی ہے (وما ذرألکم فی الارض مختلفًا الوانہ)۔

۱۷۔ سمندروں میں موجود جانوروں کے گوشت اور جواہرات سے استفادہ کے لیے سمندروں کی تسخیر (وھوالذی سخرالبحرلتأ کلوا منہ لحمًا طریًا وتستخرجوا منہ حلیۃ تلبسونھا)۔

۱۸۔ سینۂ آب پر کشتیوں کا چلنا (وتری الفلک مواخر فیہ)۔

۱۹۔ پہاڑوں کا پیدا کرنا کہ جو زمین کو ٹھہرائے ہوئے ہیں (والقیٰ فی الارض رواسی ان تمید بکم)۔

۲۰۔ دریاؤں اور نہروں کا پیدا کرنا (وانھارًا)۔

۲۱۔ آپس میں مربوط راستے پیدا کرنا (وسبلًا)۔

۲۲۔ راستے پہچاننے کے لیے علامات پیدا کرنا (وعلامات)۔

۲۳۔ رات کے وقت راستہ پہچاننے کے لیے ستاروں سے استفادہ کرنا (وبالنجم ھم یھتدون)۔

۲۴۔ آبِ باراں کے ذریعے مردہ زمینوں کو زندہ کرنا (واللہ انزل من السماء ماء فاحیا بہ الارض بعد موتھا)۔

۲۵۔ خالص اور عمدہ دودھ پیدا کرنا کہ جو خون اور ہضم شدہ غذا کے درمیان میں سے نکلتا ہے (نسقیکم مما فی بطونہ من بین فرث ودم لبنًا خالصًا سائغًا للشاربین)۔

۲۶۔ کھجور اور انگور سے حاصل شدہ چیزیں (ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرًا ورزقًا حسنًا)۔

۲۷۔ شہد کہ جو شفا بخش غذا ہے (فیہ شفاء للناس)۔

۲۸۔ انسان کے لیے اس کی اپنی نوع میں سے ہمسر اور شریک حیات پیدا کرنا (واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجًا)۔

۲۹۔ اولاد جیسی نعمت (وجعل لکم من ازواجکم بنین وحفدۃ)۔

۳۰۔ طرح طرح کا پاکیزہ رزق ——— وسیع مفہوم کے اعتبار سے (ورزقکم من الطیبات)۔

۳۱۔ سماعت کی نعمت (وجعل لکم السمع)۔

۳۲۔ آنکھوں کی نعمت (والابصار)۔

۳۳۔ عقل و ہوش کی نعمت (والافئدۃ)۔

۳۴۔ ٹھہرے ہوئے مسکن اور گھر (واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنًا)۔

Marfat.com

۳۵۔ چلتے پھرتے گھر (خیمے)۔ (وجعل لکم من جلود الانعام بیوتًا)۔

۳۶۔ اسبابِ زندگی کہ جو اُون، کھال اور جانوروں کے بالوں سے بنائے جاتے ہیں (ومن اصوافها واوبارها واشعارها اثاثًا ومتاعًا الی حین)۔

۳۷۔ سایے کی نعمت (واللہ جعل لکم مما خلق ظلالًا)۔

۳۸۔ پہاڑوں میں قابلِ اطمینان پناہ گاہوں کی نعمت (وجعل لکم من الجبال اکنانًا)۔

۳۹۔ طرح طرح کے لباس جو انسان کو سردی اور گرمی سے بچاتے ہیں (وجعل لکم سرابیل تقیکم الحر)۔

۴۰۔ زرہ اور لباسِ جنگ جو دشمن کی ضربوں سے بچاتا ہے (وسرابیل تقیکم بأسکم)۔

اور نعمتوں کے اس سلسلے میں مزید فرمایا گیا ہے:

کذٰلک یتم نعمته علیکم لعلکم تسلمون

اس طرح سے اللہ اپنی نعمتیں تم پر تمام کرتا ہے تاکہ تم اس کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرو۔

نعمتوں کے ذکر کا مقصد:

یاددہانی کی ضرورت نہیں ہے کہ اس سورہ میں اور قرآن کی دیگر مختلف آیات میں نعماتِ الٰہی کا ذکر احسان جتلانے اور نام حاصل کرنے جیسے امور کے لیے نہیں ہے کیونکہ اللہ ان تمام چیزوں سے بالاتر و برتر ہے اور ہر شخص اور ہر چیز سے بے نیاز ہے۔ یہ سب کچھ تعمیری، تربیتی اور اصلاحی مقاصد کے لیے ہے وہ مقاصد کہ جو انسان کو مادی اور روحانی اعتبار سے آخری ممکن حد تک کمال و ارتقاء عطا کرنے کے لیے ہیں۔

اس امر کے لیے واضح ترین دلیل وہ جملے ہیں کہ جو گزشتہ بہت سی آیات کے آخر میں آئے ہیں یہ سب تنوّع کے باوجود انسان کی نشوونما اور تربیت کے بارے میں ہیں۔ اسی سورہ کی آیہ ۱۴ میں سمندروں کی تسخیر کی نعمت بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

لعلکم تشکرون

شاید کہ تم شکر کرو۔

آیت ۱۵ میں پہاڑوں دریاؤں اور راستوں کی نعمت بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

لعلکم تهتدون

شاید کہ تم ہدایت پا جاؤ۔

آیت ۴۴ میں عظیم ترین روحانی نعمت یعنی آیاتِ قرآن کے نزول کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے:

ولعلهم یتفکرون

اور شاید کہ وہ غور و فکر کریں۔

Marfat.com

آیت ۷۸، میں بہت اہم نعمت ——— شناخت و معرفت کے وسائل (کان، آنکھ اور عقل) کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد فرمایا گیا ہے:

لعلکم تشکرون

شاید کہ تم شکر کرو۔

آیت ۸۱ میں پروردگار کی نعمتوں کی تکمیل کی طرف اشارہ کرنے کے بعد قرآن کہتا ہے:

لعلکم تسلمون

شاید کہ تم سر تسلیم خم کرو۔

آیت ۹۰ میں عدل و احسان کو اختیار کرنے، فحشاء، منکر اور ظلم کے خلاف جنگ کرنے کے احکام کے بعد فرمایا گیا ہے:

لعلکم تذکرون

شاید کہ تم تذکر حاصل کرو اور توجہ دو۔

درحقیقت ان چھ مواقع پر پانچ مقاصد کی طرف اشارہ ہوا ہے:

۱۔ تشکر

۲۔ ہدایت

۳۔ تفکر

۴۔ دعوت حق پر سر تسلیم خم کرنا

۵۔ تذکر و یاد آوری

یہ سب امور ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ انسان سب سے پہلے غور و فکر اور سوچ بچار کرتا ہے جب بھول جائے تو اسے یاد دلایا جاتا ہے اس کے بعد اس میں نعمت عطا کرنے والے کے لیے احساس تشکر بیدار ہوتا ہے اور وہ اس کے راستے کی ہدایت پاتا ہے اور آخر کار اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔

گویا یہ پانچ مقاصد انسانی کمال کی زنجیر کی کڑیاں ہیں بلاشبہ اگر یہ راستہ صحیح طور پر طے کر لیا جائے تو اس کے خاطر خواہ نتائج نکلتے ہیں اور شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان نعمتوں کے اجتماعی یا انفرادی صورت میں تذکرے کا مقصد کمال کے سوا اور کچھ نہیں۔

پروردگارا! تیری بے پایاں نعمتیں ہمارے سارے وجود پر محیط ہیں ——— ہم تیری نعمتوں میں مستغرق لیکن ابھی ہم نے تجھے پہچانا نہیں۔

بارالٰہا! ہمیں ایسا ادراک اور ایسی نگاہ عطا فرما کہ جو تیرے عشق کے راستوں کو ہمارے لیے واضح کر دے۔ اور ایسی توفیق بخش کہ جو تیرے عشق کے راستے سے پیچ و خم میں ہماری مددگار ہو

Marfat.com

اور ہمیں شکر گذاروں کی منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

خداوندا! تو ہماری احتیاج و نیاز کو ہر کسی سے بہتر جانتا ہے اور ہمارے ذاتی تقاضوں کو خود ہم سے بہتر پہچانتا ہے۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم ایسے ہو جائیں جیسا تو چاہتا ہے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اس سے بہتر ہو جائیں کہ جو لوگ ہمارے متعلق سوچتے ہیں۔

معبودا! اس وقت تیری عظیم آسمانی کتاب کا یہ حصہ ختم ہو رہا ہے۔ ماہِ شعبان کا آخر ہے اور ہم تیری رحمت کے مہینہ رمضان المبارک کے آستانے پر آپہنچے ہیں۔ اپنی خاص رحمت ہمارے شاملِ حال فرما اور ہمیں توفیق عطا فرما کہ ہم اس تفسیر کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکیں۔

انك سميع مجيب

سورۂ نحل کا اختتام

تفسیر نمونہ گیارہویں جلد کا اختتام

آخر شعبان ۱۴۰۱ھ ہجری

Marfat.com

ادارہ اِمامیہ قرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآنِ پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۱)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

واللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)
مدرس / مینیجر
امامیہ قرأت کالج
اندرون موچی دروازہ۔ لاہور

Marfat.com

تفسیر نمونہ کے راہیوں
کا
ایک پیارا شہید
ساتھی

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ایران کے اسلامی انقلاب کے ہاتھوں زخم کھائے ہوئے دشمن نے ایک بڑا ہولناک جرم کیا ہے۔ حزب جمہوری اسلامی کے مرکزی دفتر میں دھماکے سے ہمارے بہت سے زیادہ نمایاں علماء اور اہم شخصیات کو شہید کر دیا۔ انہیں شہداء میں سے حجۃ الاسلام **الحاج سیّد نور اللہ طباطبائی** (قدس سرہ) بھی ہیں۔ وہ تفسیر نمونہ کے عزیز ساتھیوں میں سے تھے، اور ایران کی اسلامی پارلیمنٹ کے رکن بھی تھے۔

وہ ایک باارادہ، با استقامت، فاضل، متدین، باایمان اور جذبوں سے سرشار پاکیزہ شخصیت تھے۔

آج تفسیر نمونہ کے ہمراہیوں میں ان کی جگہ ہمیں خالی دکھائی دیتی ہے اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ بدر، اُحد اور کربلا کے جانباز شہیدوں میں محشور کرے۔ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم مشرق و مغرب کی عالمی شیطانی انسان دشمن طاقتوں

Marfat.com

پر مکمل فتح کے حصول تک ان شہداء کی جد و جہد کو جاری رکھیں اور پوری دنیا پر
پرچم اسلام کے لہرانے تک تحریک اسلامی کو دوام دے سکیں ۔

آمین یارب العالمین

ناصر مکارم شیرازی

قم ۔ ۸ ۔ شہریور ـــــ ۱۳۶۵ ھجری شمسی

Marfat.com